اکرم نشانِ حیدر

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ

اللّٰهِ

اَمۡوَاتًا ‌ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَۙ ۝

فَرِحِيۡنَ بِمَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۙ وَيَسۡتَبۡشِرُوۡنَ

بِالَّذِيۡنَ لَمۡ يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ مِّنۡ خَلۡفِهِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ

عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ‌ۘ ۝

اور ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ جو قتل کیے گئے ہیں اللہ

کی راہ میں وہ مُردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس (اور)

رزق دیئے جاتے ہیں، شاد ہیں اُن (نعمتوں) سے جو عنایت فرمائی

ہیں اُنھیں اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اور خوش ہو رہے ہیں بسبب

اُن لوگوں کے جو ابھی تک نہیں آملے اُن سے اُن کے پیچھے رہ جانے

والوں سے کہ نہیں ہے کوئی خوف اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(آلِ عمران ۱۷۰)

سعید راشد

اکرم نشانِ حیدر

ے ہیرو میجر محمد اکرم شہید نشانِ حیدر ایف ایف آر کی داستانِ حیات

سعید راشد

قیمت 100 روپے صرف

بک کارنر مین بازار، جہلم
(پاکستان)

اکرم نشان حیدر

اکرم نشانِ حیدر دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے ایک ہیرو میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کی ایک منفرد انداز کی سوانح حیات ہے۔

ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن بریگیڈیئر سید نصیر الدین ستارہ امتیاز ۔ کتاب پر اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔ میجر اکرم شہید نشان حیدر پر یہ کتاب اقبال کے بعض بنیادی تصورات کی تفسیر و توضیح بھی کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہی جوان قوم کی آنکھ کا تارہ ہوتا ہے۔ جس کا شباب بے داغ اور ضرب کاری ہو۔ اور یہ کہ بے داغ شباب اور ضرب کاری کا تعلق دل بیدار سے ہے یہ وہ نقطہ ہے جو پوری قوم کی توجہ چاہتا ہے۔ خاص طور پر اُن لوگوں کی توجہ جو نوجوانوں کی ضرب ، کاری بنانے کے اداروں سے متعلق ہیں۔ اِس کتاب اکرم نشان حیدر کی مزید دو خصوصیات قابل غور ہیں اول یہ کہ اِس میں سیرت کا مواد براہ راست اصل ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے اور تاثرات کو نہیں واقعات و معاملات کو اہمیت دی گئی ہے۔ واقعات و حقائق پر زیادہ انحصار کرنے سے ہیرو کی جو تصویر اُبھرتی ہے وہ بہت جاندار اور مؤثر ہے اور جہاں جہاں لوگوں کے تاثرات بھی بیان کیے گئے ہیں اِن میں بھی حقائق ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ سیرت نگاری کے اِس جدید سائنسی انداز نے اِس کتاب کی قدروقیمت کو دو چند کر دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب اکرم شہید کی شخصیت و کردار کا ایک نفسیاتی و تجزیاتی مطالعہ بن گئی ہے۔ اِس کتاب کی دوسری امتیازی خصوصیت اِس کی خوبصورت تکنیک ہے۔ اِن اوراق میں رپورتاژ اور ڈرامہ دونوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اِس سے ایک دوار فلم کا منظرنامہ بڑی آسانی سے تیار کیا جا سکتا ہے۔

فرینڈز پبلشرز بخشا کالونی نزد اقبال لائبریری جہلم

تعارف مصنف

نام : محمد سعید راشد

تاریخ پیدائش : ۲۰ر جنوری ۱۹۲۷ء

مقام پیدائش : بریلی

تعلیم : بریلی کالج بریلی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

پیشہ : تدریس ملٹری کالج جہلم (اگست ۵۰ء سے)

مشغلہ : تصنیف و تالیف

مشن : پاکستانیت کا فروغ

تصانیف و تالیفات

IN SEARCH OF LIFE

RIPENESS IS ALL

LEARNING TO LEAD

LIVING WITH LEADERSHIP

حیاتِ قائدِ اعظم

تذکرۂ اقبال

کردار کی کرنیں

گفتار و کردار قائدِ اعظم

مکالماتِ اقبال

شاد باد منزلِ مراد

تذکرۂ شہدا، (جنگ ستمبر و دسمبر کے پندرہ شہیدوں کا تذکرہ)

اکرم نشان حیدر

لیبا ویلی کا ہیرو (کرنل کیانی شہید ستارۂ جرأت دو بار)

جرأتوں کے نشان (پاک و ہند جنگوں کے ۴۲ جنگی اعزاز یافتہ غازیوں کا تذکرہ)

کردار ساز (بریگیڈیر محمد رفیق کی داستانِ حیات)

داستانِ جرأت (بریگیڈیر سلطان احمد ستارۂ جرأت دو بار کی داستانِ تگ و تاز)

تاریخ ملٹری کالج جہلم

شہیرِ کشمیر
کرنل حق نواز کیانی

سعید راشد

چھپ کر تیّار ہے

فہرست

باب اوّل — ۲۳

کاروانِ زندگی

پیش لفظ

از

بریگیڈیر سید نصیر الدین ستارۂ امتیاز ڈائرکٹر آرمی ایجوکیشن

میجر محمد اکرم شہید قوم کے ان آٹھ عظیم شہیدوں میں سے ایک ہیں جو اب تک نشان حیدر کے عظیم اعزاز سے سرفراز ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے اکرم قوم کے ایک بہت بڑے محسن اور ہیرو ہیں اور چونکہ اکرم ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں پاک سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوتے شہید ہوئے اور نشان حیدر حاصل کیا۔ اس لئے وہ ایک فرد ہی نہیں بلکہ ان تمام ان گنت مجاہدوں، غازیوں اور شہیدوں کی تگ وتاز کی انمٹ علامت ہیں جنہوں نے اس خطۂ ملک کو بچانے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ ایسی کتاب کی مدتوں سے ضرورت تھی جوان جوانوں اور جیالوں کی سرفروشانہ جدوجہد کی ایک جھلک دکھا سکے۔

میجر اکرم شہید نشان حیدر پر یہ ایک کتاب اقبال کے بعض بنیادی تصورات کی تفسیر وتوثیق بھی کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہی جوان قبیلے کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے جس کا شباب بے داغ اور ضرب کاری ہو اور یہ کہ بے داغ شباب اور ضرب کاری کا تعلق دل بیدار سے ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو پوری قوم کی توجہ چاہتا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کی توجہ جو نوجوانوں کی ضرب کاری بنانے کے اداروں سے متعلق ہیں۔

یہ کتاب یہ ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ ہیرو آسمان سے نہیں اترتے۔ زمین ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ عام سے انسان ہوتے ہیں ان میں انسانی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں وہ کبھی کبھی امتحانوں میں فیل بھی ہو جاتے ہیں اور بعض مقابلوں میں کمزور بھی رہتے ہیں لیکن ان کی نگاہ بلند اور جان پُرسوز ہوتی ہے۔ وہ اپنے عزم و حوصلے سے، سوز یقین کی قوت سے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوتے ہیں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا جانتے ہیں اور وہ اپنے زور بازو پر اعتماد رکھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے اور زندگی میں ان کا رویہ احسان اور ایثار کا ہوتا ہے۔

اس پاک وطن کی پاک سرحدوں کو مضبوط اور محفوظ بنانے کے لئے ہمیں ہمیشہ میجر اکرم جیسے بہادر اور سرفروش نوجوانوں کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ اس لئے لازمی ہے کہ ہم اپنے گھروں میں اور اپنے اداروں میں ایسے نوجوانوں کی پرورش و پرداخت کرتے رہیں جن کا دل بیدار ہو۔

اس کتاب "اکرم نشان حیدر" کی دو خصوصیات قابل غور ہیں اوّل یہ کہ اس میں سیرت کا مواد براہِ راست اصل ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے اور تاثرات کو نہیں واقعات و معاملات کو اہمیت دی گئی ہے۔ واقعات و حقائق پر زیادہ انحصار کرنے سے ہیرو کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ بہت جاندار اور موثر ہے اور جہاں جہاں لوگوں کے تاثرات بھی بیان کئے گئے ہیں ان میں بھی واقعات ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ سیرت نگاری کے اس جدید سائنسی انداز نے اس کتاب کی قدر و قیمت کو دوچند کر دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب اکرم شہید کی شخصیت و کردار کا ایک نفسیاتی و تجزیاتی مطالعہ بن گئی ہے۔

اس کتاب کی دوسری امتیازی خصوصیت اس کی خوبصورت تکنیک ہے۔ ان اوراق میں رپوتاژ اور ڈرامہ دونوں کی جھلک نظر آتی ہے جس سے کتاب کی دلچسپی میں مزید اضافہ

ہو گیا ہے۔

اس طرح کی کتابیں عموماً تعریف کی بیجا تکرار، تاثرات کے ابہام اور بیانات کے مبالغہ سے بوجھل ہوتی ہیں لیکن اکرم شہید کی اس تصویر میں باریک لکیروں اور ہلکے رنگوں سے کام لیا گیا ہے جس سے تصویر کے نقوش میں زندگی و تابندگی آگئی ہے۔

اکرم نشان حیدر چونکہ ملٹری کالج کے فرزند تھے اس لئے یہ توقع بے جا نہ تھی کہ ملٹری کالج ہی کا کوئی قلم کار اٹھے اور اپنے نامور فرزند کی ایک موثر سوانح حیات مرتب کرے یہ فرض کفایہ اکرم کے ایک استاد پروفیسر سعید راشد نے پورا کیا اور حق یہ ہے کہ لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ اس کاوش کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شہیدوں پر انکی یہ تیسری کتاب ہے اللہ تعالیٰ ان کی یہ خدمت قبول فرمائے۔ آمین۔

سید نصیر الدین

راولپنڈی

جون ۱۹۸۰ء

خاموش سمندر

از

سید ضمیر جعفری

۱۹۸۳ء میں میرا سپاہی بیٹا (میجر احتشام جعفری) سٹاف کالج کوئٹہ میں کورس کر رہا تھا میں اس سے ملنے گیا تو کتابوں کے شیلف میں اردو کی تین نئی کتابیں نظر آئیں۔

تذکرہ شہداء

کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت

اکرم شہید نشان حیدر

مجھے وہاں پوتے پوتیوں سے مکالمے اور ان کتابوں کے مطالعہ کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے انہی کتابوں پر "ہاتھ صاف" کیا۔ ہم نے "ہاتھ صاف" کیا تھا۔ کتابوں نے ہمارا ذہن روشن کر دیا۔ جس کتاب کو ایک بار کھولا اس کو ختم کئے بغیر بند نہ کر سکا۔ ان کے صفحات میں بسی ہوئی میرے وطن کی محبوب اور مقدس خوشبو نے دامنِ دل کو برابر کھینچے رکھا۔

یہ تینوں کتابیں جنگ ستمبر و دسمبر کے غیور شہداء کے سوانحی تذکروں پر مشتمل ہیں۔ یہ تذکرے ہماری قومی تاریخ کے سفر میں منارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مستقبل کے "گلاب" ماضی کے انہی زخموں سے طلوع ہوں گے۔ فاضل مصنف قومی سطح پر ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک اہم ملی فرض (بلکہ قرض) کو اتنی لگن اور خوبی سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہماری نوجوان نسل کے ملی ذہن کی تربیت اور وسیع معنوں میں "پاکستانیت" کے فروغ میں ان کتابوں کا مطالعہ نتیجہ خیز ثابت ہو گا۔

اچھی تصنیف کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ بین السطور میں خود مصنّف بھی چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ جیسے MAN BEHIND THE GUN سوان کتابوں کے مطالعہ کے دوران مصنّف بھی ہمارے سامنے موجود رہا۔

کبھی آ کے منظرِ عام پر، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

ذاتی طور پر ہم مصنّف کو جانتے تھے۔ یہ تھے پروفیسر سعید راشد۔ پروفیسر راشد گذشتہ تینتیس برس سے پاکستان کی عظیم عسکری درس گاہ ملٹری کالج جہلم کے شعبہ تعلیمی تحقیقی و ترقی سے وابستہ ہیں۔ وہ ہمارے ملک کے نامور اساتذہ اور جیّد دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک ادیب کی حیثیت سے ان کی تحریر سلاست اور شادابی میں ایک اپنا انداز رکھتی ہے۔

اپنی عمر کے موجودہ مرحلے میں (اگر زندہ رہے انسان۔ بڑھاپا آ ہی جاتا ہے) راقم الحروف اگرچہ اب اس لائق تو نہیں رہا کہ عسکریانِ وطن صف میں ان کے دوش بدوش کھڑا ہو کر ان کے ساتھ قدم قدم چل سکے مگر دل تو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ دھڑکتا رہے گا۔

گذشتہ چند برسوں میں مجھے جہاں جہاں پاکستان کی بری فوج کے افسروں (جن میں جرنیل بھی شامل تھے) سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں سے ہر تیسرا شخص پروفیسر راشد کا شاگرد نکلا۔ یہ بات محض گنتی کے حساب سے بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں۔ لیکن جس بات نے مجھے بطورِ خاص متاثر کیا وہ دلی محبت اور سچے احترام کا وہ جذبہ تھا جس سے ان کا ہر شاگرد ان کو یاد کرتا ہے۔ ان کے شاگرد جب ان کو یاد کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے .... جیسے وہ اپنے کسی محسن کی بات کر رہے ہوں جو ان کا محبوب بھی ہو۔ آج کے زر پرست اور جاہ پرست معاشرے میں اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے مجھے تو صرف ایک ہی لفظ سوجھتا ہے۔ حیرت انگیز۔

"کلاس روم"، میں ان کے موتی لٹانے کی روداد ہم ایک مدت سے ان کے شاگردوں کی زبانی سن رہے تھے۔ ملاقات ہوئی تو ہم خود بھی گواہوں میں شامل ہو گئے۔ وہ کلاس روم سے باہر بھی اپنی گفتگو میں ادب و حکمت کے موتی لٹاتے ہیں البتہ بارش "موسلادھار" نہیں ہوتی۔ ممکن

ہے کہ بعض باتونی لوگ ان کو کم گو سمجھیں۔ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ وہ گفتگو برائے گفتگو کے قائل نہیں۔ نہ الفاظ کی فضول خرچی انہیں پسند ہے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے زندگی سے کوئی "عہد" باندھ رکھا ہو۔ اور جن کا ہر لمحہ اس عہد کے ایفا کی فکر میں گزرتا ہو۔ مجھے ان کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آدمی ان کی صحبت میں چاندنی کے ایک ایسے "ہالے" میں جا پہنچتا ہے کہ جس کی شعاعیں علم کی فضیلت، استاد کی شفقت اور تمدن کی شائستگی سے پھوٹتی ہیں۔ علم و ادب کا یہ خاموش سمندر، اب تک ہمیں تاریخ و تہذیب کے بہت سے آبدار موتی عطا کر چکا ہے۔

دیکھئے اس بحر سے اور ا چھلتا ہے کیا

سید ضمیر جعفری
چک عبدالخالق ضلع جہلم یکم جنوری ۱۹۸۴ء

میجر محمد اکرم شہید، نشانِ حیدر

از

ڈاکٹر غلام حسین اظہر

یہ کتاب ہمارے شہداء پر لکھی ہوئی کئی کتابوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کتاب کا سب سے منفرد پہلو سعید راشد صاحب کا یہ انداز فکر ہے کہ شہادت کوئی اتفاقی یا حادثاتی واقعہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی جڑیں شخصیت میں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ اس کے لئے برسوں سے دل و دماغ تیار ہو رہا ہوتا ہے۔ قلب و نظر کی مدتوں کی تربیت کسی فرد کو شہادت کے بلند منصب پر فائز کرتی ہے، شہدا کا طرز احساس بچپن سے لے کر شہادت پانے کے لمحے تک بالکل جداگانہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے سعید راشد صاحب محض جنگی واقعات بیان نہیں کرتے، بلکہ شخصیت کے اس بنیادی جوہر کی تلاش کرتے ہیں۔ جو ضمیر لالہ میں چراغ آرزو روشن کرتا ہے۔

شخصیت کی بنیادی جوہر کی تلاش کے لئے وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ اور تجزیہ کرتے ہیں، اکرم شہید کی داستان حیات کا آغاز انہوں نے بچپن کی زندگی سے کیا ہے۔ وہ ان کے خاندان کے مختلف افراد کے ناموں سے ان کے خاندان کے مزاج اور اس خاندان میں رچی بسی احسان اور ایثار کی قدروں کو اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں، بچپن کی تربیت اور آہ سحر گاہی کی بدولت اکرم شہید کی شخصیت میں احسان و ایثار کی جو قدریں راسخ ہو گئیں، ان کی آبیاری بعد کے حالات نے قدم قدم پر کی، اکرم شہید کو عملی زندگی میں کئی نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ہر قدم پر انہوں نے اپنے شوق، عزم اور حوصلے سے تاریک راہوں کو روشن کیا، اور بغیر کسی سہارے کے اپنی محنت اور دیانت کے سہارے زندگی میں اپنا مقام پیدا کیا

کچھ کچے، کچھ پکے مکان میں آنکھ کھولنے والا یہ شخص زندگی بھر اپنی زندگی سے بڑھ کر دوسروں کی زندگی بنانے پر توجہ دیتا رہا، اپنی تمام آمدنی اور توجہ اس نے اپنے گھر والوں پر صرف کی، شادی کی عمر ہوتے، اچھے رشتے ملنے کے باوجود وہ ہر بار یہی کہتا رہا کہ پہلے بھائیوں کو پڑھاؤں گا، والدین کو حج کراؤں گا، اس نے اپنی ساری پونجی اپنی بہن کی امداد پر خرچ کی، اسے مکان بنا کر دیا اپنے اعزا، کی مدد کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیا، اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے ہمیشہ خوشدلی اور وسیع النظری کا رویہ اختیار کیا۔ اور جب وطن پر سب سے مشکل وقت آن پڑا، تو ۱۹۷۱ میں اپنے ملک کی حفاظت کی خاطر اپنی جان قربان کر دی، اس کی ساری عمر کانٹے اٹھاتے گزری، ہر شخص کی راہ سے۔ یہ رویہ اکرم شہید کی شخصیت میں کس طرح رچ بس گیا، اس داستان کو مصنف نے ان کے والدین، بہن بھائیوں، ساتھیوں ہمرہوں اور دم سازوں کی زبان سے اتنی ہنرمندی سے بیان کیا ہے کہ اکرم شہید کی زندگی کا بنیادی جوہر کھل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

شہدا، کی شخصیت کی پہچان کا یہ رویہ، سعید راشد صاحب کی اس آرزو کا آئینہ دار ہے کہ ہمارا گھریلو ماحول اور تعلیمی فضا ایسی پاکیزہ اور صاف ستھری ہونی چاہیئے کہ اس میں پروان چڑھنے والا ہر نوجوان اعلیٰ مقاصد کی سربلندی کی خاطر جیئے اور مرے، اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ دوسروں کی زندگی کو نکھارنے اور سنوارنے میں بسر ہو، احسان وایثار کی اقدار کی آبیاری کے بغیر ایسی فضا کا پیدا ہونا اور قائم رہنا مشکل ہے۔ جو شہدا، کو جنم دیتی ہے، بڑا آدمی، بڑے ارادوں، بڑے حوصلوں اور بڑی قدروں اور بڑے عزم سے پیدا ہوتا ہے، یہ سعید راشد صاحب کا بنیادی فلسفہ حیات اور یہ فلسفہ ان کے قلم کی ایک ایک جنبش میں بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے اور پڑھنے والے کے دل میں بھی اعلیٰ مقاصد کی سربلندی کی آرزو پیدا کرتا ہے۔ یہ کام وہ وعظ وتلقین سے نہیں کرتے بلکہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور جزئیات کے بیان سے کرتے ہیں، اسی وجہ سے ہمیں کہیں بھی پند وعظمت کی پرچھائیں نظر نہیں آتی۔ لیکن ان کے دیدہ تر کی بے خوابیاں اور دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والی آرزوئیں اور دعائیں بار بار ابھر کر سامنے آتی ہیں، اور پڑھنے والے کے دل ودماغ کی

کایا پلٹ دیتی ہیں۔ یوں ان کی یہ کتاب محض ایک شہید کی داستان حیات ہی نہیں، بلکہ ایک دعوت فکر و عمل ہے جو ہمیں پورے سماج کو اخوت کی جہانگیری کی بنیادوں پر استوار کرنے پر ابھارتی ہے، تاکہ شہادت کی آرزو ہمیشہ دلوں میں انگڑائیاں لیتی رہے، اور آزادی کے ثمرات سے پورا ملک فیض یاب ہوسکتا ہے، شہداء کے تذکرے میں اتنی تہہ داری اور گہری بصیرت بہت کم نظر آتی ہے۔ یہ تہہ داری اور بصیرت محض فکر و نظر کی بلندی کی عطا کی نہیں ہے بلکہ اس میں دردمندی اور دلسوزی بھی کارفرما ہے، تہہ داری اور بصیرت، دردمندی اور دلسوزی کا ایسا رچاؤ ہمیں کم کم ہی ملتا ہے، یہ کمیاب حلاوت اور گھلاوٹ ان کی اس کتاب کی سب سے امتیازی خوبی ہے۔

دیباچہ

اقبال کا مشہور شعر ہے۔

وہی جوان ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

اکرم شہید کی زندگی کی داستان بے داغ شباب اور کاری ضرب کی داستان ہے اصل میں ضرب کاری اسی کی ہوتی ہے۔ جس کا شباب بھی بے داغ ہو۔ اور بے داغ شباب دل بیدار کا نتیجہ ہوتا ہے۔

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری

اکرم نے پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دی اور بڑے حوصلے سے جان دی۔ اکرم کی پوری زندگی اور کارناموں کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نظریاتی جنگ وہی لڑ سکا ہے۔ جس کی اپنی نظریاتی جڑیں بھی مضبوط ہوں۔ اکرم پکے مسلمان اور کٹر پاکستانی تھے۔ ذہنی طور پر ہی نہیں عملی طور پر بھی۔

شجاعت اور دینداری اکرم کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اکرم کو اکرم بنانے میں ان کے والدین کی آہ سحر گاہی کا بھی کم دخل نہیں تھا۔ اکرم کے گھرانے کی دینداری رسمی اور روایتی نہ تھی بلکہ سچی اور کھری دینداری تھی جس کی بنیاد تقوے پر تھی۔

اکرم کی تعلیم و تربیت نے ان کے طبعی جوہر کو چمکایا اور توفیق الٰہی نے انہیں اس رتبہ بلند پر پہنچا دیا جو ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتا۔

میجر اکرم شہید نشان حیدر کے حالات زندگی اور کارناموں کے اس جائزے

سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بڑا آدمی بڑے ارادوں بڑے حوصلوں اور بڑی قدروں اور بڑے عزم سے بنتا ہے۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس مقام پر پہنچنے کے لئے جہاں اکرم پہنچے بظاہر حالات ان کے لئے سازگار نہیں تھے۔ شروع میں وہ تعلیم میں پیچھے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ ساتویں درجے کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ بمشکل پاس ہوئے۔ ان کی تعلیمی حالت کے پیش نظر انہیں ۱۹۵۳ء میں کمیشن کے قابل بھی نہ سمجھا گیا تھا۔ اس لئے انہیں جلد کالج چھوڑنا اور بوائز کمپنی میں بھرتی ہونا پڑا۔ کالج کے تعلیمی ماحول سے نکل کر بوائز کمپنی کے حوصلہ فرسا غیر علمی ماحول کے اندھیرے میں انہوں نے صرف اپنے شوق، عزم اور حوصلے سے اپنی راہوں کو روشن کیا اور کسی کے سہارے کے بغیر صرف اپنی محنت اور دیانت کے سہارے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ :-

پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

اکرم کی زندگی کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ بڑے کارنامے اتفاقی اور حادثاتی طور پر واقع نہیں ہوتے ان کے لئے دل و دماغ کو برسوں تیار کرنا پڑتا ہے۔ قلب و نظر کی مدتوں تربیت کرنی پڑتی ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ اوراق اسی مرد خود آگاہ و خدا مست کی زندگی اور کارناموں کی روئداد پر مشتمل ہیں یہ روئداد مرتب کرنے میں حد درجہ تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اور مواد کو دلچسپ اور موثر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ پیش کش کی ڈرامائی تکنیک کو اپنایا گیا ہے اور جہاں تک ممکن ہوا ہے تاثرات پر نہیں واقعات پر انحصار کیا گیا ہے۔

اس کتاب کو مرتب کرنے اور مواد فراہم کرنے میں ۸ پنجاب اور ۴ ایف ایف آر کے ہر

درجہ کے عہدیداروں، ملٹری کالج کے اولڈ بوائز اور شہید کے لواحقین نے بھرپور تعاون کیا ہے۔ میں ان سب کا ممنون ہوں۔ ان سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا تو ممکن نہیں ہے پھر بھی کچھ نام ایسے ہیں جن کا تذکرہ نہ کرنا ناشکر گزاری ہوگی۔ ۸ پنجاب کے لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب، صوبیدار میجر عبدالعزیز اور صوبیدار میجر عبداللہ اے۔ ای۔ سی نے اکرم کے ۴ پنجاب اور ۸ پنجاب کے زمانے پر بہت نادر معلومات فراہم کیں۔ اکرم کے ۴ ایف ایف آر کے دور کی کارکردگی پر بریگیڈیر محمد حیات ستارۂ جرأت، بریگیڈیر ممتاز ملک ستارۂ جرأت، بریگیڈیر محمد اخلاق عباسی ستارۂ جرأت، بریگیڈیر اے قادر، لیفٹیننٹ کرنل جولین پیٹر۔ لیفٹیننٹ کرنل آصف ہارون صوبیدار میجر محمد دین نے بہت قیمتی انٹرویو دیئے اور تبصرے کئے۔ اسی پلٹن ۴ ایف ایف آر کے نائیک محمد مانک اور سپاہی سعید خان نے شہید کی شخصیت کے بعض تابناک گوشے بے نقاب کئے۔ ۲۱ ایف ایف آر کے نائیک امیر دل خان، اور نائیک نواب خان نے شہید کی میت کی بازیابی کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اے۔ ای۔ سی کے صوبیدار میجر محمد اعظم علوی نے شہید کی تدفین کے بارے میں لکھا۔ لیفٹیننٹ کرنل غلام اکبر پنجاب رجمنٹ نے شہید کی شخصیت کی شگفتہ مزاجی کے پہلو سے پردہ اٹھایا۔

میں ان سب کا خلوص دل سے شکر گزار ہوں۔ جن اولڈ بوائز نے اس کار خیر میں میرا ہاتھ بٹایا ان کی فہرست بھی طویل ہے۔ بہرحال ان میں سے بریگیڈیر عاشق ملک کرنل محمد یونس، بریگیڈیر محمد یونس، بریگیڈیر آر ڈی بھٹی، لیفٹیننٹ کرنل محمد افسر، لیفٹیننٹ کرنل خالد بشیر، بریگیڈیر رب نواز خان، لیفٹننٹ کرنل عبدالرحیم، لیفٹننٹ کرنل منیر پراچہ لیفٹننٹ کرنل محمد اسلم، لیفٹننٹ کرنل فرید ملک، لیفٹننٹ کرنل پرویز اختر۔ لیفٹننٹ کرنل عبدالغفار، کیپٹن محمد امین کیانی، حسن اختر، اورنگ زیب خان، راجہ محمد افضل، شوکت جنجوعہ اور عزیز احمد خاص طور پر بہت کام آئے۔ خدا ان کو خوش رکھے۔

ان سب کے علاوہ اکرم شہید کے تایا، صوبیدار میجر گوڈر خان، والد حاجی سخی محمد، والدہ عائشہ بی بی، بہن مختار بیگم، بہنوئی ملک محمد حنیف، چچازاد بھائی ملک محمد اصغر اور بھائیوں صوبیدار عبدالرشید، ملک محمد افضل، ملک عبدالقیوم، ملک عبدالحفیظ اور عبدالرزاق کا شکریہ سب سے زیادہ واجب ہے کہ ان اصحاب نے شہید کے بارے میں بنیادی معلومات مہیا کیں۔ سبحان اللہ۔

چند اولڈ بوائز نے اس مسودہ کو پڑھ کر مجھ سے کہا، آپ نے اکرم کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کہیں نہیں کیا۔ آخر اکرم آپ کے شاگرد تھے۔ تین برس آپ نے انہیں پڑھایا تھا۔ اس تبصرہ پر میرا جواب یہ تھا کہ جس زاویئے اور جس انداز سے یہ کتاب لکھی گئی ہے وہی میرا تاثر ہے۔ مصوّر اپنی تصویر کی ہر لکیر، اور ہر رنگ میں ہوتا ہے۔ اس کو سامنے آنے کی ضرورت نہیں۔ اکرم کے بارے میں میری رائے ہر لفظ، ہر سطر میں موجود ہے۔ اکرم شہید کا استاد ہونا میرے لئے باعث عزت ہے۔ اور اس کتاب کی تالیف کو میں اپنے لئے باعث نجات سمجھتا ہوں۔ خدا اس خدمت کو قبول فرمائے۔ اور اس چراغ سے کچھ اور چراغ روشن ہوں۔ آمین۔

سعید راشد

بابِ اوّل

کاروانِ زندگی

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ———— ۴ر اپریل ۱۹۳۸ء

مقام پیدائش ———— ڈنگہ

تعلیم ———— ملٹری کالج جہلم

کمیشن ———— ۲۸ پی-ایم-اے

تاریخ شہادت ———— ۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء

شہادت کے وقت عمر ———— ۳۳ سال (غیر شادی شدہ)

اعزاز ———— نشان حیدر

مقام شہادت ———— ھلی-مشرقی پاکستان

مدفن ———— بوگرہ-مشرقی پاکستان

میجر اکرم شہید نشان حیدر

استاد ــــــ پانی کے مٹکوں میں پانی تم بھرتے ہو؟

شاگرد ــــــ جی، جناب،

استاد ــــــ کس وقت؟ میں تو جب اسکول آتا ہوں پانی بھرا ہوا ہوتا ہے۔

شاگرد ــــــ جناب، میں فجر کی نماز کے بعد پانی بھرنے آتا ہوں۔

استاد ــــــ اتنے سویرے آنا اور اتنی دور سے پانی لانا۔

بچے۔ تو کیوں تکلیف اٹھاتا ہے۔

شاگرد ــــــ جناب، یہ کوئی تکلیف نہیں۔

استاد ــــــ پھر بھی کیا فائدہ؟ ہم نے ماچھی عورت جو رکھی ہوئی ہے۔ مہینے کے مہینے دو روپے اسے اسی کام کے دیتے ہیں۔ تجھے کیا پڑی ہے۔ جس کا کام اسی کو کرنے دے۔

شاگرد ــــــ جناب، یہ ثواب کا کام ہے۔ آپ مجھے پانی بھرتے رہنے کی اجازت دیں۔

ــــــ یہ استاد منشی فرمان علی تھے۔ پرائمری اسکول نکا کلاں کے ہیڈ ماسٹر جو اپنے اسکول کے چوتھے درجے کے ایک طالب علم محمد اکرم کو پیار سے تنبیہ کر رہے تھے۔

صبح کا وقت ہے دو نوجوان نکا کلاں سے نکلے اور باہر کھیتوں میں سیر کے لئے چل کھڑے ہوتے۔ کھیتوں کے آس پاس کہیں ببول کی شاخوں کی باڑھیں لگی ہیں جن کے کانٹے جہاں تہاں پگڈنڈیوں پر بکھرے پڑے ہیں جوں ہی کوئی کانٹا پڑا نظر آتا ہے ان دو میں سے ایک سانولے رنگ کا اور لمبے قد کا جوان رکتا ہے اور کانٹے کو اٹھا کر ایک طرف کر دیتا ہے اور

پچھتر گئے بڑھتا ہے۔ اس طرح جب دو تین بار ہوا تو دوسرے نوجوان سے نہ رہا گیا۔

دوسرا نوجوان ——— بھائی جان۔ میں عرض تو پہلے ہی کر چکا ہوں، آپ اتنی بار ان کمبخت کانٹوں کو ہٹانے رکتے ہیں کہ سیر کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے۔ کل بھی آپ نے یہی کیا تھا۔

پہلا نوجوان ——— لڑکے بالے ننگے پیر بھی ادھر سے گزرتے ہیں اگر کسی کے یہ کانٹا چبھ جائے تو۔

دوسرا نوجوان ——— چبھے کیوں؟ چلنے والا دیکھ کر چلے، آخر یہ کانٹے ہم نے تو نہیں بکھیرے؟ ہم کیوں اس بکھیڑے میں پڑیں۔

پہلا نوجوان ——— پھر اور کون پڑے گا۔ ہم لوگ پڑھے لکھے ہیں سمجھ دار ہیں اگر ہم بھی ان کانٹوں کو نہ اٹھائیں گے تو پھر ان کانٹوں کو اٹھانے آسمان سے فرشتے آئیں گے؟

اس دوسرے نوجوان کا نام سپاہی محمد اکرم تھا۔ جبکہ پہلا نوجوان اس کا دوست اور چچازاد بھائی محمد اصغر ملک تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۵ء کا ہے۔

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ڈیرہ نواب شاہ سے ۸ پنجاب کے پندرہ سپاہی لاہور آرمی سپیشل کا امتحان دینے آئے۔ وہ لمبا سفر کر کے شام کو لاہور پہنچے تھے۔ دوسرے روز پرچہ تھا۔ نہا دھو کے اور چائے کی پیالی پی کے دوسرے جوانوں نے بکسوں سے اپنی اپنی کتابیں نکالیں کہ کچھ امتحان کی تیاری کر لیں۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

پہلا نوجوان ——— داتا کی نگری لاہور آگئے پہلے داتا کو چل کے سلام کرتے ہیں۔

دوسرا نوجوان ——— ارادہ تو میرا بھی تھا۔ لیکن جلدی کیا ہے۔ ابھی ابھی پہنچے ہیں تھکے ہوئے بھی ہیں۔ کل پرچہ بھی ہے۔ پھر کبھی سہی۔

پہلا نوجوان ——— بھئی۔ داتا صاحب کیا کہیں گے کہ لڑکے بہاولپور سے یہاں میری چوکھٹ تک آتے۔ پھر محض امتحان کی خاطر سلام کو جانا نہیں ہوتے۔

جناب، میں تو چلا آپ گھوٹا لگائیے۔

یہ نوجوان سپاہی جو فوراً داتا کے مزار پر حاضری دینے پر اصرار کر رہا تھا۔ محمد اکرم تھا۔ اور اس کے دوست ساتھی کا نام نواب خان تھا۔ جس کا تعلق اے ای سی سے تھا۔

۶۵ء کی جنگ کے بعد ۴ ایف ایف آر سیالکوٹ میں مقیم تھی۔ اس کا کیپٹن کوارٹر ماسٹر اپنے روزمرہ کے انسپکشن پر نکلا۔ ایک بیرک کے سامنے سے گزر ہوا تو دیکھا کہ ایک جوان نوار کی چارپائی کی پٹی پر بوٹ رکھے اپنے تسمے باندھ رہا ہے یہ دیکھتے ہی وہ جوان کے پاس گیا۔

کپتان ——— جوان یہ تم کیا کر رہے ہو؟

جوان ——— جناب میں بوٹ کے تسمے باندھ رہا ہوں۔

کپتان ——— اور پاؤں کہاں رکھا ہے؟

جوان ——— چارپائی کی پٹی پر جناب۔

کپتان ——— دیکھو۔ بوٹوں میں لوہے کی کیلیں لگی ہوئی ہیں اگر اس طرح نوار پر بوٹ رکھ کر تسمے باندھو گے تو بوٹ کی کیل سے نوار کو ایک بار نہیں تو دوسری بار ضرور تھوڑا بہت نقصان پہنچے گا۔ رسّی ہو یا نوار چھوٹی چیز ہو یا بڑی ہر چیز پاکستان کی ہے۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی لاپرواہیوں سے بڑی بڑی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کپتان کوارٹر ماسٹر محمد اکرم تھے۔ اور اس سپاہی کا نام نواب خان تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۶۷ء کا ہے۔

مارچ ۱۹۷۱ء کے آخری دنوں کی بات ہے ۴ ایف ایف آر کو فوری طور پر

۲۴ گھنٹوں کے نوٹس مشرقی پاکستان پرواز کرنے کے لئے جلد سے جلد کراچی پہنچنے کا حکم ملا۔ بٹالین کی "سی" کمپنی کے میجر کمانڈر نے فوراً اپنے سینئر جے سی او صوبیدار محمد دین کو بلا بھیجا۔

کمپنی کمانڈر ــــــ صوبیدار صاحب نئے حکم کا آپ کو پتہ چل گیا ہو گا۔

صوبیدار ــــــ جناب، تیاری شروع ہو چکی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وقت پر سارا کام مکمل ہو جائے گا لیکن وقت بہت تھوڑا ملا ہے۔

کمپنی کمانڈر ــــــ صورت حال ہی ایسی ہے۔ مشرقی پاکستان کو بچانا ہے مجھے تو اسی دن کا انتظار تھا۔ اس کمپنی کمانڈر کا نام میجر محمد اکرم تھا۔

---

۲۱ اپریل ۷۱ء کی صبح کو ۴۔ ایف ایف آر کی "سی" کمپنی بوگرہ سیکٹر (مشرقی پاکستان) میں نئے کڑی گرام سے پرانے کڑی گرام گاؤں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حسب عادت کمپنی کمانڈر آگے آگے تھا۔ اس علاقے میں مکتی باہنی کے آدمی چھپے ہوئے تھے۔ خطرہ تھا کہ کہیں درختوں کی آڑ سے فائر نہ آ جائے۔ کمپنی کمانڈر کا بیٹ مین دو قدم پیچھے چل رہا تھا۔ جب اسے خطرے کا احساس ہوا تو اس نے تیزی سے آگے آ کر اس طرح کمانڈر کے ساتھ بلکہ آگے چلنے کی کوشش کی کہ اگر کسی کمین گاہ سے یکایک فائر آئے تو کم ازکم پہلے کمپنی کمانڈر اس کا نشانہ نہ بنے بیٹ مین جب ایک آدھ بار آگے پیچھے ہوا تو کمانڈر نے کہا۔

"سعید خان! رک جاؤ۔"

اور سعید خان رک گیا۔

"حکم؟"

"سعید خان۔ یہ بتاؤ کہ تنخواہ تمہیں زیادہ ملتی ہے یا مجھے۔"

"صاحب آپ کمپنی کمانڈر ہے۔ میجر ہے۔ آپ کا تنخواہ زیادہ ہے۔ بہت زیادہ ہے۔"

تو پھر خطرے کا مقابلہ کرنے کا، گولی کھانے کا حق بھی میرا زیادہ بنتا ہے۔"

یہ کمپنی کمانڈر میجر محمد اکرم تھے۔

اب وہ گفتگو سنیئے جو ہلی کے محاذ پر اسی "سی" کمپنی کے کمانڈر کی اپنے سگنل مین نائیک محمد مانک سے ہوئی۔

"مانک آج تیسرا دن ہے۔ بات نہیں بن رہی۔ ان ٹینکوں کا کچھ بندوبست کرنا چاہیئے۔"

"سر"

"تو پھر کوئی ہے جو شیر بنے؟"

"جناب! آپ حکم دیں۔ یہ شیروں کی کچھار ہے۔"

"اچھا (کچھ سوچ کر) تو پھر مجھے خود ہی شیر بننا پڑے گا۔"

یہ واقعہ ۴۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات کا ہے۔ صبح ۵ دسمبر ۷۱ء کی صبح اس کمپنی کمانڈر نے خود شیر بن کے دکھایا۔

یہ کمپنی کمانڈر میجر محمد اکرم شہید تھے۔ جنہوں نے ۵ دسمبر ۷۱ء کی صبح کو پاکستان کا پانچواں نشان حیدر لیا۔

میدان جنگ میں بھی ہیرو وہی ہوتا ہے جو زندگی میں بھی ہیرو ہو۔ میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کی زندگی اور شہادت کی داستان بہترین انسانی، اسلامی اور عسکری قدروں کی لازوال داستان ہے۔

میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کی زندگی، کارناموں، اور شخصیت و کردار کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش

گجرات شہر سے پینتیس میل دور کھاریاں رسول روڈ پر ایک قدیمی قصبہ ہے ڈنگہ۔ اس

ڈنلے ریلوے اسٹیشن شہر کے وسط میں ایک پرانا کچھ کچا پکا مکان اب بھی کھڑا ہے۔ ننھیال کے اس مکان میں اکرم ۴۔ اپریل ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ صبح صادق کا وقت تھا اور پیر کا دن۔ جب بچے کو نہلایا یا دھلایا جا چکا تو پرہیزگار نانا ملک محمد دین نے اس کے کان میں اذان دی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر نانی حسن بی بی نے نواسے کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اور بیٹی سے کہا۔

عائشہ یہ بیٹا میرے گھر پیدا ہوا ہے۔ اس کا نام میں رکھوں گی۔ اور حسن بی بی نے بڑے چاؤ سے اپنے دوسرے نواسے کا نام اکرم رکھا۔ نام اچھا تھا۔ ددھیال کو بھی پسند آیا اور بچہ کا نام اکرم پڑ گیا۔ اس نام کو قضا و قدر نے بھی پسند کیا ہوگا۔ چونکہ آگے چل کر اس بچے کو "کریم" ہی نہیں "اکرم" بننا تھا۔

جب بچہ مہینہ سوا مہینے کا ہوا تو عائشہ بی بی اسے لے کر اپنی سسرال نکا کلاں آگئیں نکے ہی میں اکرم کا عقیقہ ہوا۔ اور ایک بار پھر بچے کی پیدائش کی خوشی منائی گئی۔

نکا کلاں

جہلم پنڈ دادنخان روڈ پر دارا پور سے چھ میل مغرب اور جہلم سے بیس میل جنوب میں مشہور پہاڑی سلسلہ ٹلہ جوگیاں کے دامن میں ایک نالہ بہتا ہے۔ جس کا نام بناؤ ہے۔ اس نالے کے جنوبی کنارے پر دو گاؤں آباد ہیں۔ نکا کلاں اور نکا خورد (نکا ٹیکری یا چوٹی کو کہتے ہیں) نکا کلاں کی آبادی نکا خورد سے کچھ زیادہ ہے۔ اس لئے یہ گاؤں نکا کلاں کہلاتا ہے۔ چونکہ اکرم نکے ہی میں پل بڑھ کر جوان ہوتے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی تھی۔ اسی کی فضاؤں میں ان کے شعور نے آنکھ کھولی۔ ان کا آبائی گاؤں بھی یہی تھا۔ اسلئے اکرم کو نکا کلاں ہی کا سپوت کہنا چاہیئے۔

اصل اور نسل

نکا کلاں میں قریب دو سو سال سے ایک نہایت ہی نیک نام گھرانہ، اعوان قوم کا

آباد ہے۔ اکرم شہید کا نسلی تعلق اعوانوں کے اسی خاندان سے تھا۔ چونکہ انسان پر اسکی نسلی اور خونی روایتوں کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اعوانوں کی تاریخ کا ایک خاکہ پیش کیا جائے۔

اعوان

اعوانوں کی اصل و نسل کے بارے میں مختلف تاریخی روایات ہیں۔ بعض مورخوں نے ان کا نسلی رشتہ باختری یونانیوں سے جوڑا ہے۔ بعض نے انہیں ایرانی النسل کہا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ نسلاً افغان ہیں۔ چند انگریز اور ہندو مورخوں کا اصرار ہے کہ اعوان اصل و نسل کے اعتبار سے خالصتاً ہندی جاٹ ہیں۔ اس مکتب خیال کے مورخوں نے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ لفظ اعوان اصل میں سنسکرت کا لفظ آوان ہے۔ جس کے معنی محافظ کے ہیں چونکہ کوہستان نمک کے علاقے کے یہ جنگجو قبیلے بیرونی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے اور جہلم کے اس پار کے علاقے کو تحفظ فراہم کرتے تھے۔ اس لئے ان کو قدیم ہندو حکومت کے زمانے میں آوان (محافظ) کا لقب دیا گیا۔ بعد میں سلاطین غزنیہ کے عہد میں یہ آوان ایک بزرگ حضرت قطب شاہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تو اس قبیلہ کے لوگ اپنے آپ کو قطب شاہی اعوان کہلانے لگے۔

لیکن زیادہ تر مورخوں کا اتفاق اس تحقیق پر ہے کہ اعوان عربی النسل ہیں اور علوی سید ہیں تفصیل اس امر کی یہ ہے کہ عباسیوں کے دور اقتدار میں ان کی دارو گیر سے بچنے کے لئے حضرت علی رضہ کے ایک بیٹے حضرت محمد ابن حنیفہ یا حضرت عباس کی اولاد میں سے کچھ سربر آوردہ لوگوں نے ہرات قندھار کی طرف ہجرت کی اور ہرات کو اپنا مستقر بنالیا۔ اور رفتہ رفتہ اس علاقے کے حاکم و سردار کی حیثیت اختیار کرلی۔ جب غزنی میں محمود غزنوی کے باپ امیر سبکتگین کی حکومت قائم ہوئی اور پشاور کے ہندوستانی راجہ جے پال اور اس نے

حلیفوں سے اس کی جھڑپیں شروع ہوئیں تو اس جہاد میں ہرات کے علوی سیّد وں نے سبکتگین سے بھرپور تعاون کیا۔ اس قبیلہ کے سردار عطاء اللہ شاہ سبکتگین کے لشکر میں سپہ سالار کے منصب پہ فائز ہوتے۔ اور انہوں نے ہندوؤں کے خلاف سرحدی معرکوں میں دادِ شجاعت دے کر سبکتگین سے غازی کا لقب پایا۔ غازی عطاء اللہ شاہ علوی کے تین بیٹے تھے۔ میر ساھو، میر قطب حیدر، اور میر سیف الدین عطاء اللہ شاہ علوی کے یہ دوسرے بیٹے میر قطب حیدر علوی (جو بعد کو قطب شاہ کے نام سے مشہور ہوتے) اعوانوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔

جب محمود غزنوی نے ہند کے بتکدے پر اپنے مشہور حملے شروع کیے تو اس جہاد میں میر قطب شاہ علوی نے اپنی اور اپنے قبیلے کی خدمات محمود غزنوی کو پیش کر دیں محمود نے انہیں خوش ہوکر برسرِ دربار اعوان کے لقب سے نوازا۔ (اعوان عون کی جمع ہے عون عربی میں مدد اور تعاون کے معنوں میں آتا ہے۔ اس طرح اعوان کے معنی ہوتے معاون، مددگار)

سومنات کے معرکے میں ہرات کے علوی سردار قطب حیدر یا قطب شاہ محمود غزنوی کے پابہ رکاب تھے۔ سومنات سے واپسی پر، میر قطب شاہ سلطان محمود کی اجازت سے اپنے نو بیٹوں کے ساتھ دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی کوہستان نمک کے علاقے میں رہ بس گئے۔ محمود نے یہ سارا علاقہ اپنے اعوان کو جاگیر کے طور پر عطا کر دیا۔ اس وقت سے اعوانوں کی بستیاں۔ میانوالی، شاہ پور، کیمبل پور، اور جہلم کے اضلاع میں چلی آتی ہیں۔ قطب شاہ کے بڑے بیٹے مزمّل علی کلغان کا مستقر ضلع میانوالی کا قلعہ دھنکوٹ تھا۔ سکیسر، تلہ گنگ کالاباغ کا یہ علاقہ (جو قاریوں اور حافظوں کی کثرت کی وجہ سے اعوان قاری کے نام سے مشہور ہے) کالاباغ کے کلغان اعوانوں کا مرکز ہے۔ اور ان کا لقب ملک ہے۔ اعوانوں کی اس ملک گوت کے لوگ ضلع جہلم میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور صدیوں سے دوسرے اعوانوں کی طرح ان کا بھی خاص پیشہ سپہ گری رہا ہے۔

اعوانوں کی تاریخ کے اس مختصر جائزے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ شجاعت و بسالت کی روایت اعوانوں کے خون میں ہے۔ان کے علاوہ علوی سید ہونے کے ناطے دینداری اور کشادہ دلی بھی ان کے آباؤ اجداد کے کردار کا خاصہ رہی ہے۔

میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر بھی قطب شاہی اعوان تھے۔اور قطب شاہی اعوانوں کی بہترین عسکری اور دینی روایات کے حامل۔

اکرم شہید کے آباؤ اجداد

اکرم شہید کے آباؤ اجداد کے مستند حالات کے لئے ہم نے اکرم کے تایا صوبے دار میجر گوڈر خان صاحب سے رجوع کیا۔ان سے یہ باتیں ہوئیں۔

سوال:۔ صوبیدار میجر صاحب! اس وقت آپ کی عمر کیا ہوگی؟

جواب:۔ ۱۸۸۹ء کی پیدائش ہے۔اب ۱۹۸۰ء ہے آپ خود حساب لگا لیجئے۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں ۲۸ پنجاب میں بھرتی ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں حوالدار کی حیثیت سے عراق میں لڑائی دیکھی زخمی ہوا۔ جنوری ۱۹۳۷ء میں صوبیدار میجر کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ ریٹائرمنٹ سے سال ڈیڑھ سال پہلے جب میں پلٹن میں صوبیدار میجر تھا تو فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان صاحب کپتان ہوا کرتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ نوکری کرنے کا موقعہ ملا ہے۔

سوال:۔ بہت خوب آپ خود ایک عہد کی تاریخ ہیں۔اس سے پہلے کہ ہم آپ سے آپ کے خاندان کی تاریخ کے بارے میں کچھ پوچھیں یہ بتایئے کہ آپ کے نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

جواب:۔ کیا مطلب؟

سوال:۔ یعنی آپ کا نام گوڈر خان کس نے رکھا اور کیوں رکھا۔؟

جواب:۔ مجھ سے پہلے میرے والدین کی اولاد جیتی نہیں تھی۔میرے دو بھائی اور ایک بہن

چھوٹی عمر ہی میں وفات پا گئے تھے۔ جب میں بہت سی دعاؤں اور منتوں کے بعد پیدا ہوا تو اتفاق سے گھر میں ایک صوبیدارنی موجود تھیں۔ انہوں نے کہا بچہ کا نام گوڈر رکھو تاکہ نظر نہ لگے اور بچہ زندہ رہے۔ اللہ نے میری عمر میں برکت دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ پوتے پڑپوتوں والا ہو کر آپ کے سامنے ہوں۔ میرے بعد میرے چھوٹے بھائی سخی محمد پیدا ہوئے میجر اکرم شہید انہی کے دوسرے بیٹے تھے۔

سوال:- اب کچھ اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں فرمائیے۔ نکا کلاں میں آپ لوگ کب سے آباد ہیں؟ آپ کے بزرگوں میں سے سب سے پہلے کون یہاں آکر آباد ہوا۔ اور وہ بزرگ کہاں سے آئے تھے۔

جواب:- میرے نکڑ دادا کا نام جوایا خان تھا۔ وہ اپنے تین بیٹوں کرم خان، چنن دین اور نیک محمد کے ساتھ پہلے پہل نکا کلاں میں آباد ہوئے۔

سوال:- جوایا خان کہاں سے آئے تھے اور کب؟

جواب:- میں نے ۱۸۵۷ء کے بندوبست اراضی کے کاغذات دیکھے ہیں۔ ان میں جوایا خان کا یہ بیان لکھا ہے کہ نکا کلاں کے چاہ اعواناں پر ہمارا موروثی حق ہے۔ ہم لوگ سکھوں کے عہد سے ستر سال پہلے دنہار تحصیل پنڈ دادنخان سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ گویا ہم لوگ پکے اعوان ہیں۔ اور اعوانوں کے علاقے دنہار سے قریب دو سو سال پہلے یہاں یعنی نکا کلاں میں آکر آباد ہوئے۔ میرے والد فضل خان کے والد یعنی میرے دادا الٰہی بخش انہی جوایا خان کے بڑے بیٹے کرم خان کے بیٹے تھے۔ میرے والد فضل خان کاشتکاری کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی راجہ خان فوج میں جمعدار تھے۔ انہی جمعدار راجہ خان نے مجھے ۲۸ پنجاب میں بھرتی کرایا تھا۔ پھر ہم دونوں ایک کمپنی اور ایک بلٹن میں عراق میں ایک ساتھ لڑے۔ مجھے یاد ہے پہلا حملہ ۱۲ مارچ ۱۹۱۵ء کو ہوا تھا۔ وہاں ہمارا پورا ایک ڈویژن گھیرے میں آگیا تھا۔ اس کو چھڑانے کے لئے ۱۵ اپریل ۱۹۱۵ء کو دوبارہ

حملہ کیا گیا۔ اس میں ہمارا بہت نقصان ہوا تھا۔ اسی حملے میں زخمی ہونے پر دوسرے بہت سے زخمیوں کے ساتھ مجھے کراچی بھیج دیا گیا۔ جنگ میں بہادری دکھانے کے لئے جنگی کا غذات میں میرا بھی ذکر ہوا تھا۔ اس وقت میں حوالدار تھا۔ میرے چچا جمعدار راجہ خان ۲۱ مارچ ۱۹۱۷ء کو وہیں جنگ میں کام آئے ان کو بہادری کا کوئی تمغہ بھی ملا تھا۔ اسی طرح میرے ماموں اور اکرم کے نانا کے بھائی جیون خان جو ہانگ کانگ رجمنٹ میں حوالدار تھے۔ بڑے رعب وداب کے آدمی تھے۔ شکل وشباہت ڈیل ڈول میں ہزاروں میں ایک تھے ان کو جارج پنجم کی تاجپوشی میں شرکت کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ ہمارے ایک اور عزیز ۱۸ رسالے کے دفعدار میجر عبداللہ خاں نے اپنی کارگزاری کی وجہ سے رسم تاجپوشی میں ہندوستانی فوج کی نمائندگی کی تھی۔ ان کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ دوڑتے ہوئے گھوڑوں پر اپنی جگہ بدل لیتے تھے۔ تاجپوشی کے موقعہ پر انہوں نے سولہ گھوڑے ایک ساتھ دوڑائے۔ اور دوڑتے دوڑتے ایک سے دوسرے گھوڑے پر سوار ہوتے رہے۔ یہاں تک سولہویں گھوڑے تک جا پہنچے اس کرتب کی مشق انہوں نے دھلی جا کر کی تھی۔ عبداللہ خان کا ابھی کوئی پانچ سال پہلے انتقال ہوا ہے چچا راجہ خان نے تاجپوشی کی باتیں مجھے خود سنائیں۔ یہ سارے خاندانی قصے میجر اکرم کی گھٹی میں پڑے تھے۔ سپہ گری کے علاوہ دوسری چیز جو ہمارے خاندان کی خصوصیت رہی ہے۔ وہ دینداری ہے۔ گاؤں کی مسجد بنانے میں ہم لوگوں کا بڑا حصہ ہے۔ اس کی دیکھ بھال بھی ہم ہی کرتے آئے ہیں۔ میرے بیٹے میجر محمد شریف اور بھتیجے میجر محمد اکرم دونوں مسجد کی مستقل مالی امداد کیا کرتے تھے۔ میرے چھوٹے بھائی (اکرم کے والد) حاجی سخی محمد برسہا برس سے تہجد گزار ہیں۔ گاؤں میں مشہور ہے کہ ہمارے خاندان کے چھوٹے بڑے یا تو مسجد میں ہوتے ہیں یا کنوئیں پر (کاشت کاری کے سلسلے میں) اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا گھرانہ باپ دادا کے زمانے سے دین کے راستے پر ہے۔

اکرم شہید کے والدین



حاجی سخی محمد



محترمہ عائشہ بی بی

والدین اور بھائی بہن

میجر اکرم کے والد ملک سخی محمد ۱۴۔ پنجاب رجمنٹ میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ۱۹۱۸ء
میں بھرتی ہوئے۔ اور بیس سال نوکری کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں حوالداری سے ریٹائر ہوئے
میجر اکرم کی بڑی خواہش تھی کہ والد کو حج کرائیں۔ ان کی شہادت کے بعد ان کی یہ آرزو بھی
پوری ہوئی۔ ملک سخی محمد حج کی سعادت سے بہرہ مند ہو چکے ہیں۔ ان کو اللہ نے چھ بیٹوں
سے نوازا۔ بڑے عبدالرشید سگنل کور میں صوبیدار ہیں۔ ان سے چھوٹے اکرم شہید تھے۔ تیسرے
بیٹے حفیظ اللہ ملک فوج میں نائب صوبیدار رہے ہیں۔ اب ایک بنک میں افسر ہیں۔ چوتھے

محمد افضل ملک اے۔ ایم۔ ای میں حوالدار کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ سب سے چھوٹے دو بیٹوں کا نام ملک عبدالرزاق اور عبدالقیوم ہے۔ جو سول میں ملازم ہیں ملک سخی محمد کی بیٹی ایک ہی ہے۔ مختار بیگم۔ جو ان کے بھتیجے ملک محمد حنیف سے بیاہی ہوئی ہیں میجر اکرم اپنی ان بڑی بہن سے بہت مانوس تھے۔ اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے تھے۔

میجر اکرم کی والدہ کا نام عائشہ بی بی ہے۔ جو ان پڑھ ہوتے ہوتے بھی بڑی باشعور خاتون ہیں۔ خود بھی مذہبی جذبے سے سرشار ہیں اور بچوں کو بھی بڑے اہتمام سے دین کے رنگ میں رنگا ہے۔ سبحان اللہ۔ یہ ان متقی والدین کی تربیت کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ ان کے دو بیٹے ملک حفیظ اور ملک افضل حافظ قرآن ہیں اور گھر میں دینی فضا ہے۔ اکرم شہید کے دینی شعور کی آبیاری بھی اسی دینی ماحول میں ہوئی تھی۔

اکرم شہید کی زندگی میں جو اخلاص فی الدین تھا۔ جو دیانت رچی بسی تھی۔ جو احسان اور ایثار کا رویہ جاری وساری تھا۔ اس کا سرچشمہ گھر ہی تھا۔ میجر اکرم کا اپنا نام دیکھئے۔ جو بہت ہی کریم ہو۔ وہ اکرم ہوتا ہے۔ باپ سخی محمد، ماں کا نام عائشہ، نانا دین محمد، اور نانی حسن بی بی ناموں کا انتخاب بھی خاندان کے مزاج اور قدروں کی غمازی کرتا ہے۔

اکرم نے دینی اور اخلاقی فضا میں سانس ہی نہیں لی بلکہ بقول ایک مصنف کے اکرم نے اسلام ماں کے دودھ کے ساتھ پیا تھا۔ ایثار اور احسان کی اسلامی قدریں ان کی گھٹی میں پڑی تھیں۔ میجر اکرم جتنے کریم النفس تھے اور جتنے شریف النفس تھے وہ یوں ہی نہیں ہو گئے تھے۔ ان کی اس طرح کسی نے تربیت کی تھی تو ایسے ہوتے تھے۔ صلاحیت تو خداداد ہوتی ہے۔ اس صلاحیت کو کسی نے یہ رُخ دیا تو اکرم کی شخصیت نے یہ رُخ اختیار کیا۔ یہ خدمت بلاشبہ ان کے عظیم والدین اور باشعور استادوں نے انجام دی۔ تلقین ایزدی تو بہرحال ضروری ہوتی ہے۔

بچپن

بچپن کے حالات وواقعات گھر والوں سے زیادہ کون جانتا ہے بچے کے اچھے بُرے کی پہچان بھی والدین سے زیادہ کسے ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے سب سے پہلے اکرم کی والدہ عائشہ بی بی سے درخواست کی کہ وہ اکرم کے بچپن کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں ان سے یہ گفتگو ہوئی۔

اکرم شہید کی والدہ عائشہ بی بی کا انٹرویو

سوال:۔ پہلے آپ کچھ اپنے اور بچوں کے بارے میں فرمائیں۔

جواب:۔ میرا میکہ ڈنگا ضلع گجرات میں ہے۔ اولاد میں، سب سے بڑی مختار ہے۔ یہ جو سامنے بیٹھی ہے۔ پھر میرے چھ بیٹوں میں سے اکرم منجھلا بیٹا تھا۔ بڑا بیٹا رشید ہے۔ وہ بھی آپ کے ملٹری کالج میں پڑھا ہے اور اب صوبیدار ہے۔

سوال:۔ اکرم شہید پیدا کہاں ہوتے تھے؟

جواب:۔ میرے میکے ڈنگے گجرات میں۔

سوال:۔ وہاں آپ کے ساتھ اکرم کتنے عرصے رہے؟

جواب:۔ چند مہینے یا شاید اس سے بھی کم کچھ ٹھیک یاد نہیں رہا۔

سوال:۔ اکرم بچپن میں کیسے تھے؟

جواب:۔ جب چھوٹا تھا تو پلنگڑی میں لیٹا اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے چپ چاپ لیٹا انگوٹھا چوستا رہتا۔ جب ذرا بڑا ہوا اور دوڑنے بھاگنے لگا تو بھی ضد کرنے اور رونے دھونے کی عادت نہیں تھی۔

سوال:۔ بچپن میں کھانے پینے کی کس چیز کا شوق زیادہ تھا؟

جواب:۔ دودھ بڑے شوق سے پیتا تھا۔ بلکہ دودھ پینے کا اسے ہوکا تھا۔ گھر کا دودھ تھا۔ میں رات کو سب بچوں کو گلاس گلاس بھر دودھ دیتی تھی جب اکرم کی باری آتی تو اس کی کوشش ہوتی کہ اس کا گلاس لبالب بھر جائے ایک بار تو ضد کرنے لگا کہ گڑوی میں جتنا دودھ ہے۔ وہ میرے گلاس میں انڈیل دو۔ بڑی مشکل سے سمجھایا۔

سوال:۔ پڑھنے کی بسم اللہ کب ہوئی؟

جواب:۔ کوئی چار یا پانچ برس کا ہوگا کہ اسے پڑھنے بٹھایا۔ نکے میں ایک اسکول تھا چار جماعتوں تک کا سب سے پہلے اس میں جانا شروع کیا۔ اس سکول کے دو ماسٹر کرم الٰہی اور غلام نبی اکرم پر بہت مہربان تھے۔

سوال:۔ پرائمری اسکول کے زمانے کی کوئی خاص بات؟

جواب:۔ ساتھیوں کو سیاہی قلم دیتا رہتا تھا۔ بعض بچے اس کے ساتھ آکر پڑھتے بھی تھے۔ سکول کی آدھی چھٹی میں بعض ساتھیوں کو اپنے ساتھ کھلاتا پلاتا بھی تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ اپنا کام ختم کرکے کام کاج میں مدد بھی دیا کرتا تھا۔

سوال:۔ کس قسم کی مدد؟

جواب:۔ گھر کے مال مویشی کی دیکھ بھال۔ کنوئیں پر سبزی کی کڑی نگرانی کرنا۔ گھر کے لئے پانی بھر کے لانا۔ ایسے چھوٹے موٹے کام، اس معاملے میں اس کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ اگر کوئی بڑا کام کرنے جارہا ہے جیسے چارہ ڈالنا پانی لانا تو وہ آگے بڑھ کر یا وہ کام خود کرتا یا پھر بڑے بھائی کو کام کرنے میں مدد دیتا۔

بھائی کی باتیں۔

اکرم کے بچپن کے حالات کے سلسلے میں اکرم کے چھوٹے بھائی افضل ملک سے ہماری یہ باتیں ہوئیں۔

سوال:۔ افضل، آپ اکرم شہید سے کتنے چھوٹے ہیں؟

جواب:۔ کوئی آٹھ سال۔

سوال:۔ عمر کا یہ فرق تو بہت زیادہ نہیں آپ کو اپنے عظیم بھائی کی بہت سی باتیں یاد ہونگی؟

جواب:۔ جی ہاں۔ ہیں، ان کی شہادت کے بعد سے تو وہ نقوش اور بھی گہرے ہو گئے ہیں۔

سوال:۔ مثلاً کوئی ایسا واقعہ سنائیے جس سے اکرم کی شخصیت کے کسی نمایاں پہلو پر روشنی پڑتی ہو؟

جواب:۔ میرے ذہن میں بھائی اکرم سے متعلق جو سب سے پرانی یاد ہے۔ وہ مار پیٹ کے ایک واقعہ سے متعلق ہے۔

سوال:۔ وہ کیا؟

جواب:۔ یہ واقعہ میرے بالکل بچپن کا ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ ماں جی باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ بھائی جان اکرم اور میں اندر کمرہ میں ایک چارپائی پر بیٹھے کچھ گپ شپ کر رہے تھے کہ بھائی جان کے دل میں کیا آیا کہ انہوں نے پیار سے میرے گال پر ایک ہلکا سا طمانچہ لگا دیا۔ غالباً مذاقاً۔ لیکن میں چھوٹا تھا۔ میں سمجھا انہوں نے مجھے قصداً مارا ہے میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ایک گھونسہ اپنی پوری قوت سے بھائی کے پیٹ میں دے مارا وہ اس ناگہانی حملہ کے لئے تیار نہ تھے۔ پیٹ پکڑ کر رہ گئے درد کی شدت سے ان کے آنسو نکل پڑے۔ بھائی جان چاہتے تو جواباً میری کافی مرمت کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے میرے اوپر پھر بھی ہاتھ نہ اٹھایا۔ ماں جی جب ناشتہ لے کر اندر آئیں اور انہیں بے حال دیکھا تو پوچھا کیوں کیا بات ہے۔ کیا لڑے جھگڑے ہو تو بھائی جان نے صرف اتنا کہا۔ نہیں بے جی مذاق کر رہے تھے۔

شریف النفسی بلکہ کریم النفسی معاف اور درگزر کر دینا بھائی اکرم کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اس طرح کے ایک نہیں بہت سے واقعات ہیں۔

سوال:۔ مثلاً ۔

جواب:۔ مثلاً ایک واقعہ ان کے ملٹری کالج میں زمانہ تعلیم کا ہے۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے اور ہم دونوں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ بھائی جان اپنے ہم عمروں میں تھے اور میں اپنے دوستوں میں کھیل رہا تھا۔ کھیل کھیل میں میرا اپنے ساتھی سے کچھ جھگڑا ہو گیا وہ مجھ سے ذرا بڑا تھا۔ اس نے مجھے مارنے کو لیا۔ میں نے چیخ کر بھائی اکرم کو آواز دی۔ وہ بھاگ کر میری طرف آئے میں نے شکایت کی کہ یہ لڑکا مجھے مارتا ہے۔ اس کا نام صابر تھا۔ ایسے موقعوں پر عموماً بھائی رشتہ دار بے قابو ہو جاتے ہیں۔ لیکن بھائی اکرم نے اس لڑکے سے صرف اتنا کہا۔ صابر! یہ تم سے چھوٹا ہے۔ چھوٹوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

اکرم کے تایا زاد بھائی ملک محمد مشتاق کو اکرم کا ہمزاد کہا جاتا ہے۔ چونکہ دونوں کم و بیش ایک ہی دن پیدا ہوئے دونوں نے ایک گھر میں پرورش پائی۔ ایک ساتھ اسکول گئے۔ اور ایک ساتھ کھیلے۔ دونوں نے ایک ساتھ ۱۹۴۸ء میں ملٹری کالج کا امتحان دیا۔ ملک مشتاق تو کسی وجہ سے کالج میں داخل نہ ہو سکے۔ اکرم ہو گئے۔ اس نقطہ تک دونوں ہمدم و ہمقدم رہے اس کے بعد دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔ اس حد درجہ قریبی تعلق کی بنا پر اکرم کے بچپن اور تعلیم و تربیت پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے ہم نے ملک مشتاق کو لکھا۔ کہ بھائی آپ آ کر ذرا اکرم کے بچپن کے بارے میں تو کچھ بتائیں۔ جب وہ اور ملک افضل کالج آئے تو اکرم کے پرانے ہاؤس کے صحن میں بیٹھ کر یہ باتیں ہوئیں۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو میرے ذہن میں یہ بار بار خیال آیا کہ اب سے کم و بیش تیس سال پہلے یہاں اسی جگہ اکرم دوڑتے پھرتے، ہنستے بولتے اور نمازیں پڑھتے نظر آتے تھے۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ سانولے رنگ کا یہ دبلا پتلا کم گو اور کم آمیز لڑکا کبھی نشان حیدر ہو گا۔ اور سارا کالج اس پر فخر کرے گا۔

محمد مشتاق ملک کا انٹرویو

سوال:۔ بقول آپ کے، آپ کی اور اکرم کی تاریخ پیدائش ایک ہی ہے، یہ آپ کو کیسے پتہ چلا؟

جواب:۔ اجی جی (والد صوبیدار میجر گودڑ خان) نے کہا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں جس دن میں پیدا ہوا تھا اسی روز شام کو ڈنگے سے آدمی آیا کہ چچا کے یہاں بھی لڑکا ہوا ہے۔ دونوں بھائیوں کے یہاں ایک ہی دن بیٹوں کی پیدائش سے سب خاندان والوں کو بے حد خوشی ہوئی تھی۔

سوال:۔ آپ دونوں نے ایک ساتھ ہی پرورش پائی۔ اس بچپن کے زمانے میں آپ دونوں کھیل کون سے کھیلتے تھے؟

جواب:۔ گاؤں کا مقبول کھیل کبڈی تھا۔ ہم بھی وہی کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی کھدو بھی کھیلتے تھے۔

سوال:۔ یہ کھدو کیا ہوتا ہے؟

جواب:۔ یہ کھدو دائرہ میں کھیلا جاتا ہے گیند سے۔

سوال:۔ کچھ ابتدائی پڑھائی کے بارے میں بتائیے؟

جواب:۔ نکا کلاں میں ایک ڈی، بی پرائمری اسکول تھا۔ چوتھی جماعت تک ہم دونوں نے ۱۹۴۲ء میں اسی سکول سے پڑھائی شروع کی۔ پہلی جماعت میں ہمارے استاد اسکول کے ہیڈ ماسٹر کرم الٰہی تھے۔ دوسری اور تیسری جماعت میں ہمیں ماسٹر غلام نبی صاحب نے پڑھایا خدا کے فضل سے ابھی یہ دونوں بزرگ حیات ہیں۔ چوتھی میں ہمارے استاد کے ہیڈ ماسٹر فرمان علی تھے۔

سوال:۔ اپنے ان تین ابتدائی استادوں میں سے اکرم کس سے زیادہ مانوس تھے؟

جواب:۔ چونکہ بھائی اکرم محنتی تھے، شوق سے پڑھتے تھے اور استادوں کا ادب کرتے تھے اس لئے یہ تینوں ہی ان سے خوش تھے۔ لیکن اگر تینوں میں سے کسی ایک کو چنا جائے

تو کہنا پڑے گا۔ وہ ماسٹر کرم الٰہی سے زیادہ مانوس تھے۔

سوال: وہ کیوں؟

جواب:۔ غالباً اس لئے وہ پہلے استاد تھے۔ جن سے پہلی میں ان کا واسطہ پڑا۔ پھر کچھ طبیعت کی بات بھی ہوتی ہے۔ کرم الٰہی ان پر خاص طور پر مہربان تھے۔ اکرم بھی ان کو کبھی نہیں بھولے۔

سوال:۔ اس کی کوئی مثال؟

جواب:۔ مثال یہ کہ، جب تک اکرم گاؤں میں رہے تو ان سے ملتے ہی رہے۔ نکّا کے قریب چکری مڈل اسکول سے پاس کر کے جب وہ ملٹری کالج میں داخل ہوئے تو جب بھی چھٹی آتے ماسٹر کرم الٰہی سے ضرور ملتے۔ ماسٹر جی خلاص پور میں رہتے ہیں۔ جو ہمارے گاؤں سے ایک آدھ میل پہلے آتا ہے۔ باہر سے بس یہیں آکر رکتی ہے۔ ماسٹر صاحب کا گھر راستے ہی میں پڑتا ہے۔ بس سے اتر کر وہ پہلا کام یہ کرتے کہ ماسٹر جی سے ملتے اگر وہ اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھے ہوئے نہ ملتے تو دوسرے تیسرے دن آکر ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ یہ عادت ان کی زندگی بھر رہی۔ خود ماسٹر جی بھی ان سے ملنے نکّے آجاتے تھے۔ پھر وہ ان کو خلاص پور تک چھوڑنے ان کے ساتھ جاتے۔ اکرم جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے سب ہی استادوں کا بہت ادب کرتے تھے۔ لیکن ماسٹر کرم الٰہی کے وہ احسان مند تھے۔ اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔

سوال:۔ نکّے کے پرائمری اسکول کے زمانے کا کوئی قابل ذکر واقعہ آپ کے ذہن میں ہے؟

جواب:۔ اس زمانے کا سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ وہ فیس کا قصہ ہے جو شاید آپ نے پہلے بھی سنا ہو۔

سوال:۔ ہاں اس واقعہ کو کئی لوگوں نے بیان کیا ہے۔ آپ تو اسکے عینی شاہد ہیں۔ ذرا تفصیل سے بیان کیجئے؟

جواب:۔ اصل میں یہ واقعہ نکّے کا نہیں مڈل اسکول چکری کا ہے۔ نکّے کا پرائمری اسکول

چوتھے درجے تک تھا۔ پانچویں جماعت کے لئے ہم ننکے سے چھ میل کے فاصلے
پر واقع مڈل سکول چکری میں پڑھنے جاتے تھے۔ فروری یا مارچ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔
سوال:۔ مہینہ بھی یاد ہے آپ کو؟
جواب:۔ وہ اس لئے کہ ابھی سالانہ امتحانات نہیں ہوئے تھے۔ اور کلاس میں چند لڑکے ہندو
بھی تھے۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ یہ ۱۹۴۷ء کے ابتدائی مہینوں کی بات ہوگی۔
سوال:۔ پنجم کی کون سی سیکشن تھی؟
جواب:۔ پنجم اے کی کلاس تھی۔ اکرم استاد صاحب کی میز کے سامنے کی پہلی قطار میں دائیں
طرف بیٹھتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی میں بیٹھتا تھا۔ ہوا یوں کہ ہمارے کلاس ٹیچر ماسٹر صاحب دین
نے جو سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے۔ پہلی تاریخ کو کلاس سے فیس جمع کی اور رومال میں
باندھ کر میز پر رکھ دی اور پڑھانے لگے۔ کچھ دیر کے بعد تفریح کے وقفے کی گھنٹی بجی تو وہ
اٹھ کر باہر چلے گئے۔ رومال کو اٹھانا انہیں یاد ہی نہیں رہا۔ میں نے بھائی اکرم کو باہر چلنے
کو کہا وہ نہیں گئے تو میں اکیلا ہی باہر چلا گیا۔ وقفے کے بعد جب ماسٹر جی کلاس میں واپس
آئے تو بہت پریشان تھے۔ اکرم اپنی جگہ سے اٹھے اور رومال ان کے سامنے رکھ دیا
رومال کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے اور پوچھا یہ تمہیں کہاں سے ملا۔ بھائی اکرم نے
کہا۔ جناب وقفہ ہوا تو آپ رومال میز پر چھوڑ گئے تھے۔ میں اس کو لے کر بیٹھا رہا۔ یہ سن
کر ماسٹر صاحب دین بہت خوش ہوتے۔ بھائی اکرم کی سوجھ بوجھ اور دیانت داری کی
بہت تعریف کی۔ اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انہیں پانچ روپے انعام کے طور پر بھی
دیتے تھے۔ جو بھائی اکرم نے یہ کہکر واپس کر دیئے۔ "جناب آپ کی بڑی مہربانی! آپ کی
خوشی ہی میرے لئے سب سے بڑا انعام ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نے کوئی خاص کارنامہ
انجام نہیں دیا۔ اس کے سوا میں کرتا بھی کیا۔" اس واقعہ کے بعد جب بھی ماسٹر صاحب دین
فیس جمع کرتے بھائی اکرم کو اپنے ساتھ بٹھاتے۔ پیسوں کا حساب کتاب وہی کرتے

چونکہ ماسٹر جی کی نظر کمزور تھی اس لئے اکرم کھرے کھوٹے سکوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔

سوال:۔ اکرم نے قرآن کب اور کس سے پڑھا؟

جواب:۔ ہم لوگ خاندانی نمازی ہیں لڑکا سات برس کا ہو جائے تو سب گھر والوں کے ساتھ باجماعت مسجد میں نماز پڑھنے جاتا ہے۔ یہ خاندانی روایت ہے ہم دونوں نے سات برس کی عمر سے صبح کی نماز بھی گاؤں کی مسجد میں باجماعت پڑھنا شروع کر دی تھی۔ گاؤں کی اس جامع مسجد کو بنانے میں بھی ہمارے خاندان نے بڑا حصہ لیا تھا۔ اس کی تعمیر پہ زیادہ روپیہ ہمارے والد ہی نے لگایا تھا۔ اس کی دیکھ بھال بھی ہمارے خاندان کے ذمے تھی۔ میرے بچپن میں جو مولوی صاحب مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا نام مولوی محمد اصغر تھا وہ کاغان کے علاقے کے رہنے والے تھے۔ مولوی اصغر نماز کے بعد درس بھی دیا کرتے تھے۔

سوال:۔ درس کا موضوع کیا ہوتا تھا؟

جواب:۔ ترجمہ قرآن مجید، حدیث شریف اور دوسرے مسئلے مسائل، مولوی اصغر کا لڑکا قاری تھا۔ اور بچوں کو قرآن شریف پڑھاتا تھا۔ ہم دونوں نے قرآن شریف مولوی اصغر کے لڑکے ہی سے پڑھا۔

سوال:۔ کتنا؟

جواب:۔ چند سیپارے پڑھے ہوں گے وہ دونوں باپ بیٹے کسی وجہ سے گاؤں کی مسجد چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک اور صاحب آئے ان سے بھی ایک آدھ سیپارہ ہی پڑھا ہوگا۔ مکمل قرآن ان سے بھی نہیں پڑھا۔

سوال:۔ اکرم نے کبھی قرأت بھی کی؟ یا نعت وغیرہ پڑھی؟

جواب:۔ نہیں۔ اسکول کی بزم ادب کا اجلاس ہر جمعہ کو ہوتا تھا۔ اس میں اکرم کبھی کبھی سورتیں سناتے تھے یاد پڑتا ہے انہوں نے ایک آدھ بار کوئی مضمون بھی سنایا لیکن نعت کبھی

گا کر نہیں سنائی۔ اکرم آواز اچھی نہیں تھی۔ تقریر کا بھی کوئی خاص شوق نہیں تھا۔

اکرم کے بچپن اور لڑکپن کی تصویر مکمل کرنے کے لیئے ہم نے اکرم کے پرائمری اسکول کے دو استادوں کو زحمت دی۔ ان بزرگوں نے یہ کمال مہربانی انٹرویو کے لئے کچھ وقت بھی دیا۔ ان حضرات کی گفتگو سنیئے۔

ماسٹر کرم الٰہی صاحب کا انٹرویو

سوال:۔ ماسٹر صاحب، اس وقت آپ کی عمر کیا ہوگی؟

جواب:۔ ساٹھ سے دو چار سال اوپر ہی ہوں گا۔

سوال:۔ ماسٹر صاحب، میجر اکرم شہید کو آپ نے کس کلاس میں پڑھایا ہے؟

جواب:۔ اکرم شہید کو میں نے نکے کے پرائمری اسکول میں پہلی اور دوسری جماعت میں پڑھایا ہے۔ یہ ۴۳-۱۹۴۴ء کی بات ہے۔

سوال:۔ بہت وقت گزر چکا ہے۔ پھر بھی اس زمانے کی کوئی بات آپ کو یاد ہے؟

جواب:۔ اتنی چھوٹی عمر میں پہلی دوسری جماعت میں بچے کا کیا پتہ چلتا ہے۔ پھر بھی جو دھندلا سا نقش میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ وہ دبلا پتلا لڑکا بہت محنتی تھا۔ اور شوق سے پڑھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ استاد کو محنتی اور شوق سے پڑھنے والے بچے اچھے لگتے ہیں شاید اسی وجہ سے میری توجہ اس پر زیادہ تھی اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اس بچے نے بھی شاگردی کا حق ادا کر دیا۔ خدا ایسے شاگرد سب کو دے۔

سوال:۔ یہ حق کس طرح ادا کیا؟

جواب:۔ یہی کہ خوب پڑھا لکھا ترقی کی اور علم کو صحیح مقاصد کے لیئے استعمال کیا۔ شرافت سے اور عزت سے زندگی بسر کی۔ اور آخر میں شہادت قبول کی۔ وہ کام کر گیا۔ جس سے ملک کا وقار بلند ہوا۔ ہم سب کا نام ہوا۔ آپ مجھ سے انٹرویو کر رہے ہیں۔ کیوں

اس لئے کہ میرا بھی کچھ اس سے تعلق تھا۔ اسکی تعلیم و تربیت میں تھوڑا سا میرا بھی حصہ تھا۔

سوال:۔ آپ نے تو خیر اکرم کو ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء میں پڑھایا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ آپ سے ملتے رہے؟

جواب:۔ اس سے زیادہ سعادت مند شاگرد میں نے نہیں دیکھا۔ میرا گاؤں خلاص پور نکے سے چند فرلانگ ادھر ہے۔ راستہ میں پڑتا ہے۔ وہ آتے جاتے ہمیشہ مجھ سے ملتا تھا بلکہ اس کے لحاظ سے یوں کہنا چاہیئے کہ میری خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ اکرم سپاہی سے افسر ہوا۔ میجر ہوا لیکن اس کے احترام میں فرق نہیں آیا۔ بلکہ عاجزی اور خاکساری بڑھتی گئی۔

سوال:۔ اس خاکساری کا کوئی واقعہ آپ کے ذہن میں ہے؟

جواب:۔ خلاص پور میں لاری سے اتر کر وہ پہلے مجھ سے ملتا تھا۔ پھر آگے اپنے گھر جاتا تھا۔ اور جب کبھی میں اس سے ملنے نکے گیا تو وہ مجھے چھوڑنے خلاص پور آتا تھا۔ جب میجر ہو کر گھر آیا تو میں نے میجر کہہ کر اس کو مبارکباد دی۔ وہ بہت شرمندہ ہوا۔ ماسٹر جی میں وہی اکرم ہوں جس کو آپ نے پہلی میں پڑھایا تھا۔ اسی بنیاد پر میں میجر بنا ہوں۔ آپ مجھے میجر نہ کہا کریں۔ میں بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔ عہدہ یونٹ میں ہوتا ہے۔ باہر نہیں اس کی یہ بات میرے دل میں نقش ہے۔ اب ایسے شاگرد کہاں۔

غلام نبی صاحب کا انٹرویو

سوال:۔ ماسٹر صاحب، آپ خاصے بزرگ نظر آتے ہیں اب کیا عمر ہوگی آپ کی؟

جواب:۔ انہتر یا ستر سال۔

سوال:۔ اکرم شہید کو آپ نے کب پڑھایا تھا؟

جواب:۔ تیسری اور چوتھی جماعت میں ۴۶-۱۹۴۵ء میں دو سال۔

ڈی۔بی پرائمری اسکول نکا کلاں ہیں اس زمانے میں چار جماعتیں تھیں۔ ۱۹۴۶ء
ہیں اکرم نے میری کلاس سے چوتھا درجہ پاس کیا تھا۔

سوال:۔ اس زمانے کا کوئی تاثر؟

جواب:۔ چپ چاپ قسم کا محنتی لڑکا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ وقت پر آتا تھا۔
کبھی غیر حاضر نہیں ہوا۔ عام بچوں کی طرح لڑائی جھگڑا نہیں کرتا تھا۔ اسکول سے
فارغ ہوکر پانچویں کے لئے اکرم چکری چلا گیا تھا۔ لیکن ہمارے اسکول میں آتا رہتا
تھا۔ کے۔جی کے زمانے میں بھی جب کبھی چھٹی آتا تو اپنے پرانے استادوں سے ضرور ملتا۔

سوال:۔ اکرم کے بچپن کی کوئی قابل ذکر بات؟

جواب: وہ فیس والا قصہ تو آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں کوئی خاص
بات نہیں۔ البتہ اس کے پی۔ایم۔اے کے زمانے کی دو ایک باتیں ضرور یاد ہیں۔

سوال:۔ مثلاً؟

جواب:۔ غالباً ۱۹۶۲-۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ پی۔ایم۔اے سے چھٹی آیا ہوا تھا۔ مجھ سے بھی ملا۔
باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ خود میٹرک کیا ہوا ہے۔ لیکن اپنے کورس میں بی۔اے پاسوں
کا لیڈر رہوں۔ یہ سب آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔

اسی طرح ۱۹۶۹ء میں جب اس کے ایسٹ پاکستان کا ہوا تو کہنے لگا۔ ماسٹر جی دعا
کریں اللہ عزت رکھ لے۔ اور پاکستان کے کسی کام آؤں۔ میں نے کہا کون سی ایسی بات
ہے۔ بولے مشرقی پاکستان میں اسمگلنگ روکنے کے لئے دیانت دار اور کارگزار افسروں
کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے نام مانگے گئے تھے۔ میرے کمانڈنگ افسر نے کہا میں
ایک دیانت دار اور کارگزار افسر دے سکتا ہوں۔ چنانچہ میرا نام منظور کر لیا گیا۔ آپ دعا
کریں کہ میں اس اعتماد پر پورا اتروں اور پاکستان کی کچھ خدمت کر سکوں۔

ایک اور بات بھی مجھے یاد آ رہی ہے گو چھوٹی سی ہے۔

سوال :۔ وہ کیا؟

جواب :۔ ۱۹۶۳ء میں جب وہ پی۔ ایم۔ اے سے کمیشن لے کر گاؤں آیا تو بتایا مجھے فرنٹیر فورس گروپ میں کمیشن ملا ہے۔ میری یونٹ لنڈی کوتل میں ہے۔ وہیں جا رہا ہوں۔ مجھے تعجب ہوا۔ میں نے کہا آپ کے والد، تایا اور بزرگوں کا تعلق پنجاب گروپ سے رہا ہے۔ کمیشن کے لئے منتخب بھی اپ اسی رجمنٹ سے ہوئے تھے۔ ایف ایف آر میں جانے کی کوئی خاص وجہ؟

کہنے لگے میرے کمانڈانٹ نے کہا اکرم! تم میری رجمنٹ فرنٹیئر فورس میں جانا۔ ان کی اس خواہش کو میں نے اپنی عزت افزائی سمجھا اور ایف ایف آر میں جانے کے ارادے کا اظہار کر دیا۔

ویسے گروپ کوئی ہو کام تو پاکستان ہی کے آنا ہے۔

بچپن میں کریم النفسی کی ایک مثال

اکرم پر اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں کالج کے ایک اولڈ بوائے لیفٹننٹ کرنل خالد شبیر (۲۳۴۴) سے باتیں ہو رہی تھیں کہ خالد نے کہا۔ سر! ہماری بٹالین ۲۷ میڈیم کے میس کا ایک پرانا خدمت گار نکّا کلاں کا ہے۔ وہ اکرم کا پڑوسی رہا ہے۔ اور ان کے پورے خاندان سے اچھی طرح واقف ہے۔ اکثر وہ اکرم کے بچپن کے واقعات سناتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اسے یہاں بھیجوں۔ ہم نے کہا۔ کنواں پیاسے کے پاس کیوں آئے۔ ہم خود وقت نکالیں گے۔ چنانچہ ۲۷ میڈیم کے میس ویٹر حوالدار ریٹائرڈ تاج خان سے میجر اکرم کے بچپن کے بارے میں یہ باتیں ہوئیں۔

سوال :۔ تاج خان صاحب، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کا تعلق میجر اکرم شہید نشان حیدر کے گاؤں نکّا کلاں سے ہے۔ اور آپ ان کے خاندان کو اور ان کو ایک عرصے سے جانتے

ہیں؟

جواب:۔ جی ہاں۔ میجر صاحب کے والد حاجی سخی محمد اور تایا صوبیدار میجر گودڑ خان صاحب کو میں خوب جانتا ہوں۔ وہ میرے ہم قوم اعوان ہیں اور گاؤں میں میرے پڑوسی ہیں۔

سوال:۔ اس سے پہلے کہ ہم آپ سے اکرم شہید اور ان کے خاندان کے بارے میں کچھ پوچھیں آپ اپنا تعارف تو کرائیں؟

جواب:۔ جناب میرا نام جیسا کہ آپ کو معلوم ہے تاج خان ہے۔ ان دنوں ۷۲ میڈیم میں ویٹر ہوں اس سے پہلے فوج میں نوکری کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں مڈل ایسٹ میں تھا۔ ہمارے ڈویژن نمبر چار کے جی ون لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب خان تھے جو بعد کو پاکستان کے کمانڈر انچیف صدر اور فیلڈ مارشل بنے۔

سوال:۔ بہت خوب، تو آپ نے بڑوں بڑوں کے ساتھ نوکری کی ہے۔

جواب:۔ جی جناب۔

سوال:۔ فوج کب چھوڑی آپ نے؟

جواب:۔ میں لانس حوالدار کی حیثیت سے ۱۹۵۳ء میں پنشن آیا۔

سوال:۔ تاج خان صاحب اب آپ اکرم شہید کے خاندان کے بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب:۔ اکرم شہید کے والد سخی محمد اور تایا گودڑ خان سابقہ فوجی ہیں۔ یہ سارا گھرانہ پشت ہا پشت سے فوجی ہے۔ اور بڑے بھلے لوگ ہیں۔ گاؤں میں مشہور ہے کہ سخی محمد کے گھرانے کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ برسہا برس سے سخی محمد گاؤں کی مسجد میں تہجد پڑھتے آتے ہیں۔

سوال:۔ اب اکرم کی طرف آئیے۔ آپ نے اکرم کو پہلے پہل کب دیکھا؟

جواب:۔ میجر اکرم ڈنگے میں پیدا ہوتے تھے۔ بچپن انہوں نے نکّے میں گزارا۔ اس لئے بچپن سے میں انہیں دیکھتا آیا ہوں۔ البتہ نکّا کے پرائمری اسکول کے زمانے کا ایک واقعہ مجھے خاص طور سے یاد ہے۔

سوال :۔ وہ کیا؟

جواب :۔ نکا اسکول کے ماسٹر منشی فرمان علی، اللہ بخشے بڑے اچھے آدمی تھے۔ میں ان سے ملنے کبھی ان کے سکول جایا کرتا تھا۔ ایک روز کہنے لگے حوالدار سخی محمد کا بیٹا اکرم بھی سخی ہے۔ اور سچا اعوان ہے میں نے پوچھا وہ کیسے؟ تو کہنے لگے اسکول میں بچوں کو پانی کی بڑی تکلیف تھی۔ آپ جانتے ہیں گاؤں کا کنواں اسکول سے کتنی دور ہے۔ اسلئے میں نے پانی کے مٹکوں میں پانی بھرنے کے لئے ایک ماچھی عورت نوکر رکھی ہوئی ہے لیکن میں نے دیکھا کہ اسکول لگنے سے پہلے ہی کوئی مٹکوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ مجھے ٹوہ ہوئی کہ وہ اللہ کا نیک بندہ کون ہے؟ تو پتہ چلا کہ سخی محمد کا پتر محمد اکرم صبح سویرے اتنی دور سے پانی لاکر مٹکوں کو بھرتا ہے۔ میں نے اس سے کہا بھی ہے کہ تو نہ بھرا کر لیکن وہ مانتا ہی نہیں چوری چھپے پانی بھر جاتا ہے۔ منشی فرمان سے یہ بات سن کر میں نے کہا۔ ماسٹر جی ذرا بلاؤ سخی محمد کے پتر کو۔ دیکھیں کیا کہتا ہے۔ چنانچہ اکرم کو بلایا گیا۔ فرمان علی نے کہا۔ اکرم! تو خود چھوٹا ہے۔ کیوں بے آرام ہوتا ہے۔ ہم نے ماچھی رکھی ہوئی ہے دو روپے اسے دیتے ہیں اور یہ کام اس کا ہے، یہ سن کر اکرم۔ نے جواب دیا۔ ماسٹر جی پانی بھرنے سے مجھے منع نہ کریں۔ یہ ثواب کا کام ہے تو جناب یہ واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اور یہ میرے سامنے کی بات ہے۔

سوال۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، یہ آپ نے بڑی دلچسپ اور معنی خیز بات بتائی۔ شکریہ!

کالج میں داخلہ کا مرحلہ

چونکہ میجر محمد اکرم کے داخلے کی ساری کارروائی ان کے تایا میجر گودڑ خان نے کی تھی اس لئے ہم اس لئے ہم ان سے اس کی تفصیلات پوچھیں۔

سوال :۔ اکرم کے ملٹری کالج میں داخلہ آپ کے ہاتھوں ہوا تھا۔ آپ کو کچھ یاد ہوگا داخلہ سے پہلے وہ کن کن مرحلوں سے گزرے ؟

جواب :۔ میرا اپنا بیٹا مشتاق اور بھتیجا اکرم دونوں ہم عمر تھے اور ایک ساتھ پڑھتے تھے دونوں نے چکری کے مڈل اسکول سے چھٹی پاس کی تو میں نے ان دونوں کے داخلے کے لئے اپنی رجمنٹ کے سنٹر ۱۴ پنجاب میں درخواست دی۔ سب سے پہلے میں دونوں بچوں کو ڈاکٹری کے لئے جہلم کے فوجی بھرتی کے دفتر لے گیا۔

سوال :۔ اس زمانے میں جہلم ریکروٹنگ آفس میں کون کون افسر تھے ؟

جواب :۔ ریکروٹنگ افسر کیپٹن رب نواز تو اس روز حاضر نہیں تھے۔ خان بہادر کیپٹن محمد اکرم ان کی جگہ کام کر رہے تھے۔ میڈیکل افسر میانوالی کے میجر ڈاکٹر فضل محمد تھے۔ ان ہی نے دونوں بچوں کی ڈاکٹری کی۔

سوال :۔ اور کیا نتیجہ رہا ؟

جواب :۔ مشتاق تو ذرا تگڑا تھا وہ فوراً فٹ ہو گیا۔ اکرم کے بارے میں ڈاکٹر فضل محمد کہنے لگے صوبیدار میجر صاحب یہ بچہ ذرا کمزور ہے۔ وزن کم ہے۔ اس لئے اس کو فٹ کیسے کروں۔ میں اپنے علاقے کا اسسٹنٹ ریکروٹنگ افسر بھی تھا۔ اس وجہ سے بھرتی کے افسروں سے تعلقات تھے میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ اس بچہ کو کے۔ جی کالج میں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ دوسرے اس کا باپ حوالدار پنشن آیا ہے۔ اس کے لئے بچے کو باہر پڑھانا مشکل ہوگا۔ میں صوبیدار میجر کی پنشن آیا ہوں میں اپنے بچے کو باہر پڑھا لوں گا۔ اسلئے بیشک میرے بچے کو رہنے دیں اس کو ضرور فٹ کر دیں۔ تھوڑے سے وزن کی کمی کا کیا ہے۔ کھائے پئے گا وزن پورا کر لے گا۔ ڈاکٹر فضل محمد نے جو میری یہ بات سنی تو کہا اگر یہ بات ہے تو دونوں کو فٹ کئے دیتا ہوں۔ اس طرح دونوں فٹ ہو گئے۔ پھر دونوں کا ۱۴ پنجاب کے سنٹر جہلم ہی میں امتحان ہوا۔

سوال:۔ کن مضامین کا؟

جواب:۔ اردو، حساب، انگریزی جنرل نالج کا۔

سوال:۔ پھر؟

جواب:۔ اس تحریری امتحان میں مشتاق رہ گیا۔ لیکن اکرم پاس ہوگیا۔ اس کے بعد میں اکرم کو انٹرویو کے لئے کے جی کالج لے گیا۔

سوال:۔ انٹرویو کس نے لیا تھا؟

جواب:۔ افسروں کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔ انٹرویو کالج ہی میں لیا گیا تھا۔ انٹرویو ٹیم۔ جی ایچ۔ کیو کی طرف سے نامزد ہوتی تھی۔ ۱۹۳۴ء-۳-۵ دو سال میں بھی اپنے بریگیڈ کی طرف سے صوبیدار میجر کی حیثیت سے انتخابی بورڈ کا ممبر رہا تھا۔ اس لئے انٹرویو کی تھوڑی بہت تیاری میں نے کرادی تھی۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد اکرم کالج میں داخل ہوگیا اور میں اس کو اس کے ہاؤس چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ چونکہ اکرم کا بڑا بھائی رشید پہلے سے کے۔ جی میں پڑھتا تھا اس لئے ہمیں اکرم کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔

سوال:۔ کچھ یاد ہے آپ کو اکرم کس ہاؤس میں گئے تھے۔

جواب:۔ نئے لڑکوں کے لئے جو ہاؤس تھا کالج کے صدر دروازے کے پاس، اکرم اس میں بھیجا گیا تھا۔ غالباً اس ہوسٹل کا نام رابرٹس ہاؤس تھا۔ سامنے اونچی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ دروازے پر تالہ لگتا تھا۔ ایک عرصے کے بعد پچھلے سال اپنے نواسے کے داخلے کے سلسلے میں پھر کالج جانا پڑا تو وہ دیوار نظر نہیں آئی۔ ہاؤس کا نام بھی بدلا ہوا تھا۔ اب وہاں شیر شاہ ہاؤس لکھا تھا۔

اکرم ملٹری کالج میں

اکرم اگست ۱۹۴۸ء کی ۲۶ تاریخ کو کالج میں داخل ہوئے۔ اور ۱۸۱۱ کالج نمبر ملا۔ انکا

پہلا ہاؤس جو اس وقت کا بے بی ہاؤس، رابرٹس ہاؤس تھا۔ جو اب شیر شاہ ہاؤس کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں کالج کے کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل فیاض حسین زیدی تھے۔ اور چیف انسٹرکٹر کیپٹن (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) وزیر خان ملک تھے۔ ٹریننگ افسر کے طور کالج کے ایک اولڈ بوائے کیپٹن عبدالمتین (۶۴۴) کام کر رہے تھے۔ ان دنوں رابرٹس ہاؤس کے ہاؤس آفیسر کیپٹن عبدالحمید ابراہیم تھے۔ جو بعد کو میجر ہو کر کئی سال کالج کے چیف انسٹرکٹر بھی رہے۔ اور آرمی ایجوکیشن کور سے لیفٹننٹ کرنل ہو کر ریٹائر ہوئے اور ہاؤس ماسٹر مسٹر محمد ایوب خان بنگش تھے۔

اکرم کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ

اکرم کالج میں ۱۶ اگست ۱۹۴۸ء کو ساتویں درجے میں داخل ہوئے۔ دفتری کاغذات میں ان کی تاریخ پیدائش ۴ اپریل ۱۹۳۸ء ہے۔ اس حساب سے وہ تقریباً سوا دس سال کی عمر میں چکری مڈل اسکول سے چھٹی جماعت پاس کر کے کالج میں ساتویں درجے میں داخل ہوئے تھے۔ جو بظاہر قرین قیاس نہ تھا۔ غالباً کسی مصلحت سے ان کی عمر کم لکھائی گئی تھی۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ہم نے اس گھرانے کے سب سے بڑے بزرگ صوبیدار میجر گوہر خان صاحب سے رجوع کیا۔ انہوں نے یہ جواب دیا۔

میں یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو صوبیدار میجری سے ریٹائر ہوا۔ اس سے پہلے یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء کو تین مہینے کی چھٹی پر آگیا تھا۔ میرے چھٹی آنے کے روز یا دوسرے روز مشتاق پیدا ہوا تھا۔ اسی دن شام کو ڈنگے سے اکرم کے پیدا ہونے کی خبر آئی۔ اس طرح میرے حساب سے اکرم کی تاریخ پیدائش یکم یا دو اکتوبر ۱۹۳۶ء ہے۔" اس بیان کے لحاظ سے کالج میں داخلے کے وقت اکرم کی عمر تقریباً بارہ سال بنتی ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق یہ تاریخ پیدائش زیادہ قرین قیاس ہے۔

اکرم کی پہلی کلاس ہفتم "ای" تھی اس کلاس میں ان کے ہم سبقوں میں ۶۷۹، ۱۷۷ء یا

۸۱۷ا جمیل خان، ۱۸۰۵، فضل الرحمان ، ۱۸۲۶ محمد اکرم کے نام قابل ذکر ہیں۔ جمیل خان پاک نیوی میں کیپٹن ہیں۔ باقی تینوں بریگیڈیر ہیں۔ ۱۷۸۰ محمد رقیب مرحوم بھی اسی کلاس میں تھا۔ جو چند سال بعد ہاکی کھیلتا ہوا اللہ کو پیارا ہوا۔

اپریل ۱۹۴۹ء میں جب اس کلاس کا نتیجہ نکلا تو اس میں اکرم بری طرح فیل تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

انگریزی کا امتحان زبانی ہوا تھا۔ اس میں فیل تھے۔ باقی مضامین میں سو میں سے یہ نمبر تھے۔ سائنس ۴۲، اُردو ۲۵، ریاضی ۲۹، تاریخ ۲۳، جغرافیہ ۹، شہریت ۳۰، دینیات ۵۰۔ اس طرح ان کے کل ۲۰۸ نمبر تھے ۷۰۰ میں سے یعنی ۲۹ فیصد، اور ۲۷ لڑکوں کی کلاس میں ان کی پچیسویں پوزیشن تھی۔ اس ناکامی کی وجہ ذریعہ تعلیم کی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ مڈل اسکول چکری میں ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ اور کالج میں تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے۔

دوسرے سال اپریل ۵۰ میں ساتویں "سی" کے امتحان میں ان کا نتیجہ بہت بہتر اور اطمینان بخش تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔

انگریزی ۵۵، سائنس ۵۳ اردو ۳۰، ریاضی ۶۸، تاریخ ۵۷، جغرافیہ ۵۴، اور شہریت ۴۷، دینیات ۱۶ کل نمبر ۴۵۲ آٹھ سو میں سے جو ۵۶ فیصد بنتے ہیں۔ ۲۶ لڑکوں میں ان کی پوزیشن چھٹی تھی۔ بحیثیت مجموعی یہ بہت اچھا نتیجہ ہے۔ اس نتیجے سے اکرم کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جب داخل ہوئے تو بہت کمزور تھے۔ لیکن سال بھر میں انہوں نے محنت وشوق سے اس کمی کو پورا کر لیا اور انگریزی میں بھی مطلوبہ معیار حاصل کر لیا۔

میجر محمد اکرم شہید کے بڑے بھائی صوبیدار عبدالرشید (۱۷۰۷) نے اس زمانے کی یاد تازہ کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں کہا۔

اکرم میرے کالج میں داخل ہونے کے دو سال بعد داخل ہوا۔ لیکن ان کا ہاؤس

دوسرا تھا۔ میں جب بھی ان سے ملنے جاتا تو یا وہ پڑھتے ہوتے ملتے یا ہاکی گراؤنڈ میں ہوتے۔ ہاکی کھیلنے کا انہیں بڑا شوق تھا۔ وہ ہاکی کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔

کالج میں ان کے ایک ہم عصر لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم (کالج نمبر ۱۸۱۸) میجر محمد اکرم شہید کے بارے میں لکھتے ہیں۔

شروع شروع میں انہوں نے کالج کے غیر نصابی مشاغل میں زیادہ حصہ نہیں لیا لیکن جلد ہی کھیل کے میدان میں ان کے جوہر کھلنے لگے۔ پی ٹی اور ڈرل میں حصہ لیا۔ ہاکی اور باکسنگ کا بڑا شوق تھا۔ بڑے اچھے باکسر تھے۔ بڑے جرأت اور ہمت سے باکسنگ کرتے تھے۔

اکرم شہید عموماً چپ چاپ رہتے تھے قدرے شرمیلے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ محنتی اور فرض شناس تھے۔ اس زمانے میں نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ اپنے اخلاق اور شرافت کی وجہ سے اپنے ہم جماعتوں میں مقبول تھے۔

اکرم نے کالج میں اپنے قیام کے آخری تین برس آکنلک ہاؤس میں گزارے۔ اس زمانے میں آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر، مسٹر ضمیر صدیقی نے اکرم کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

ان دنوں کالج میں چاروں ہاؤسوں کے چھوٹے لڑکوں پر مشتمل ایک اسکاؤٹ ٹروپ تھا ایک بانی کے طور پر، اس ٹروپ کی نگرانی میرے سپرد تھی گویا میں ان کا ٹروپ ماسٹر تھا مجھے یاد ہے کہ اکرم اس اسکاؤٹ ٹروپ میں شامل تھے اور خاموشی سے اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ اس زمانے میں ہفتہ کی رات ہیوی ڈنر ہوتا تھا اور اس کے بعد گانوں، لطیفوں اور ڈراموں پر مشتمل ہلکا پھلکا تفریحی پروگرام ہوتا تھا۔ اس پروگرام میں اکرم کو میں نے ایک آدھ بار کے علاوہ کبھی حصہ لیتے نہیں دیکھا۔ ہاکی کا شوق البتہ انہیں بہت تھا۔

آخر میں اکرم کی کالج کی زندگی پر اکرم کے ایک کلاس فیلو اور ہاؤس فیلو ۱۸۲۱ ظہور شوکت جنجوعہ کا ایک دلچسپ اور پر از معلومات انٹرویو پیش کیا جاتا ہے۔

ظہور شوکت جنجوعہ کا انٹرویو

سوال:۔ شوکت! پہلے تو آپ اپنا تعارف کرائیے؟

جواب:۔ پورا نام ظہور شوکت ہے۔ جنجوعہ کا لاحقہ بھی ساتھ لگا رکھا ہے۔ کالج نمبر ۱۸۲۱ ہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء تک کالج میں رہا۔

سوال:۔ اکرم سے آپ کا تعلق کب سے کب تک رہا۔

جواب:۔ اکرم کا کالج نمبر ۱۸۱۱ ہے میرا ۱۸۲۱ ہم دونوں ایک ساتھ اگست ۱۹۴۸ میں داخل ہوئے۔ ہاؤس بھی ایک اور کلاس میں سیکشن بھی ایک تھی۔

سوال:۔ ذرا تفصیل سے کام لیجیے؟

جواب:۔ ان دنوں رابرٹس ہاؤس (اب شیر شاہ سوری) بے بی ہاؤس تھا۔ نئے چھوٹے لڑکے یہاں آتے تھے۔ ہم دونوں رابرٹس میں دو سال تک ساتھ رہے۔

سوال:۔ ہاؤس ماسٹر اور ہاؤس آفیسر کون تھا؟

جواب:۔ ہاؤس ماسٹر مسٹر محمد ایوب خان تھے اور ہاؤس آفیسر کیپٹن اب (لیفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ) عبدالحمید ابراہیم تھے۔ اس زمانے میں ہاؤس کے سامنے کی طرف اونچی دیوار تھی۔ لائٹس آؤٹ کے بعد آگے پیچھے تالا لگ جاتا تھا۔

سوال:۔ کوئی کلاس کی بات بھی یاد ہے آپ کو؟

جواب:۔ جی ہاں۔ ہم دونوں ساتویں جماعت کی "ای" سیکشن میں تھے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا تھا تو ہمارے کلاس کمانڈر کارپورل (اب بریگیڈیئر) سید محمد تھے۔

ہماری انگریزی کی کتاب بیسک انگلش میں ایک سبق سارجنٹ اسٹرینج بی ہے وبیز نامی تھا۔ یہ کردار اکرم کا محبوب کردار تھا۔ اپریل ۴۹ء کے ساتویں درجے کے سالانہ امتحان میں اکرم رہ گئے تھے۔ دوسرے سال اپریل ۱۹۵۰ء میں ہفتم سی سے

انہوں نے ساتویں کا امتحان پاس کیا۔ اور ہشتم ڈی میں چلے گئے۔ اس سال جب کرنل
کرنل زیدی صاحب نے بے بی ہاؤس توڑا اور ہر ہاؤس میں پہلی اور چھٹی سیکشن بے بی
سیکشن بنا دی گئیں تو اکرم آکنلک ہاؤس (جو منہدم ہو چکا ہے) چلے گئے۔ اور کالج میں
اپنی زندگی کے باقی تین سال انہوں نے آکنلک ہاؤس ہی میں گزارے۔ آکنلک ہاؤس
میں ان کے ہاؤس ماسٹر مسٹر ضمیر صدیقی تھے۔ جن کی حسن کارکردگی کی داستانیں مشہور ہیں
۵۱-۱۹۵۰ء میں اکرم ہشتم ڈی میں پھر فیل ہوتے تھے۔ آکنلک ہاؤس کے زمانے کی دو
باتیں قابل ذکر ہیں پہلے تو یہ کہ اس ہاؤس میں جاتے ہی وہ ایک بار کالج سے بغیر اجازت
گھر گئے تھے پانچ چھ دن بعد ان کے والد انہیں ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس حرکت پر ہم ان
کا بہت مذاق اڑاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آکنلک ہاؤس کے زمانے سے انہوں نے ہاکی میں زیادہ
دلچسپی لینا شروع کی تھی اور امتیاز حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں اکرم۔ آئی
ایس۔ ایس۔ بی کی چھان پھٹک ٹیم کے سامنے پیش ہوئے اور غالباً تعلیمی وجوہ کی بنا پر مسترد کر
دیئے گئے۔ اس کے بعد وہ پنجاب رجمنٹ کی بوائز کمپنی میں بھرتی ہو گئے۔

سوال:۔ شوکت، یہ تو واقعات کا سلسلہ ہوا اب شخصیت کی طرف آیئے۔

جواب:۔ شخصیت و کردار کے بارے میں یہ کہ طبعاً خاموش طبع اور شریف النفس تھے۔ یہاں
مجھے ایک لطیفہ یا دلچسپ واقعہ یاد آیا۔

سوال:۔ کیا؟

جواب:۔ آپ نے خود اکرم کو دیکھا ہے اور پڑھایا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اکرم کا چہرہ کتابی لمبوترا
تھا۔ چہرے کے دُبلے پن کی وجہ سے سامنے سے آنکھیں نمایاں نظر آتی تھیں اور ایک
رخ سے کان نمایاں ہو جاتے تھے۔ خصوصاً جب فوجی تراش کے بال نئے نئے کٹے ہوں
مجھے یہاں اعتراف کرنا چاہیئے کہ میرا شمار کھلنڈرے اور شرارتی لڑکوں میں ہوتا تھا۔
اور میرا زیادہ تر اٹھنا بیٹھنا شرارتی گروپ کے ساتھ تھا۔ جب اکرم تازہ تازہ بال کٹوا

کے آتے اور ان کے کان معمول سے زیادہ نمایاں نظر آتے تو میرے ہاتھ میں کھجلی ہوتی اور ہم بہانے بہانے سے اس شریف آدمی کے کان کھینچتے۔ اکرم کہتے نالائقو ناپاک ہاتھ لگا رہے ہو، اس پر ۸۲۷ عجائب کہتا نہیں یار ہم صابن سے ہاتھ دھو کر آئے ہیں فکر مت کرو اور پھر زوردار قہقہہ پڑتا۔

اکرم اس زمانے میں بھی پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ رابرٹس ہاؤس کے پیچھے جو آم کا پیڑ ہے۔ اس کے نیچے نمازی لڑکے نماز پڑھتے تھے۔

سوال:۔ کیا اس زمانے میں اکرم میں کوئی ایسی بات تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ سانولے رنگ کا یہ پتلا دبلا خاموش طبع لڑکا ایک دن ملک کا سب سے بڑا جنگی اعزاز نشان حیدر لے گا۔

جواب:۔ جب دسمبر ۱۹۷۱ء میں اکرم کو نشان حیدر کا اعزاز ملا تو میں نے ۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک کے ان دنوں کو یاد کیا جو میں نے ان کے ساتھ دن رات گزارے تھے۔ اس زمانے کی قریبی رفاقت کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اکرم اس دور میں ایک مبہم گھٹن کا شکار تھے ان کے اندر ایک لاوا ایک رہا تھا۔ امنگوں اور آرزوؤں کا ایک طوفان ان کے دل میں چپکے چپکے پرورش پا رہا تھا۔ جس کی انہیں شاید خود بھی خبر نہیں تھی۔ صرف لاشعوری طور پر اس کا اظہار ہوتا تھا۔

سوال:۔ وہ کس طرح؟

جواب:۔ وہ اس طرح کہ گو اکرم ہم سے باتیں نہیں کرتے تھے۔ لیکن غسل خانے میں اپنے آپ سے باتیں کرتے تھے۔

غسل خانے میں سارجنٹ اسٹرینج بی ہے وئیر کے ڈائیلاگ دہرانا ان کا معمول تھا۔ اس تماشے پر ہم انہیں چھیڑتے بھی تھے۔ جس کا جواب مسکراہٹ کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ مسکراہٹ پر اعتماد ہوتی تھی۔ عزم اور اعتماد ان دو ہتھیاروں

سے انہوں نے زندگی کی ساری جنگ جیتی۔ پبلک اسکول کی زندگی کا اسٹائل کچھ ایسا ہوتا ہے کہ یہاں مجلسی کم حساس اور کم تخیل کے شور پسند لڑکے زیادہ تر چھائے رہتے ہیں نرم خو طبع حساس اور تنہائی پسند لڑکے سامنے نہیں آتے۔ یہی کچھ اکرم کے ساتھ ہوا۔ وہ یہاں نہیں چمکے۔ لیکن بوائز کمپنی میں جاتے ہی ان کے جوہر کھلنے لگے۔ آرمی اسپیشل بھی پاس کرلیا اور دوسرے میدانوں میں بھی نام پیدا کیا۔ پنجاب سنٹر سے انہوں نے بیسٹ ریکروٹ کا اعزاز حاصل کیا۔

میں یہ کہوں گا کہ ملٹری کالج سے اکرم نے دو چیزیں حاصل کیں۔ ایک پڑھنے کا شوق بعد کو پڑھنے لکھنے کے میدان میں بھی جو کامیابیاں انہوں نے حاصل کیں۔ اسکی بنیادیں یہیں رکھی گئی تھیں۔ دوسرے یہ کہ وہ یہاں سے آفیسر بننے کا عزم اور تصور لے کر گئے کالج میں ان کی مسلسل خاموشی اس سرد جنگ کی وجہ سے تھی جو ان کے لاشعور میں جاری تھی۔ اکرم نے پہلے اپنے آپ کو فتح کیا اس کے بعد وہ باہر کی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اکرم کی شہادت یا ان کا نشان حیدر کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ یہ عمر بھر کی جدوجہد کا نقطہ کمال تھا۔ اکرم کی داستان حیات کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی اکرم شہید پانچ سال تک ملٹری کالج میں رہے۔ اس زمانے میں پندرہ برس کی عمر کو پہنچنے پر افسری کی صلاحیت جانچنے کا ایک ٹیسٹ ہوا کرتا تھا۔ اکرم غالباً اپنی شرمیلی طبیعت کی وجہ سے اسے عبور نہیں کر سکے۔ انہوں نے ۳ جولائی ۱۹۵۳ء کو کالج کو خیرباد کہا اور اپنے والد کی پنجاب رجمنٹ کی بوائز کمپنی میں بھرتی ہو گئے۔

اکرم ۱۴ پنجاب رجمنٹل سنٹر میں

اس زمانے میں پنجاب رجمنٹل کا سنٹر جہلم تھا۔ اور دوسری رجمنٹوں کی طرح ۱۴ پنجاب رجمنٹ کی بھی ایک بوائز کمپنی تھی۔ اس میں پندرہ سے سترہ برس عمر تک کے لڑکے بھرتی کئے

جاتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کچھ پڑھا لکھا کر اور تھوڑی بہت تربیت دے کر کم عمری میں فوجیوں کی اولاد کو فوجی ماحول سے مانوس کیا جائے تاکہ وہ بہت اچھے ریکروٹ بیا بن سکیں۔ اکرم جولائی ۴۲ء میں پنجاب رجمنٹ کی اس کمپنی میں آئے اور دو سال تک زیر تربیت رہے۔

اکرم کے چودہ پنجاب سنٹر کے زمانے کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہم نے ۸ پنجاب کے پرانے ایڈجوٹینٹ بریگیڈیر عاشق ملک اور موجودہ سی۔ او لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب سے رابطہ قائم کیا۔ یہ دونوں کالج کے اولڈ بوائز ہیں۔ ان کے تعاون سے ہمیں دو تین اصحاب سے طویل انٹرویو لینے کا موقع مل گیا جو اکرم کے ساتھ رہے تھے یا ان کو اس زمانے میں بہت قریب سے دیکھا تھا سب سے پہلے ہم بوائز کمپنی میں اکرم کے انسٹرکٹر آنریری لیفٹیننٹ عبدالعزیز ۸ پنجاب کا انٹرویو درج کرتے ہیں۔

سوال:۔ عزیز صاحب! پہلے تو آپ اپنا تعارف کرائیے؟

جواب:۔ نام میرا عبدالعزیز ہے ۸ پنجاب میں صوبیدار میجر رہا ہوں۔ اب آنریری لیفٹننٹ کی حیثیت سے ۳۲ سال نوکری کے بعد ریٹائر ہو رہا ہوں۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک میں ۱۴ پنجاب رجمنٹل سنٹر جہلم کی بوائز کمپنی میں ایجوکیشن انسٹرکٹر تھا۔ یہیں پہلی بار اکرم کو دیکھا۔

سوال:۔ اکرم کی شکل و شباہت کا کوئی نقش ہے آپ کے ذہن میں؟

جواب:۔ برسوں پرانی بات ہے اب جو ذہن پر زور ڈالتا ہوں تو ایک گہرے سانولے رنگ کے دبلے پتلے شرمیلے لڑکے کی ایک دھندلی سی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے۔ جو اپنے لمبوترے چہرے اور قدرے لمبے قد کی وجہ سے اور دبلا بلکہ کسی حد تک کمزور نظر آتا تھا۔

سوال:۔ کیا پہلی نظر میں آپ کو اکرم نے متاثر کیا تھا؟

جواب :۔ جی بالکل نہیں۔ بالکل عام سا دیہاتی لڑکا تھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب اس کے جوہر کھلے تو مجھے اس سے وہ دلچسپی پیدا ہوگئی جو ایک استاد کو اپنے ہونہار شاگرد سے از خود ہو جاتی ہے۔

سوال :۔ کچھ یاد ہے آپ کو، اکرم سے آپ کی پہلی باتیں کیا ہوئی تھیں ؟

جواب :۔ اکرم، ملٹری کالج سے جو اس زمانے میں کے جی کے نام سے مشہور تھا آتے تھے۔ اتنے بڑے ادارے سے آکر بوائز کمپنی میں بھرتی ہونا ایک دلچسپی کی بات تھی۔ اکثر لوگ ان سے بھی پوچھتے تھے یہاں کیسے آپہنچے گھر کیوں نہ چلے گئے۔ میں نے غالباً یہی پوچھا تھا۔

سوال :۔ اکرم کا کیا جواب تھا ؟

جواب :۔ اکرم اس زمانے میں بھی کم گو تھے۔ جو بھی یہ سوال پوچھتا ان کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ میں پڑھنا چاہتا ہوں اور نوکری کرنا چاہتا ہوں۔

سوال :۔ ابھی آپ نے کہا کہ اکرم بوائز کمپنی میں بھرتے ہوئے تھے بوائز کمپنی کا کیا مطلب ہے۔

جواب :۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ ہر رجمنٹ اپنے سنٹر میں افسروں کے سوا ہر درجے کے فوجیوں کے لڑکوں کے لئے ایک نیم فوجی تربیتی مرکز قائم کرتی تھی۔ اس میں عموماً چودہ پندرہ برس کی عمر کے لڑکے بھرتے کئے جاتے تھے۔ اس کا نام بوائز کمپنی ہوتا تھا۔ یہ لڑکے دو اڑھائی سال کچھ لکھتے پڑھتے بھی تھے۔ اور کچھ ابتدائی فوجی تربیت بھی حاصل کرتے تھے اور رنگروٹی کی عمر، اکو پہنچ کر سنٹر میں بحیثیت ریکروٹ کے بھرتی ہو جاتے تھے۔ وہاں تقریباً سال بھر کی ٹریننگ کے بعد پکے سپاہی بن جاتے تھے اور کسی پلٹن میں بھیج دیئے جاتے تھے۔ اسی طرح اکرم اپنے والد سخی محمد کی رجمنٹ ۴/۱ پنجاب کی بوائز کمپنی میں بھرتے ہوتے تھے۔

سوال :۔ اکرم اس بوائز کمپنی کی کس پلاٹون میں تھے ؟

جواب :۔ ۱۴ پنجاب کی اس بوائز کمپنی کے دو ونگ تھے ۔ رائٹ ونگ اور لیفٹ ونگ ۔
رائٹ ونگ کی دو پلاٹون تھیں ۔ ایک کا نام خالد پلاٹون تھا ۔ دوسری کا طارق اسی
طرح لیفٹ ونگ میں دو پلاٹون تھیں ۔ قاسم اور سعد پلاٹون ۔

سوال :۔ اس بوائز کمپنی کا کمپنی کمانڈر کون تھا ؟

جواب :۔ میجر عبدالکریم ۱۴ پنجاب ۔

سوال :۔ اکرم کس پلاٹون میں تھے ؟

جواب :۔ رائٹ ونگ کی طارق پلاٹون میں ۔

سوال :۔ اس رائٹ ونگ کا اس زمانے میں ونگ کمانڈر کون تھا ؟

جواب :۔ نائب صوبیدار امانت علی ۔

سوال :۔ طارق پلاٹون کا نگران کون تھا ؟

جواب :۔ نگران تو نائب صوبیدار امانت علی ہی تھے ۔ لیکن بوائز میں سے پلاٹون کمانڈر ایک
لڑکا ہی تھا ۔

سوال :۔ کون ؟

جواب :۔ محمد اسحاق جواب ۶ یا ۱۱ پنجاب میں صوبیدار ہیں ۔

سوال :۔ آپ اکرم کو کیا پڑھاتے تھے ؟

جواب :۔ میں فرسٹ رومن اُردو کی کلاس لیتا تھا ۔ اکرم اسی کلاس میں تھے ۔

سوال :۔ بحیثیت طالب علم کے اکرم میں کوئی خصوصیت تھی ؟

جواب :۔ کوئی خاص خصوصیت تو نہیں تھی ایک چیز جس کو آپ خصوصیت کہہ سکتے ہیں ۔
یہ تھی کہ میں مشقی کام یا ہوم ٹاسک کافی دیر کرتا تھا ۔ مجھے یاد نہیں کہ اکرم نے کبھی اپنا
کام نہ کیا ہو ، اور مجھے سرزنش کرنے کا موقعہ دیا ہو ۔ حالانکہ دوسرے لڑکوں کی ڈانٹ ڈپٹ
اکثر ہوتی رہتی تھی ۔ اس زمانے میں تمام آرمی میں ہماری بوائز کمپنی کا ریکارڈ تھا ۔ ہم

یک وقت میں چالیس، چالیس لڑکے فرسٹ رومن اور فرسٹ میپ ریڈنگ میں بٹھاتے تھے۔ اس لئے ہم لڑکوں پہ کافی سختی کرتے تھے اکرم نے ہمیں انہیں جھاڑنے یا سزا دینے کا موقعہ نہیں دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کے جی کالج کے تجربے نے اکرم کے اندر پڑھنے اور ترقی کرنے کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا۔

سوال:۔ فرسٹ رومن اردو کی کلاس میں اکرم کے نمبر کتنے آتے تھے؟

جواب:۔ ۶۰، ۷۰ کے درمیان۔

سوال:۔ کلاس میں کس جگہ بیٹھتے تھے؟ اگلی قطار میں یا پیچھے؟

جواب:۔ تیسری لائن میں جو درمیان میں پڑتی تھی۔

سوال:۔ کلاس میں سوال جواب میں کیسے تھے؟

جواب:۔ از خود کبھی نہ پوچھتے تھے نہ جواب دیتے تھے۔ اصل میں شروع سے اکرم حد درجہ خاموش طبع اور شرمیلے تھے۔ تحریری جوابات صحیح ہوتے تھے۔ لیکن بولنے میں کچے تھے۔

سوال:۔ اکرم میں کوئی امتیازی وصف بھی تھا؟

جواب:۔ استاد کا ادب کرنے میں وہ سب سے آگے ہوتا تھا۔ اور دل سے احترام کرتا تھا سراپا ادب ہوتا تھا۔ مجھے اکرم کی یہی ادا پسند تھی۔ استاد سے ڈرتے تو سب طالب علم ہی ہیں لیکن دل سے تعظیم کوئی کوئی کرتا ہے۔ جو طالب علم کے انداز سے بول چال کے طریقے اور لب و لہجے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اکرم کے رویے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لڑکا استادوں کی دل سے عزت کرتا ہے۔ میرا ہی نہیں دوسرے انسٹرکٹروں کا بھی یہی تاثر تھا۔

سوال:۔ آپ نے اکرم کو کتنے عرصے پڑھایا؟

جواب:۔ اکرم براہِ راست میری کلاس میں چھ مہینے رہے۔ جون ۱۹۵۴ء تک اکرم نے بوائز کمپنی میں فرسٹ رومن اُردو، فرسٹ میپ ریڈنگ اور تھرڈ انگلش کیا۔ جون ۵۴ء

انہوں نے فرسٹ رومن اُردو کیا۔

سوال:۔ کچھ یاد ہے آپ کو، اکرم کا نتیجہ کیا تھا؟

جواب:۔ اکرم نے فرسٹ رومن پہلی کوشش میں اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ کے۔جی کی ٹھوکر نے اکرم کو پڑھائی کے بارے میں بہت سنجیدہ بنا دیا تھا۔

سوال:۔ پڑھائی میں دلچسپی کے علاوہ اکرم کا کوئی اور بھی امتیاز تھا؟

جواب:۔ بوائز کمپنی میں ہونہار لڑکوں کو ان کی پڑھائی اور کھیلوں وغیرہ دوسری سرگرمیوں میں برتری کی بنیاد پر کمانڈ اور کنٹرول کے عہدے دیئے جاتے تھے۔ بوائز کمپنی میں پہلے چھ مہینے کے بعد ان کی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر انہیں براہِ راست پلاٹون کمانڈر بنا دیا گیا تھا۔ جو ایک بڑا اعزاز تھا۔ پرموشن ہونے پر انہیں رائٹ ونگ کی طارق پلاٹون سے تبدیل کر کے لیفٹ ونگ کی پلاٹون قاسم پلاٹون کے کمانڈر کی حیثیت سے بھیج دیا گیا تھا۔

سوال:۔ اس وقت لیفٹ ونگ کن صاحب کی زیرِ نگرانی تھا؟

جواب:۔ لیفٹ ونگ کے کمانڈر نائب صوبیدار محمد سرفراز تھے۔ ونگ کمانڈر زیادہ تر پریڈ گراؤنڈ میں کمانڈ کرتے تھے۔ پلاٹون کا سارا کام بوائے پلاٹون کمانڈر ہی کرتا تھا۔

سوال:۔ قاسم پلاٹون کے کمانڈر کی حیثیت سے اکرم کا امتیاز کیا تھا؟

جواب:۔ اپنے کام سے لگن اکرم کے کام سے لیفٹ ونگ کے کمانڈر جمعدار سرفراز صاحب بہت خوش تھے۔ کہا کرتے تھے اس لڑکے کو کام بتا کر انسان اس کام کو بھول بھی جائے تو کوئی حرج نہیں کام کا پکا اور دھن کا پکا ہے۔ شکل سے پتہ نہیں چلتا لیکن اندر سے سونا ہے۔

سوال:۔ کوئی کھیل وغیرہ میں دلچسپی؟

جواب:۔ ہاکی کا شوق وہ کے۔جی سے لائے تھے۔ شروع سے بوائز کمپنی کی ہاکی ٹیم میں

کھیلتے تھے۔شوٹنگ کا بھی شوق تھا۔

سوال:۔ہاکی کس طرف کھیلتے تھے؟

جواب:۔فارورڈ میں ان کھیلتے تھے اور بڑے جوش اور تندہی سے کھیلتے تھے۔اکثر پیروں میں چوٹیں لگتی رہتی تھیں۔میں نے اکثر ٹخنے اور پنڈلی میں پٹیاں بندھی دیکھیں۔

سوال:۔کوئی نماز وغیرہ کا اہتمام تھا؟

جواب:۔اپنے طور پر نمازی تھے۔

سوال:۔بوائز کمپنی میں اکرم نے کوئی اور اعزاز حاصل کیا؟

جواب:۔اکرم کو دوسرے سال میں بوائز کمپنی کا کمانڈر یا کیپٹن بنادیا گیا تھا۔یہ بوائز کمپنی کے کسی لڑکے کے لئے سب سے بڑا اعزاز تھا۔بوائے کمانڈر کمپنی کی پریڈ کی قیادت کرتا تھا۔

سوال:۔اکرم کو بوائز کمپنی سے پاس آؤٹ ہوتے ہوتے کوئی اعزاز ملا؟

جواب:۔بوائز کمپنی کے کورس کے بعد کوئی باقاعدہ پاسنگ آؤٹ پریڈ نہیں ہوتی تھی۔دو سال ۱۴ پنجاب کی بوائز کمپنی میں گزارنے کے بعد وہ ۱۴ پنجاب سنٹر میں ایک عام ریکروٹ کی حیثیت سے بھرتی ہوگئے۔سنٹر میں ان کی پلاٹون کا نام حفیظ پلاٹون تھا۔

سوال:۔حفیظ کون؟

جواب:۔پنجاب سنٹر میں روایت تھی کہ ایک نئے ریکروٹوں کی پلاٹون کسی حاضر افسر کے نام پر اٹھائی جاتی تھی۔وہ افسر اپنی پلاٹون میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔

سوال:۔۱۴ پنجاب کی حفیظ پلاٹون میں اکرم کتنے عرصے رہے؟

جواب:۔تقریباً ۳۶ ہفتے کم وبیش ۹ مہینے۔

سوال:۔حفیظ پلاٹون میں ان کی کارکردگی کیسی رہی؟

جواب:۔میں تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔اس لئے کہ میں تو بدستور بوائز کمپنی میں انسٹرکٹر تھا سنٹر میں آنا جانا تھا۔اس لئے اکرم کے بارے میں یہی سننے میں آتا تھا کہ اکرم کے جی اچھا

جا رہا ہے۔

سوال :۔ اکرم کے جی، کیا مطلب ؟

جواب :۔ بوائز کمپنی میں ۱۴ پنجاب سنٹر میں اکرم کے جی ملٹری کالج سے آنے کی وجہ سے
اکرم کے جی کے نام سے مشہور ہے۔

سوال :۔ ریکروٹی کے زمانے میں اکرم کو کوئی اعزاز ملا ؟

جواب :۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرا میں اکرم کو شوٹنگ کا میڈل ملا تھا۔ جو غالباً جنرل ایوب
خان نے انہیں عطا کیا تھا۔

سوال :۔ حفیظ پلاٹون میں ریکروٹی کی تربیت کے دوران انہیں کوئی عہدہ ملا تھا ؟

جواب :۔ میرا خیال ہے کہ سیکشن کمانڈر ہو گئے تھے۔ سنٹر میں ساری تربیت سیکشن کی سطح پر
ہوتی ہے۔ کسی ریکروٹ کا سیکشن کمانڈر ہونا بڑی بات ہوتی ہے۔

سوال :۔ کیا اکرم بہترین ریکروٹ کی حیثیت سے پاس آؤٹ ہوئے تھے ؟

جواب : کچھ نہیں کہہ سکتا۔

سوال :۔ ان کی ریکروٹی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کی سلامی کس نے لی تھی ؟

جواب :۔ سنٹر کے کمانڈانٹ کرنل عبدالجبار نے۔

سوال :۔ ریکروٹی کی تربیت مکمل ہونے کے بعد اکرم بطور سپاہی کہاں پوسٹ ہوئے تھے۔

جواب :۔ اکرم کو ۱۴/۴ پنجاب پوسٹ کیا گیا تھا۔ جو گروپ کی ایک یونٹ تھی۔ جو بعد کو ۸ پنجاب
بنی۔ اس امر کی تفصیل یہ ہے کہ ۷ جولائی ۱۹۵۶ء کو فرسٹ پنجاب ۱۴ پنجاب ۱۵ پنجاب
۱۶ پنجاب کی رجمنٹل سنٹروں کو ملا کر جہلم میں پنجاب رجمنٹل سنٹر بنا دیا گیا۔ اور اس یونٹ
۱۴/۴ کا نام ۸ پنجاب رکھا گیا گویا ۸ پنجاب اکرم شہید نشان حیدر کی آبائی یونٹ ہے
اس یونٹ میں وہ سپاہی آئے۔ یہیں سے انہوں نے ابتدائی پانچ سال گزارے یہیں
سے انہوں نے کمیشن لیا اس یونٹ کو کبھی نہیں بھولے۔ یونٹ بھی ان پر فخر کرتی ہے

اور اپنا فرزند سمجھتی ہے۔

سوال :۔ پنجاب سنٹر کے بعد پھر کب آپ اکرم سے ملے؟

جواب :۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۰ء کو جب انٹیلی جنس حوالدار کی حیثیت سے ۸ پنجاب میں گیا تو وہاں دوبارہ اکرم سے ملاقات ہوئی۔ اُس وقت ۸ پنجاب ڈیرہ نواب صاحب میں مقیم تھی اور اکرم انٹیلی جنس سیکشن میں تھے۔ اکرم نے کمیشن کے لئے درخواست دی ہوئی تھی۔ اور اس کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ اور عملی طور پر دوسرے کاموں سے فارغ کر دیئے گئے تھے میں وہاں بہت تھوڑے عرصے ٹھہرا۔ فروری ۱۹۶۱ء میں انٹیلی جنس یونٹ مشرقی پاکستان روانہ ہوگئی۔ اکرم بھی یونٹ کے ساتھ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہیں تھوڑے دنوں کے بعد ڈھاکہ میں انہیں پی، ایم، اے کے بلاوے کا نوٹس ملا۔ اور وہ جلد واپس آ گئے۔

سوال :۔ ۸ پنجاب میں آپ کا ان کا بہت تھوڑے عرصے ساتھ رہا۔ پھر بھی چونکہ وہ آپ کی انٹیلی جنس سیکشن میں تھے۔ اس زمانے کی کوئی یاد؟

جواب :۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ میں یونٹ میں بہت تھوڑے عرصے رہا۔ کوئی مہینہ بھر اکرم میرے ماتحت اس سیکشن میں ضرور تھے۔ لیکن عملاً انہیں کمیشن کے سلسلے میں فری کیا ہوا تھا۔ اتنا مجھے یاد ہے کہ یونٹ کے کمانڈر سید محمود حسین ان سے بہت خوش تھے۔ اور ایڈجوٹینٹ کیپٹن عاشق ملک ان پر بہت مہربان تھے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے۔

سوال :۔ اکرم سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی؟

جواب :۔ غالباً جولائی ۱۹۷۰ء میں وہ میجر ہو چکے تھے اور ۸ پنجاب کی ایک کمپنی کی کمان کر رہے تھے جو جسڑ کے پل پر متعین تھی۔ میں بھی جسڑ کے قریب نارووال میں ایم آئی ڈائریکٹریٹ کی طرف سے ایک سیکشن میں فرائض منصبی انجام دے رہا تھا۔ نارووال کی مسجد میں

جمعہ کی نماز کے بعد ان سے اچانک ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ بھی جسر سے نماز کیلئے نارووال آتے تھے۔ دوسرے دن انہوں نے جسر میں اپنی کمپنی میں آنے کی دعوت دی میں گیا، میں جے سی او وہ میجر لیکن وہ شاگرد کی حیثیت سے ملے اور بڑے والہانہ انداز سے، میرا پورا احترام ملحوظ رکھا۔ یوں جیسے ایسا کرنے میں فخر محسوس ہو رہا ہو اور لطف آرہا ہو۔ میں موقعہ نکال کر ان کی کمپنی کے آدمیوں سے بھی ملا۔ کہ دیکھوں میرے شاگرد کے بارے میں اس کے اپنے آدمی کیا کہتے ہیں۔ افسر کا اصل حال تو اس کے آدمی ہی جانتے ہیں۔ اس کا کھرا کھوٹا جتنا وہ پہچانتے ہیں اتنا کوئی اور نہیں پہچانتا مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اکرم کی کمپنی کے جوانوں نے یہی کہا۔ صاحب بہترین افسر ہے اور بہترین انسان اکرم سے میری آخری ملاقات تھی ۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ۴ ایف ایف کے ساتھ وابستہ تھا۔ ایک بار دیناج پور بھی جانا ہوا۔ ان کی ۴ ایف ایف قریب ہی تھی کوشش بھی کی لیکن ملاقات نہیں ہو سکی۔

سوال:۔ اب آخری سوال یہ ہے کہ اپنے نامور شاگرد کے بارے میں آپ کا آخری تاثر کیا ہے۔

جواب:۔ میں اکرم کو بہت اونچا آدمی سمجھتا ہوں۔ بحیثیت شاگرد کے اس نے جتنی عزت میری کی۔ اتنی کسی استاد کی کسی شاگرد نے کم کی ہوگی۔ دوسرے یہ کہ لڑکپن اور جوانی میں بھی اس نے کبھی کوئی گری ہوئی حرکت نہیں کی۔ وہ بوائز کمپنی میں بھی اپنے کردار کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ دھن کا پکا بڑا محنتی اور مخلص انسان تھا۔

نا مناسب نہ ہوگا اگر یہاں ۱۴ پنجاب رجمنٹ کی بوائز کمپنی کے کمانڈر کے تاثرات بھی نقل کئے جائیں۔

لیفٹیننٹ کرنل فرید ملک کے تاثرات

دسمبر ۱۹۵۳ء میں، بحیثیت کیپٹن پنجاب رجمنٹل سنٹر جہلم میں ٹریننگ کمپنی کمانڈر

کے طور پر پوسٹ ہوا تھا۔ کم وبیش تین مہینے اس منصب پر کام کرنے کے بعد میں نے ۱۲ را پریل ۱۹۵۴ء کو سنٹر کی بوائز کمپنی کی کمانڈری کا چارج کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ) محمد اکرم سے لیا۔ یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ کرنل اکرم کا تعلق بھی میری طرح ملٹری کالج سے رہا ہے۔ ان کا کالج نمبر ۹۳۴ ہے اور میرا ۹۰۱۔ ہم دونوں کالج میں بھی ساتھی اور دوست تھے۔ پنجاب سنٹر میں پھر یکجا ہونے کا موقعہ ملا۔ کمپنی کا چارج لئے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ مجھے معلوم ہوا کہ کمپنی میں جو نئے لڑکے آئے ہیں ان میں کے۔ جی۔ آر کا ایک لڑکا بھی ہے۔ مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں اپنے کالج سے کون آیا ہے۔ میں نے حوالدار میجر سے کہا۔ کہ کل صبح صبح دفتر میں کے جی آر کے لڑکے کو لانا۔ حوالدار میجر نے کہا۔ سر بڑا شریف لڑکا ہے۔ ہاکی کمال کی کھیلتا ہے۔ بہر حال دوسرے روز صبح دفتر میں جب حوالدار میجر نے اکرم کو میرے سامنے پیش کیا تو میں دیر تک اکرم سے کالج کی باتیں پوچھتا رہا۔ پی ٹی پریڈ، باکسنگ، صبح کی انسپکشن، مغرب کی نماز۔ رات کا پریپ، واکنگ آوٹ اور ۹۱ مائل اسٹون کی سزا وغیرہ۔ اکرم کو حیرت ہو رہی تھی کہ میں کالج کے بارے میں اتنی بہت سی باتیں کیسے جانتا ہوں۔ آخر میں، میں نے اسے بتایا کہ میں بھی ملٹری کالج کا پڑھا ہوا ہوں۔ اور اس ادارے کی تعلیم و تربیت سے اس عہدے تک پہنچا ہوں، بات ختم کرنے سے پہلے میں نے اس کے کھیل کی تعریف کی اور کہا کوئی پرابلم ہو تو بتانا۔ اکرم نے ازخود تو کوئی پرابلم مجھے نہیں بتائی کچھ دنوں میں مجھے ہی خود اندازہ ہو گیا کہ پی ٹی ڈرل اور دوسرے فوجی کاموں میں تو یہ لڑکا ٹھیک ٹھاک ہے بلکہ اوروں سے بہتر ہے۔ اس کا اصل مسئلہ تعلیم ہے۔ چنانچہ میں نے حکم دیا کہ اکرم کو ایک علیحدہ کمرہ دیا جائے۔ تاکہ فارغ وقت میں کچھ زیادہ پڑھائی کر سکے۔ یہ غیر معمولی رعایت تھی۔ میرے اسٹاف کو اس اقدام پر قدرے حیرت بھی ہوئی کیونکہ بوائز کمپنی کی روایت یہ تھی کہ علیحدہ کمرہ صرف پلاٹون کمانڈر کو دیا جاتا تھا۔ دوسرے عہدیدار لڑکے بھی ایک کمرہ میں تین تین رہتے تھے۔ شکر ہے کہ اکرم نے بہت جلد بوائز کمپنی میں اپنی جگہ بنا

لی۔ تعلیم، کھیلوں اور ڈسپلن کی عمدہ کارکردگی کی بنا پر اسے پلاٹون کمانڈر بنا دیا گیا۔
میں نے اکرم کو صرف ہاکی کھیلنے اور فائرنگ کی مشق کی اجازت دی تھی دوسرے کھیل کھیلنے سے منع کر رکھا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ صرف ان دو میدانوں میں اس کی کارکردگی بہتر ہو اور تعلیم کے لئے زیادہ وقت نکل سکے۔ پلاٹون کمانڈر کی حیثیت سے اکرم نے بہت محنت کی۔ اور تقریباً ہر مقابلہ میں اس کی پلاٹون اوّل رہی۔ کام کوئی ہو اس میں چوکھا رنگ جان مارنے ہی سے آتا ہے۔ اکرم کو یہ گر آتا تھا۔ اس میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ جو کام دیا جائے اسے وہ جان لڑا کر کرتا تھا۔ کم گو ۔خاموش، قدرے شرمیلا لیکن دھن کا پکا۔

آخری ٹرم میں اکرم کو بوائز کمپنی کا کمانڈر بننے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ اسکی کمانڈری کے زمانے میں ۱۴ پنجاب سنٹر جہلم کی بوائز کمپنی نے تین اہم اعزازات جیتے۔

انٹر سروس بوائز باکسنگ چمپئن شپ

بوائز کمپنی فائرنگ چمپئن شپ

جہلم اسٹیشن تیراکی چمپئن شپ

خود اکرم نے بوائز کمپنی میں مندرجہ ذیل آرمی امتحانات پاس کئے۔

فسٹ کلاس رومن اردو

فرسٹ کلاس میپ ریڈنگ

فرسٹ کلاس انگلش

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اکرم نماز کا پابند بھی تھا۔ بوائز کمپنی میں اسے اس کے کردار اور کارکردگی کی بنا پر عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اکرم بوائز کمپنی سے پاس آؤٹ ہو کر سنٹر کی ریکروٹ ٹریننگ کمپنی چلا گیا اور میں بھی سنٹر سے پوسٹ آؤٹ ہوگیا۔ اس کے بعد ایک عرصے تک اکرم سے کوئی

رابطہ نہیں رہا۔ غالباً ۱۹۶۳ء میں سنا کہ اسے کمیشن مل گیا ہے۔ بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ دیر سویر اس کی دیانت اور محنت رنگ لا کے رہے گی۔

اکرم سے میری آخری ملاقات اوائل ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ اور وہ بھی اتفاق سے لیکن اس کا نقش آج بھی میرے دل پر باقی ہے۔ ہوا یوں کہ میری یونٹ ۳۵ پنجاب کو کوئٹہ سے سیالکوٹ جا کر ۴ ایف ایف کی جگہ لینی تھی۔ اور اسی طرح انہیں کوئٹہ میں ہماری جگہ آنا تھا۔ بحیثیت ۳۵ پنجاب کے کمانڈنگ افسر کے میں یونٹ سے ایک ہفتہ پہلے سیالکوٹ آیا تھا تاکہ چارج کی تبدیلی کی نگرانی کر سکوں۔ چونکہ رات کو دیر سے پہنچا تھا۔ ۴ ایف ایف میس میں اپنے کمرہ میں کھانا کھایا اور سو گیا صبح سویرے کمرہ سے باہر آیا تو دیکھا کہ ۴ ایف ایف کے افسر پی ٹی کے لئے تیار کھڑے ہیں ان میں اکرم بھی تھا۔ جوں ہی اس نے مجھے دیکھا بھاگ کر میرے پاس آیا اور اسی طرح بلا جھجک طرح ایک شاگرد اپنے استاد سے ملتا ہے۔ حالانکہ وہ اب میجر ہو چکا تھا۔ ایک دم میرے ذہن میں برسوں پہلے کی بوائز کمپنی کے اکرم کی تصویر پھر گئی۔ اس زمانے کا دبلا پتلا لڑکا اب، ماشاء اللہ ایک اسمارٹ افسر بن چکا تھا۔

کم و بیش ایک ہفتہ سامان کے چارج کا لین دین چلتا رہا اس عرصے میں اکرم کو جب بھی ذرا سی فرصت ملتی وہ خود آرام کرنے سے پہلے میرے کمرہ میں ضرور آتا۔ اور تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ کر اپنے کمرے میں جاتا۔ میری خاطر تواضع کرنے میں بھی وہ خاص اہتمام کرتا یہ اہتمام صرف ایک سینئر افسر کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ اس کمپنی کمانڈر کے لئے تھا جو کبھی اس کا استاد رہا تھا۔ اس فرق کو میں بڑے فخر سے محسوس کر رہا تھا۔ ان دنوں مجھے بار بار خیال آیا کہ کمانڈر تو میں پوری بوائز کمپنی کا رہا ہوں لیکن استاد کا سا یہ مقام کسی اور نے نہیں دیا۔

اس عرصے میں، میں نے ایک اور بات بھی نوٹ کی کہ نوجوان افسروں سے جو تھوڑی

بہت تفریح بازی کی جائز طور پر توقع کی جاتی ہے۔کوئی ایسا شوق بھی اکرم کو نہیں تھا البتہ چند بار اسے اپنی موٹر سائیکل کو بڑے انہماک سے صاف کرتے ضرور دیکھا۔

آخر وہ دن آ پہنچا جب میں پلٹن کوئٹہ سے سیالکوٹ پہنچی اور اکرم کی پلٹن کوئٹہ جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر جمع ہوئی۔میں نے دستور کے مطابق ۴ ایف ایف کے سارے افسروں کو خدا حافظ کہا۔لیکن جب اکرم مجھ سے گلے ملا تو اس کی بات ہی اور تھی۔ اکرم نے بڑے خلوص سے کہا سر،آپ نے بوائز کمپنی میں جو مجھ پر احسانات کئے تھے میں انہیں تا زندگی نہیں بھول سکتا۔آپ کی خدمت جیسا کہ آپ کا حق تھا میں بدقسمتی سے نہیں کر سکا آپ مجھے معاف فرمائیں۔میں نے ہنس کر کہا۔ پھر سہی اب کے ملیں تو زیادہ خدمت کر لینا۔میں نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی لیکن اکرم کچھ ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔اس نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔سر زندگی کا کیا بھروسہ ہے آپ میری کوتاہیوں کو ضرور درگذر فرمائیں۔اس کے یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے اور یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔میں نے تقریباً تیس سال فوجی وردی پہنی ہے ایک بٹالین کو بھی کمان کیا ہے۔بہت سے اہم منصوبوں پر بھی کام کیا ہے بے شمار سینئر اور جونئر افسروں سے واسطہ پڑا ہے۔بڑوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے اس تمام تجربے کے پیش منظر میں شہید کی روح کو گواہ بنا کر پوری دیانت داری سے کہہ سکتا ہوں کہ مائیں اکرم ایسے بچے کبھی کبھی جنتی ہیں۔

اکرم نے کم و بیش پانچ برس ۸ پنجاب رجمنٹ میں گزارے۔اس دور کی داستان صوبیدار محرم خان ۸ پنجاب سے سنیئے۔

صوبیدار محرم خان کا انٹرویو

سوال:۔ ۸ پنجاب کے زمانے سے پہلے بھی آپ کی ملاقات اکرم شہید سے تھی؟

جواب:۔سب سے پہلے میں،میجر اکرم شہید سے ۱۹۵۳ء میں ملا تھا۔

سوال :- وہ کیسے ؟

جواب :- ۱۹۵۳ء کا ذکر ہے میں ۱۴/۴ پنجاب سنٹر جہلم کی بوائز کمپنی سے فارغ ہو کر اسی سنٹر میں ریکروٹنگ کی ٹریننگ لے رہا تھا کہ ایک روز میں پرانے دوستوں سے ملنے بوائز کمپنی کی طرف جا نکلا۔ وہاں پتہ چلا کہ کے۔جی۔آر سے ایک لڑکا اکرم بوائز میں آیا ہے۔ جو پڑھا لکھا ہے۔ ہاکی خوب کھیلتا ہے اور سمجھدار ہے مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں وہ لڑکا کون ہے جس کی اتنی واہ واہ ہے۔ اتفاق سے رومن اردو کے انسٹرکٹر حوالدار محمد عبدالعزیز صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے ذکر آیا تو انہوں نے اکرم کو بلوایا۔ یہ میری اکرم سے پہلی ملاقات تھی۔ اکرم بوائز کمپنی کے رائٹ ونگ کی طارق پلاٹون میں تھے۔

سوال :- یہ کب کی بات ہے ؟

جواب :- ۱۹۵۳ء کے اواخر کی۔

سوال :- ۸ پنجاب میں آپ اکرم سے کب ملے ؟

جواب :- ۱۹۵۴ء میں ریکروٹی کی ٹریننگ مکمل کر کے ۱۴/۴ پنجاب رجمنٹ میں نوکری کے لئے چلا گیا۔ یہی ۱۴/۴، ۱۹۵۶ء میں ۸ پنجاب بنی۔ اسی سال اکرم ۸ پنجاب سے وابستہ ہوئے۔

سوال :- کب اور کہاں ؟

جواب :- مجھے اچھی طرح یاد ہے ہماری یونٹ ۸ پنجاب ۸ مارچ ۱۹۵۶ء کو حسینی والا سیکٹر میں بارڈر ڈیفنس کے لئے متعین ہوئی تھی۔ وہاں جانے کے چند روز بعد ۱۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو سپاہی محمد اکرم ملک نے ڈیوٹی پر رپورٹ کی تھی اور انہیں ڈیلٹا کمپنی میں بانٹا گیا۔

سوال :- کمپنی کمانڈر کون تھے ؟

جواب :- کیپٹن غلام عباس، جو اب میجر ہو کر ریٹائر ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں ڈیلٹا کمپنی کا خاص شہرہ تھا۔

سوال :- کس طرح ؟

جواب :۔ کمپنی کے سینئر جے۔ سی۔ او صوبیدار علی اکبر، ایم سی بار تھے۔ ان کی بہادری کے بڑے چرچے تھے اور وہ تھے بھی بڑے دل گردے کے آدمی۔

سوال :۔ یونٹ کی کون کمان کر رہا تھا؟

جواب :۔ بٹالین کے ایکٹنگ کمانڈر میجر بشیر احمد ملک تھے۔ جو بی، اے ملک کے نام سے مشہور تھے۔ ملک صاحب کچھ عرصہ ہوا بریگیڈیئر کے عہدے سے ریٹائر ہوتے ہیں۔

سوال :۔ آپ ۸ پنجاب کی کون سی کمپنی میں تھے ؟

جواب :۔ عرض کرتا ہوں۔ ہوا یوں کہ تھوڑے عرصے کے بعد پلٹن حسینی والا سے واپس آ گئی۔ اور ۱۹۵۷ء کے شروع میں ڈیرہ نواب صاحب میں منتقل ہو گئی۔ اس وقت بٹالین کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل خورشید ربانی تھے اور ایڈجوٹینٹ کیپٹن عاشق حسین ملک تھے۔ جو بعد کو بریگیڈیئر ہوئے۔

وہاں جب انٹیلی جنس کیڈر کے لئے یونٹ کی تینوں کمپنیوں سے دو تین نام مانگے گئے تو ڈی کمپنی سے ایک نام اکرم کا بھی تھا۔ الفا کمپنی سے میرا نام تھا۔ کل آٹھ آدمی منتخب ہوئے تھے۔ اس طرح ہم دونوں یکجا ہو گئے۔ دو مہینے کا انٹیلی جنس کیڈر ہم دونوں نے ایک ساتھ کیا۔ اس کیڈر کے افسر انچارج لیفٹیننٹ فرید اور لیفٹننٹ امتیاز وڑائچ تھے جو اب میجر جنرل ہیں۔

سوال :۔ انٹیلی جنس کیڈر میں اکرم کی کارکردگی کیسی تھی؟

جواب :۔ اکرم اس کیڈر کے بارے میں گو ہم سب سے زیادہ سنجیدہ تھے اور محنتی بھی بہت تھے لیکن دوسرے بھی کم نہیں تھے۔ سخت مقابلہ تھا۔ اکرم نے آخری امتحان میں ۵۰۰ میں سے ۳۸۷ نمبر لئے تھے میرے ۳۷۵ تھے اور حوالدار نذر حسین کے ۳۸۱ تھے۔ حوالدار نذر حسین ۱۹۶۵ء میں شہید ہو گئے یہ بھی خوب آدمی تھے۔ اس نتیجے کی بنا پر ہم تینوں کو انٹیلی جنس سیکشن میں لے لیا گیا ہم دونوں ۱۹۶۱ء تک جب تک وہ کمیشن کے لئے منتخب نہیں ہو

گئے تقریباً چار سال تک ساتھ ساتھ رہے۔

سوال:۔ انٹیلی جنس سیکشن کے دنوں کا کوئی خاص واقعہ یاد ہے آپ کو؟

جواب:۔ اس سیکشن میں ہمارے شروع دنوں کی بات ہے کہ ہماری یونٹ کو جنگی مشق کے لئے باہر جانا تھا۔ خیال تھا کہ کورٹ عباس کے علاقے میں جائیں گے۔ اس لئے ہماری انٹیلی جنس سیکشن نے خاصا وقت لگا کر بڑی محنت سے اس علاقے کا بڑا نقشہ تیار کر لیا تھا۔ جب جنگی مشق شروع ہوئی تو ہمیں بہاولپور جانا پڑا۔ اس علاقے کا بڑا نقشہ ہم نے نہیں بنایا تھا۔ سہ پہر کو ایڈجوٹینٹ کیپٹن عاشق ملک نے کہا یہ کام کل تک مکمل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہم تینوں، اکرم، نذر اور میں اسی وقت بڑا نقشہ بنانے جم کر بیٹھ گئے۔ شام سے صبح تین بجے تک کام کرتے رہے۔ صبح ۳ بجے کے وقت کیپٹن عاشق حسین ملک اپنے آپریشن روم سے اٹھے تو انہوں نے دیکھا کہ ہمارے خیمے میں گیس جل رہا ہے چنانچہ وہ ادھر آ گئے۔ کہنے لگے آپ لوگ ابھی تک کیوں کام کر رہے ہیں تو اکرم نے جو عموماً کم بولا کرتے تھے۔ ہماری طرف سے بڑے اعتماد سے ایسا جواب دیا جس سے ایڈجوٹینٹ بہت خوش ہوئے۔

سوال:۔ وہ کیا جواب تھا؟

جواب:۔ اکرم نے کہا تھا۔ سر، آپ نے کہا تھا کل تک کام مکمل ہونا چاہیئے۔ اب جب تک یہ کام مکمل نہ ہو جائے گا ہم سوئیں گے نہیں۔ چنانچہ صبح ساڑھے چھ بجے تک ہم لوگوں نے کام مکمل کر لیا۔ اس لگن سے کام ختم کرنے پر ایڈجوٹینٹ صاحب نے ہمارے سیکشن کی بہت تعریف کی اور چنانچہ جلد ہی انٹیلی جنس سیکشن میں اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر اکرم کو تنخواہ میں اضافے کے بغیر لانس نائیک بنا دیا گیا۔ اس اعزازی ترقی پر ہم سب نے اکرم کو خلوص دل سے مبارکباد دی۔ اس میں کوئی شک نہیں وہ ہر طرح اس اعزاز کے مستحق تھے۔

سوال :۔ اس کے بعد؟

جواب :۔ جنگی مشق سے واپس آنے کے بعد اکرم نے سپاہی سے لانس نائیک پروموشن کیڈر کیا۔

سوال : اس کیڈر کی کچھ تفصیلات بتائیے ؟

جواب :۔ یہ کیڈر ایک مہینے کا تھا۔ اس میں ۲۸ لڑکے تھے۔

سوال :۔ کیڈر انسٹرکٹر کون تھا؟

جواب :۔ حوالدار میجر محمد زر جو آنریری کیپٹن ہو کے ریٹائر ہوئے۔

سوال :۔ اور افسر انچارج ؟

جواب :۔ کیپٹن عاشق حسین ملک۔

سوال :۔ اس ٹریننگ میں اکرم کی کارکردگی کا معیار کیا رہا؟

جواب :۔ اکرم اس کیڈر میں دوسرے نمبر پر پاس ہوتے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء کے شروع میں اکرم کو باتنخواہ لانس نائیک بنا دیا گیا۔

سوال :۔ پھر؟

جواب :۔ اس کے بعد تین مہینے کے لئے ہم دونوں کو باہر جانا پڑا۔ ہیڈ سلیمانکی پر میجر منصب دار کی کمان میں جو کمپنی متعین تھی۔ وہاں انٹیلی جنس کے نمائندے کے طور پر اکرم کو اور مجھے دیدبان کی حیثیت سے مامور کیا گیا تھا۔ ہم وہاں تین ماہ رہے۔

سوال :۔ اس زمانے کی کوئی خاص بات؟

جواب :۔ کوئی خاص بات تو نہیں سوائے اس کے اکرم نے حسب عادت اس کام کو بھی بڑے شوق اور جفاکشی سے ادا کیا۔

سوال :۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد؟

جواب :۔ ہیڈ سلیمانکی سے واپس آنے کے بعد اکرم نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر بہاولپور میں آفیسرز معیار کا میپ ریڈنگ کا امتحان پاس کیا۔ یہیں سے کچھ دنوں بعد انہوں نے آرمی

اسپیشل پاس کیا اور کمیشن کی باقاعدہ تیاری کی۔

سوال:۔ باقاعدہ کا کیا مطلب ؟

جواب:۔ باقاعدہ سے میرا مطلب یہ ہے کہ کمیشن کی عام تیاری تو انہوں نے ۱۹۵۷ء میں انٹیلی جنس کیڈر کرنے کے فوراً بعد انٹیلی جنس سیکشن میں آتے ہی شروع کر دی تھی۔ ہر وقت ان کے ہاتھ میں ایک کتاب اسٹینڈرڈ جنرل نالج ہوتی تھی۔ اسی کو پڑھتے رہتے تھے۔ اس پر ہم نے ان کا نام کے جی، جی کے رکھ دیا تھا۔

اکرم کی یہ ایک دلچسپ عادت تھی یار دوستوں کی محفل میں ایک آدھ بات ہنسی مذاق کی کہنے کے بعد ایک دم اسٹینڈرڈ جنرل نالج کے مطالعہ میں ڈوب جاتے اور ایسے محو نظر آتے جیسے اس تمام گفتگو سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

سوال:۔ ابھی آپ نے اکرم کے مذاق کرنے کی بات کی، کیا کبھی ہنسی مذاق بھی کرتے تھے ؟

جواب:۔ کیوں نہیں۔ بے تکلف دوستوں میں خوب گپ شپ ہنسی مذاق کرتے تھے۔ لیکن ذرا محتاط طریقے سے۔

سوال:۔ پھر کمیشن کی تیاری کا کیا بنا ؟

جواب:۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے پہلی بار کمیشن کے لئے امتحان دیا تو ناکام ہوئے۔ اس ناکامی سے اکرم بہت دل برداشتہ ہوئے تھے۔ اس حد تک کہ ہمیں اندیشہ ہوا تھا کہ وہ کہیں کچھ کر نہ بیٹھیں۔ جو کچھ میں نے کہا سنا وہ تو خیر کہا ہی تھا۔ انٹیلی جنس حوالدار عاشق علی نے انہیں تیاری کا بھرپور موقعہ دیا تھا۔ اب ناکامی پر انہوں نے ان کی بہت دلداری کی۔ ہمارے ایڈجوٹنیٹ کیپٹن عاشق حسین ملک اکرم پر خاص طور پر مہربان تھے۔ انہوں نے بھی ان کو کافی حوصلہ دیا اور دوبارہ کوشش کرنے کی تلقین کی۔ انٹیلی جنس سیکشن کے تمام اسٹاف نے اکرم کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ ان سے روزمرہ کا کام بھی چھڑوا دیا اور کہا تم یکسوئی سے کمیشن کی تیاری کرو۔ یہ چھوٹا موٹا کام ہم کر لیں گے۔ چنانچہ

اکرم نے کمیشن کے لئے دوبارہ تیاری شروع کی۔ اس زمانے میں، پنجاب میں ایک نئے بےحد درجہ سمارٹ اور کامیاب افسر آئے تھے۔ لیفٹیننٹ مظہر حسین شاہ (جو ۶۵ء میں شہید ہوئے) انہوں نے بھی کمیشن کے لئے تیاری میں اکرم کی مدد کی۔ مختصر یہ کہ اکرم نے دوبارہ امتحان دیا اور خدا کے کرم سے اس بار وہ کامیاب ہوئے۔

سوال:۔ اس زمانے کی کوئی خاص یاد آپ کے ذہن میں ہے؟

جواب:۔ امتحان کے لئے اکرم کو ڈیرہ نواب اسٹیشن کی طرف جانا تھا۔ نذر حسین نے ان کا سامان اسٹیشن پر پہنچانے کی حامی بھر لی۔ چنانچہ وہ ٹرک وغیرہ لے کر اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ اور میں انہیں اپنے گھر لے گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ کھانے کے بعد میں اکرم کو لے کر اسٹیشن آجاؤں گا۔ چونکہ جب ہم گھر پہنچے اور کھانا آیا تو اکرم نے دو ایک لقمے کھاتے ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے کہا کیا بات ہے اکرم؟ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ کیا پسند نہیں آیا؟ اکرم نے کہا۔ یار یہ بات نہیں۔ کھانا تو بڑے مزے کا ہے۔ لیکن۔ لیکن کیا۔ میں نے پوچھا۔ اس پر اکرم تقریباً آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے۔ محرم! میں سوچتا ہوں، اگر میں دوبارہ فیل ہو گیا تو پھر اس گھر میں قدم رکھنے اور بہن کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اللہ مالک ہے۔ یہ تمہارا گھر ہے جب چاہو آؤ۔ جو چاہو کھاؤ پیو۔ لیکن اکرم کی اداسی نہ گئی۔ انہوں نے کچھ نہ کھایا اور اسی طرح اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ جاتے وقت اتنا کہا۔ بہن سے کہو میرے لئے دعا کریں۔ اکرم جب آئی۔ ایس ایس بی کوہاٹ سے واپس آئے تو ہماری یونٹ بنگال جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ابھی ہم ڈیرہ نواب سے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ اکرم کی کامیابی کی خبر آگئی تھی۔ لیکن چونکہ کال اپ نوٹس نہیں آیا تھا۔ اس لئے اکرم بھی پلٹن کے ساتھ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ ہم لوگ ابھی ڈھاکہ پہنچے ہی تھے کہ تقریباً ہفتے کے اندر اطلاع آگئی کہ جلد پی۔ ایم۔ اے کاکول پہنچو۔ یہ ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ پلٹن نے اکرم کو بڑے جوش و خروش

سے الوداع کیا۔ باقاعدہ پارٹیاں ہوئیں۔ اکرم کے کمیشن کے لئے منتخب ہونے کی خوشی سب کو تھی۔ اور سب سے زیادہ ان کے ساتھیوں کو۔

سوال :۔ کمیشن کے بعد بھی آپ کی اکرم سے ملاقات ہوتی رہی؟

جواب :۔ اکرم کو ۴ ایف ایف آر میں کمیشن ملا تھا۔ اپنی نئی یونٹ سے انفنٹری کورس کیلئے کوئٹہ جاتے ہوئے وہ اپنی پرانی پلٹن سے ملنے ایک دو دن کے لئے لاہور ٹھہرے وہ چاہتے تو یونٹ کے آفیسرز میس میں قیام کر سکتے تھے۔ لیکن وہ جوانوں کے ساتھ انٹیلی جنس سیکشن میں رہے ہم لوگوں کے ساتھ ہی کھایا پیا۔ اور رہے سہے۔ اس کے بعد جب بھی پلٹن میں آئے تو اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ ہی رہے۔ کئی برس بعد کا قصہ ہے۔ کپتان ہو چکے تھے وہ اپنے بھائی حفیظ کے کمیشن کے سلسلے میں پنڈی آئے تو حفیظ کو اپنے عزیزوں میں ٹھہرا کر سیدھے میرے کوارٹر میں آئے۔ میرا مکان چھوٹا تھا۔ بیٹھک میں بھی صندوق وغیرہ پڑے تھے کوئی خاص جگہ نہیں تھی۔ لیکن انھوں نے اصرار کیا کہ میں اسی کمرے میں ٹھہروں گا۔ میں نے صندوق وغیرہ ہٹا کر تھوڑی سی جگہ بنا دی۔ انہوں نے ایف ایف آر کی وردی اتار کر کھونٹی پر ٹانگی اور مجھ سے کہا محرم یار اس پر کپڑا ڈال دو تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے میں کون ہوں۔ آج مزے سے گپ کریں گے۔ اور دیکھو جو پکا ہو وہ لے آؤ۔ تکلف نہ کرنا۔ پھر گھنٹوں پرانی باتیں ہوتی رہیں۔ ان کے ایک دوست تھے۔ میجر رمضان وہ اکثر گلہ کرتے آپ آتے ہیں تو ہمارے ساتھ میس میں نہیں ٹھہرتے۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا میں اپنے پرانے سنگی ساتھیوں میں زیادہ خوش رہتا ہوں۔ ان لوگوں کی دعاؤں اور کوششوں سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ ان کو کیسے چھوڑ دوں۔

۸ پنجاب میں اکرم نے یونٹ ایجوکیشن انسٹرکٹر کا پری ٹریننگ کورس کیا تھا۔ اس سلسلہ میں اے۔ ای۔ سی کے صوبیدار میجر فتح محمد سے ہماری یہ گفتگو ہوئی۔

صوبیدار میجر فتح محمد سے انٹرویو

سوال :۔ فتح محمد صاحب! آپ کی ملاقات اکرم شہید سے کب اور کہاں ہوئی تھی؟

جواب :۔ ۱۹۵۹ء میں ۱۰۵ بریگیڈ میں ایجوکیشن جے سی او تھا۔ یہ بریگیڈ ان دنوں بہاولپور میں ڈیرہ نواب صاحب صادق آباد میں تھا۔ اس بریگیڈ کی ایک یونٹ ۸ پنجاب میں اکرم لانس نائیک تھے۔ انہوں نے ایک مہینہ میری نگرانی میں یونٹ ایجوکیشن انسٹرکٹر کا پری ٹریننگ کورس کیا تھا۔ اس دوران میں نے اکرم کو پہلی بار قریب سے دیکھا اور سمجھا۔

سوال :۔ اس پری ٹریننگ کورس میں ان کی کارکردگی کیسی تھی؟

جواب :۔ بہترین اس ابتدائی کورس میں انہوں نے پہلی پوزیشن لی تھی۔ بعد کو انہوں نے یہ یو ای آئی کورس اسکول آف آرمی ایجوکیشن مری سے کیا۔ ۱۹۵۹ء کے پی۔ اے۔ او میں ان کا رزلٹ دیکھا جا سکتا ہے۔

سوال :۔ اس زمانے کا آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب :۔ ۸ پنجاب میں اکرم، اکرم کے جی کے نام سے مشہور تھے (کے، جی کا اشارہ ملٹری کالج کی طرف تھا) اور اپنے دائرے میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ اخلاقی لحاظ سے خاص طور سے ممتاز تھے مزاج شگفتہ تھا۔ اپنی نرم خوئی، محنت اور دیانت داری کی وجہ سے یونٹ میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔

سوال :۔ اکرم سے آپ کی ملاقات کب ہوئی۔

جواب :۔ میری بدقسمتی سے ان سے میری ملاقات پھر نہ ہو سکی۔ گو حال ہی میں ان کے بارے میں بہت کچھ سنتا رہا ہوں۔

سوال :۔ وہ کیا؟

جواب :۔ میرا بیٹا کیپٹن محمد زبیر ۱۲ سندھ رجمنٹ میں ایجوٹینٹ ہے۔ اس کے کمانڈنگ افسر

لیفٹیننٹ کرنل مشتاق میجر اکرم شہید کے پی۔ایم۔اے کے ساتھی ہیں۔ وہ اکرم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔

سوال:۔ کوئی اہم بات؟

جواب:۔ یہ کہ جب اکرم پی۔ایم۔اے میں جی سی تھے تو کبھی کبھی کہتے تھے کہ اگر میں نے کبھی لڑائی میں حصہ لیا تو دنیا یاد رکھے گی۔

۸ پنجاب میں اکرم کے ایک اور ہم عصر صوبیدار میجر عبداللہ اے۔ایم۔سی تھے۔ ہماری ملاقات ان سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ میجر اکرم کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ ہم دونوں نے ۸ پنجاب میں ایک ساتھ نوکری کی ہے۔ ہم نے کہا سبحان اللہ۔ ہمیں تو ایسے لوگوں کی تلاش ہے جو اکرم کی زندگی کے کسی دور یا کسی پہلو پر کچھ روشنی ڈال سکیں عبداللہ صاحب سے انٹرویو تو ہم نہ لے سکے۔ ہماری استدعا پر انہوں نے اپنے تاثرات لکھ کر بھیج دیئے۔ عبداللہ صاحب لکھتے ہیں۔

میجر اکرم شہید نشان حیدر کے ساتھ گزرے چند روز

۱۹۵۶ء اوائل کے دن تھے۔ ۸ پنجاب (سابقہ ۱/۱۴ پنجاب رجمنٹ) ڈیرہ نواب صاحب (بہاولپور) پہنچی۔ گرمیوں کا موسم تھا ایک روز دوستوں کے ہمراہ شام کے وقت نہر میں جاکر نہانے کا پروگرام بنا۔ راستے میں ایک ٹولی نہا کر واپس آرہی تھی کہ ہم میں سے ایک ساتھی نے آنے والی ٹولی میں سے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا کہ یہ لڑکا حال ہی میں پلٹن میں آیا ہے اور خاصا پڑھا لکھا ہے۔ ہاکی اچھی کھیلتا ہے اور اسی کمپنی میں پوسٹ ہوا ہے۔ میں نے غور سے نو وارد کو دیکھا جو اپنی جوانی کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ نکلتا ہوا قد، پروقار چال اور چہرے پر سنجیدگی۔ یہ تھے ہمارے سپاہی اکرم جو بعد ازاں پلٹن میں "اکرم کے جی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور ۱۹۷۱ء میں وطن عزیز کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرکے نہ صرف

شہادت کا رتبہ پایا۔ بلکہ بہادری کا اعلیٰ ترین اعزاز نشان حیدر حاصل کیا۔

یوں تو میں اور اکرم شہید ایک ہی پلٹن میں تھے۔ لیکن کمپنیاں مختلف ہونے کی وجہ سے ملنا جلنا کم ہی رہتا تھا البتہ مجھے کچھ موقعوں پر شہید کے ہمراہ رہنے کا اتفاق ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اکرم شہید، راقم، سپاہی سید غلام اکبر شاہ اور سپاہی مرزا خان لاہور میں آرمی اسپیشل کا امتحان دینے لگے۔ اکرم شہید آرمی سپیشل چونکہ ملٹری کالج میں پاس نہ کر پائے تھے۔ اس لئے ان کے لیے یہ امتحان پاس کرنا ضروری تھا۔ اس کے بعد ہی وہ کمیشن کے لئے موزوں قرار دیئے جا سکتے تھے۔ گویا یہ ان کی بنیادی ضرورت تھی۔ باقی ہم تینوں میٹرک پاس تھے۔ بس شوقیہ امتحان دینے چل نکلے۔ امتحان دینے میں دلچسپی کم تھی اور لاہور کو گھوم پھر کر دیکھنے کی خواہش زیادہ۔ لاہور میں ہم لوگوں کا قیام مختصر سا تھا لیکن اس قیام کے دوران اکرم شہید اور میں داتا صاحب کے دربار اکثر جایا کرتے تھے۔ اکرم داتا کے بے پناہ معتقد تھے۔ داتا صاحب کی شخصیت اور ان کی دینی خدمات کے بارے میں وہ خاص معلومات رکھتے تھے۔

دوسری بار ۱۹۵۹ء کے اوائل میں اکرم شہید اور میں ایک رَدِ امتحان (آفیسر سلیکٹڈ میپ ریڈنگ) کے موقعہ پر بہاولپور میں ایک ساتھ رہے وہاں تحریری امتحان ہوا ہم دونوں کامیاب ٹھہرے۔ دوسرے روز آؤٹ ڈور ٹیسٹ کے لئے باہر گئے۔ ٹیسٹ کے دوران ایک پوائنٹ پر ممتحن اور اکرم شہید میں بحث شروع ہوگئی۔ اکرم کہتے میں درست ہوں اور ممتحن کو تو درست ہونے کا حق پہنچتا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ اکرم رہ گئے۔ یہ امتحان انہوں نے غالباً بعد ازاں پی۔ ایم۔ اے جا کر پاس کیا۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ نمایاں ہوا کہ شہید آسانی سے شکست قبول کرنے والے نہ تھے اور آخر کار مشرقی پاکستان میں ھلی کے مقام پر اکرم شہید نے یہ بات درست ثابت کر دکھائی۔

۱۹۵۹ء کے آخر میں مجھے اکرم شہید کے ساتھ یو۔ ای۔ آئی کورس کرنے کا اتفاق ہوا۔ پہلے روز جب ایرٹوپہ پہنچے تو سامان اٹھا کر اوپر اپنی بیرکوں میں پہنچانا بڑا کٹھن کام تھا۔ اکرم اور میں نے مل کر اپنا سامان وہاں تک پہنچایا۔ اتنی دیر میں چائے کا بلاوا آیا۔ سب لوگ اپنے اپنے مگ لے کر چائے لینے چل دیئے۔ اکرم مجھ سے جونیئر سپاہی تھے میرا کپ بھی لے گئے اور لاکر مجھے چائے تھما دی۔ سردیوں کا موسم ہو یا گرمیوں کے دن، مری میں چائے کچھ زیادہ ہی اچھی لگتی ہے۔ خیر چائے بڑے مزے لے کر پی۔ تھکاوٹ اور ٹھنڈک نے چائے کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ جب میں چائے ختم کر چکا تو کیا دیکھتا ہوں۔ مگ کی تہہ میں چائے کی باقیات میں ایک عدد ٹڈی تیر رہی ہے چائے کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ اکرم بھی میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ "دیکھو میاں! میرے مگ میں تو ٹڈی برآمد ہوئی"۔ شہید بڑے خوشگوار موڈ میں تھے کہنے لگے۔ بھائی ٹڈی ہی نکلی ہے نا۔ ٹڈی دل تو نہیں نکلا۔ اور اگر ٹڈی دل بھی نکل آتا تو ہم اس کی اچھی طرح خبر لیتے۔ اور واقعی اکرم نے ہلی کے میدان جنگ میں دشمن کے ٹڈی دل کی خوب خبر لی۔ دیکھئے ہنسی مذاق میں کہی ہوئی بات کی تکمیل کب کہاں اور کیسے ہوئی۔ اللہ اللہ۔ کورس کے دوران شہید نے بڑی محنت کی۔ انہیں فقط اپنے کام سے کام تھا۔ سنجیدہ مزاج تو وہ تھے ہی۔ کسی فضول بیٹھک میں نہ بیٹھتے زیادہ وقت کورس کی کتابیں پڑھتے یا ہاکی کھیلتے۔ محنت کے بل بوتے پر اچھے نمبروں سے پاس ہوئے غالباً ان کا رزلٹ + اے وائی تھا۔

کمیشن کی طرف پہلا قدم

آدمی جو ہوتا ہے وہ ہر جگہ وہی ہوتا ہے اکرم نے پانچویں درجے میں اپنے ایک استاد غلام نبی صاحب سے کہتا تھا۔ "جناب میرا اندر سے جی چاہتا ہے کہ میں کچھ کروں کچھ بنوں"۔ کچھ کرنے کا شوق، آگے بڑھنے کی امنگ، راستے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کی تمام رکاوٹوں کے باوجود اس اکرم کے اندر اب بھی موجود تھی۔ جو سپاہی کی حیثیت سے ۸ پنجاب میں شامل ہوا تھا۔ سب سے بڑا اور پہلا مرحلہ تو آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کرنا تھا۔ یہ امتحان پاس کئے بغیر وہ کمیشن کے لئے درخواست نہیں دے سکتے تھے ایک انفنٹری یونٹ میں پڑھنے لکھنے کا جو وقت اور موقعہ ایک سپاہی کو مل سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن وہ جو مثل ہے ہمت مرداں مدد خدا۔ اس کے مصداق اکرم کے سچے ذوق وشوق اور پر خلوص محنت نے تپتی ہوئی دھوپ میں بھی ان کے لئے کچھ چھاؤں کا انتظام کر دیا۔

اس سلسلے میں بریگیڈیئر عاشق حسین لکھتے ہیں۔

میں کالج کے زمانے میں بھی اکرم کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ لیکن زیادہ نہیں۔ ان کا ہاؤس اور تھا میرا اور۔ پی ٹی پریڈ کے علاوہ مسجد میں یا کالج کے فنکشنوں میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ بہت جونیئر تھے اس لئے کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔

اکرم سے میرا ایک لحاظ سے خاص تعلق بہت بعد کو ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ جب ڈیرہ نواب شاہ میں وہ ۸ پنجاب میں آئے، میں اس وقت اس پلٹن کا ایجوٹینٹ تھا۔ میں اکرم کو پہچانتا تو تھا۔ میں نے دیکھا اکرم بہت الگ تھلگ چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک روز میں نے اکرم کو اپنے دفتر میں بلایا۔ اور کہا۔ تم اپنی تعلیم میں دلچسپی لو۔ اور آرمی اسپیشل کے امتحان کی تیاری کرو۔ میں نے وعدہ کیا میں تمام ضروری سہولتیں فراہم کروں گا۔ اکرم نے اپنے شوق کا اظہار کیا تو میں نے اکرم کو پلٹن کے ایجوکیشن جی۔ سی۔ او کی نگرانی میں دے دیا اکرم کو ایک منصوبے کے تحت یونٹ کے انفارمیشن روم کا انچارج بنا دیا گیا۔ تاکہ انہیں کتابیں اور اخبار وغیرہ پڑھنے کا موقع اور وقت ملے اور آرمی اسپیشل کی تیاری کر سکیں۔ اکرم میں ایک غیر معمولی خوبی تھی کہ وہ دھن کے پکے تھے۔ خواہ کتنی ہی مشکلات ہوں جس کام پر وہ ہاتھ ڈال دیں وہ اسے کر کے چھوڑتے تھے۔ آرمی اسپیشل کی پرائیویٹ

تیاری کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی ہمت اور غیر معمولی کوشش سے یہ امتحان پاس کر لیا۔ اور وہ بھی پہلی کوشش میں۔ اس وقت تک ان کے اندر خاصی خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اکرم سے کہا اب ریگولر کمیشن کے لئے درخواست دو۔ چنانچہ انہوں نے درخواست دی اور تحریری امتحان اور آئی ایس ایس بی کے لئے تیاری شروع کر دی اس مرحلے میں میں مشق کے طور پر تحریری کام دینے لگا۔ جو وہ شوق سے کرتے تھے۔ میں اکثر انفارمیشن روم میں اکرم سے ملتا اور حالات حاضرہ میں تبادلہ خیالات کرتا۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی جھجک دور ہو، اور انگریزی بولنے کی مشق ہو۔ اکرم نے پوری تندہی سے تیاری کی اور جب سلیکشن بورڈ کے سامنے گئے تو کامیاب قرار دیئے گئے۔ جب ان کا پی۔ ایم۔ اے جانے کے لئے کال نوٹس جی۔ ایچ۔ کیو سے آیا تو میں نے انہیں اپنے دفتر میں بلایا اور یہ خوشخبری انہیں سنائی۔ تھینک یو سر کہا اور خاموش ہو گئے۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں تشکر اور خوشی کے آنسو تھے۔ چند لمحوں کے بعد بولے یہ سب اللہ کریم کا کرم ہے۔ ورنہ میں اس قابل نہ تھا۔ یہ سب اس کی مہربانی ہے۔ اب اللہ نے جو موقعہ دیا ہے۔ اور آپ نے جو اعتماد کیا ہے انشاء اللہ میں اسے نبھاؤں گا۔

آخر میں یہ بھی بتا دوں کہ میں نے اکرم کی کوچنگ کے لئے لیفٹیننٹ منظر حسین شاہ (۲۳ ، ۱۷) کو مقرر کیا تھا۔ وہ کمیشن کے لئے تیاری میں اکرم کی مدد کیا کرتے تھے۔ منظر ملٹری کالج میں اکرم کے ہم سبق بھی تھے۔ منظر ۶۵ء کی جنگ میں شہید ہوئے۔

ایک دلچسپ حادثہ

اکرم کے آئی ایس ایس بی کوہاٹ سے واپس آنے اور اس میں کامیابی کی باقاعدہ اطلاع آنے کے درمیان جو حادثہ ہوا اس کی روئیداد میجر عبداللہ صاحب سناتے ہیں۔

تحریری امتحان کا مرحلہ طے ہوا تو اکرم آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی کا امتحان دینے کوہاٹ

روانہ ہوتے روانگی سے پہلے میں نے کہا کہ لاہور میں داتا دربار ضرور جانا کہنے لگے ضرور حاضری دوں گا۔ ہفتے عشرے بعد جب ان کی واپسی ہوئی تو احباب بڑے اشتیاق سے ملنے لگے میں نے دیکھا کہ اکرم کے چہرے پر رونق نہیں بات کھلی تو معلوم ہوا کہ اکرم آئی۔ ایس ایس۔ بی کلیئر نہیں کر سکے۔ اور قابل افسوس اور تشویش ناک امر تھا کہ ان کا آئی۔ ایس ایس۔ بی کا یہ آخری چانس تھا ہم سبھی افسردہ تھے۔ میں نے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں اگر سینئر کمیشن نہیں مل سکا تو دل چھوٹا مت کرو جونیئر کمیشن کے لئے آپ فٹ ہیں اے ای سی میں آجانا لیکن شہید بہت دل برداشتہ تھے۔ پھر میں نے استفسار کیا کہ جاتے وقت داتا دربار گئے تھے کہنے لگے ہاں یار گیا تھا لیکن داتا بھی بچھڑ گئے۔ میں نے انہیں مزید تسلی دی کہ فکر نہ کریں۔ اللہ کارساز ہے۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی کہنے لگے۔ ہمت ہارنا میری عادت نہیں۔ بس مجھے یقین نہیں آرہا۔ دل نہیں مانتا۔ میں نے بھرپور کوشش کی تھی۔

کچھ دن گزرے تو معلوم ہوا کہ اکرم پی۔ ایم۔ اے کے لئے منتخب ہو گئے ہیں۔ سرکاری اطلاع آگئی ہے۔ یقین نہیں آرہا تھا فوراً اکرم کی کمپنی میں جا پہنچا۔ دیکھا تو یار لوگ جمع ہیں۔ محفل گرم ہے۔ بلکہ ایک ہنگامہ برپا ہے۔ اکرم دولہا بنے بیٹھے ہیں اور تھوک کے حساب سے مبارک بادیاں وصول کر رہے ہیں میں نے بھی مبارک باد عرض کی اور کہا کہو برخوردار۔ داتا پہنچے کہ نہیں؟ کہنے لگے "ہاں بھئی مان گیا داتا کو"

بعد کو تحقیق سے پتہ چلا کہ آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی میں اکرم شہید کے گروپ میں ان کا ایک اور ہم نام بھی تھا۔ اس وجہ سے اتفاقاً کوئی کاغذی غلطی ہو گئی بعد کو اس کاغذی غلطی کا ازالہ کر دیا گیا۔

ایک اہم تحریر

۸ پنجاب میں جب اکرم کمیشن کے لئے تیاری کر رہے تھے تو انگریزی میں مضامین لکھنے کی مشق بھی کیا کرتے تھے۔ اس مشق کے دوران انہوں نے انگریزی میں ایک مختصر مضمون لکھا۔ مائی اولڈ کالج "۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکرم کے دل میں ملٹری کالج کی کتنی جگہ تھی اور وہ کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس مضمون کا آخری فقرہ ہے : ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملٹری کالج ملک کا بہترین ادارہ ہے تبرک کے طور پر ہم مضمون کی فوٹو اسٹیٹ کاپی منسلک کر رہے ہیں فن تحریر شناسی کا کوئی ماہر نہ بھی ہو تو بھی بتا سکتا ہے کہ یہ تحریر جس ہاتھ کی ہے وہ ارادے کا پکا اور استوار شخصیت کا مالک ہے۔

---

6. June. 61

MY OLD COLLEGE

The last College I attended is military College Jhelum. It is situated at Sarai alam gir, two miles from Jhelum on G.T. road in Gujrat distt. It was establish in 1922. At the begining the main aim of this College was to teach the children of Servicemen and make them good soldiers. It was a school till 1955, when its Standard was raised to College. It is one of the best Colleges in the Country. Soon after the birth of Pakistan the aim of the College was changed as to produce good officers for Pakistan Army. It was a very great responsibility but by dint of hard work and Continuous struggle our college proved equal to the task. The College Consists of four houses, namely Birdwood, Auchinleck, Kabul and Kasim. Our Staff is very efficient. Most of the instructors are from Army, still we have quite a good number of professors also. If we see the result of Matric and FA Examination, we find that it tops the list for the last few years. There is every facility for all kinds of games. Our hockey & foot Ball teams are quite up to the standard. We have a very good laboratory and library. We lead all other Colleges in Drama. To sum up, we can say that Military College is the best institution in the Country

اکرم پی-ایم-اے میں

پی-ایم-اے جانے سے پہلے اکرم ۸ پنجاب کے ساتھ کچھ دنوں مشرقی پاکستان میں بھی رہے۔ وہاں سے آکر اکتوبر ۶۱ء میں پی-ایم-اے ۲۸ لانگ کورس کے لئے داخل ہوئے پی-ایم-اے میں جاتے ہی انہوں نے ایک کھلاڑی کی حیثیت سے اپنی جگہ بنالی- وہ- پی ایم-اے کی ہاکی ٹیم میں لے لئے گئے۔ اور اس حیثیت سے انہوں نے دوبار انٹر اکیڈمی اسپورٹس میں پی-ایم-اے کی نمائندگی کی- ایک بار پی-اے-ایف اکیڈمی رسالپور میں اور دوسری بار پی-این اکیڈمی کراچی میں اور دونوں بار کامیاب لوٹے۔

پی-ایم-اے میں اکرم کے شب و روز کے بارے میں لیفٹیننٹ کرنل منیر افضل پراچہ (کالج نمبر ۲۲۶۲) لکھتے ہیں۔

اکرم ۲۸ پی-ایم-اے میں میرے ہم نصاب تھے۔ لیکن کمپنی علیحدہ علیحدہ تھی۔ وہ صلاح الدین کمپنی میں تھے۔ جبکہ میں قاسم کی کمپنی میں تھا۔ لیکن ملٹری کالج کے رشتے سے ان سے یک گونہ تعلق تھا۔ اکرم کے کمپنی کمانڈر میجر محمد اشرف تھے اور پلاٹون کمانڈر کیپٹن سکندر خان۔ اکرم کا ریکارڈ تو آخری ٹرم میں بنے تھے۔ لیکن ہاکی اور نشانہ بازی میں پہلے ٹرم ہی سے نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ کمپنی اور اکیڈمی کی ہاکی ٹیم میں بیک کھیلتے تھے اور بڑے جم کر کھیلتے تھے۔

اکرم طبعاً بہت کم گو ضرور تھے لیکن کم احساس نہیں تھے۔ ملٹری کالج کے اولڈ بوائز کا جو بھی اجتماع ہوتا وہ اس میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ عموماً ایسے اجتماع پاسنگ آؤٹ کے موقعہ پر ہوتے تھے۔ جب کالج سے لڑکے اور اسٹاف ممبر آئے ہوتے ہوتے۔

پی-ایم-اے میں فائیٹنگ پٹرول کی مشق خاصی مشکل صبر آزما ہوتی ہے۔ ہر شخص پر جسمانی اور اعصابی دباؤ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ عموماً کوئی کسی کی مروت نہیں کرتا۔ لیکن اس موقعہ پر اکرم فراخ دلی سے اپنے ساتھیوں کی مدد کرتے تھے۔ اس لئے ہر ایک کی

کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ اکرم کے گروپ میں ہو۔ جب لمبی مشقوں سے ہم لوگ واپس آتے تو تھکے ہوئے ہوتے تھے۔ بڑے بڑے شگفتہ مزاج منہ لٹکائے نظر آتے۔ لیکن اکرم کے چہرہ پر وہی مانوس اور کشادہ مسکراہٹ نظر آتی جو ان کی شخصیت کا ایک حصہ بن چکی تھی۔

اکرم کے ایک اور ہم نصاب لیفٹیننٹ کرنل عبدالرحیم کالج نمبر (۱۹۶۱) نے اکرم شہید کے بارے میں کہا۔

ملٹری کالج میں بھی، میں اور اکرم آکنلک ہاؤس میں کچھ عرصے ساتھ رہے تھے۔ لیکن پی ایم اے میں مجھے ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کا زیادہ موقعہ ملا۔ وہ صلاح الدین کمپنی میں تھے اور میں قاسم کمپنی میں۔ لیکن پھر بھی اکثر ملنا ہوتا رہتا تھا۔ کالج کے رشتے سے ایک دوسرے سے مانوس بھی تھے۔ پی ایم اے کے دو ڈھائی سال کے عرصے میں صرف ایک بار میں نے انہیں جلال میں دیکھا۔

یہ ۱۹۶۲ء یا شروع ۱۹۶۳ء کی بات ہے کنٹین میں ہم چند پرانے دوست بیٹھے بھارت سے جنگ کے امکانات پر باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے بھارت کی افرادی قوت، جنگی تیاریوں اور جنگی صلاحیتوں کا تذکرہ اس انداز سے کیا جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ دشمن کا مقابلہ کرنا سخت کام ہوگا۔ اکرم بحث میں شریک نہیں تھے۔ لیکن یہ سنتے ہی وہ پھٹ پڑے۔ اور پھر انگریزی میں شروع ہو گئے بار بار کہتے تھے یہ اگر حقیقت بھی ہو تو اس کا اس طرح اظہار تمہارے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔

یہ قومی حمیّت کے منافی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ حقیقت بھی ہے تو اس کے باوجود میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں۔ ہم باآسانی دشمن سے لڑ سکتے ہیں اور جیت سکتے ہیں لڑائی میں لڑنے کا حوصلہ کام آتا ہے۔ فوج کی تعداد یا ہتھیار نہیں۔

اپنے ملک اور قوم کے خلاف کوئی بات سننے کے روادار نہیں ہوتے تھے۔ وہ کسی حقیقی خامی کو بھی ماننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ پاکستان سے محبت کے معاملے وہ قطعًا انتہا پسند

تھے۔ اس واقعہ سے مجھے اندازہ ہوا کہ اکرم کی قومی عصبیت۔ ان کی مذہبی عصبیت سے کم شدید نہیں تھی۔ اور یہ بھی بالواسطہ طور پر ملٹری کالج کا فیضان تھا۔

جس محفل میں کرنل رحیم نے اکرم کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا وہاں کالج کے دو اولڈ بوائز اور اکرم کے پی ایم اے کے ساتھی لیفٹیننٹ کرنل محمد افسر (۲۰۶۷) اور لیفٹننٹ کرنل عبدالغفار (۲۱۵۵) بھی موجود تھے۔ کرنل غفار نے کہا۔

لیفٹ آؤٹ ہاکی کھیلنے میں اکرم کا جواب نہیں تھا۔ اکیڈمی کی ٹیم میں شامل تھے۔ انہیں اکیڈمی کا ہاکی کلر بھی ملا تھا۔ اس پر کرنل افسر نے یہ اضافہ کیا۔

ہاکی کے علاوہ نشانہ باز بھی قیامت کے تھے۔ اپنے کورس میں بہترین نشانہ باز قرار دیئے گئے تھے۔

بہترین نشانہ باز کی ٹرافی بھی حاصل کی تھی۔ عہدہ کمپنی سارجنٹ کا تھا۔ لیکن اپنے لمبے قد اور گہرے سانولے رنگ کی وجہ سے سارجنٹ لومبا کے نام مشہور تھے۔ سنجیدہ ضرور تھے۔ لیکن چہرے پر ایک مسکراہٹ سی پھیلی رہتی تھی جو ان کے سانولے چہرے پر بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔

اس مسکراہٹ کا تذکرہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کے ۱۹۶۳ء کے میگزین دی کریسنٹ میں بھی ہے اور مزاحیہ انداز میں لکھا ہے کہ ان کی ہابی جونیئرز کو انٹرویو کرنا ہے۔

جونیئرز کو انٹرویو کرنے میں اتنی زیادہ دلچسپی لینا کہ دوستوں کو فقرہ چست کرنے کا موقعہ ملے۔ اصل میں اکرم کی شخصیت کے ایک خاص پہلو کی غمازی کرتا ہے۔ دنیا میں عام طور پر دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں ایک وہ جو دنیا کو بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ دنیا انسانوں کو بنانے سے بنتی ہے۔ اکرم کی تمام زندگی کچھ نہ کچھ بنانے کرنے میں بیت گئی۔ اپنے آپ کو بنایا بہن بھائیوں کو بنایا پھر ملک کو بنانے میں لگے رہے۔ اور آخر کار اسی کام میں جان دے دی۔ اکرم کا اپنے جونیئرز کو بار بار انٹرویو کرنا ان کو تنگ کرنے کے لئے یا اختیارات

کا مزہ لینے کے لئے نہیں تھا بلکہ جونیئرز کو بنانے کے لئے بدلنے کے لئے تھا۔ جوان کی شخصیت کے عین مطابق تھا۔ پاکستان اکیڈمی میں ان کے پلاٹون کمانڈر نے رائے ظاہر کی تھی کہ یہ جی سی ایک روز زبردست فوجی کارنامے انجام دے گا اور ایسا ہی ہوا۔

اکرم ۴ ایف ایف آر میں

۱۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو اکرم پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہوتے اور بحیثیت سیکنڈ لیفٹیننٹ ۴ ایف ایف آر میں پوسٹ ہوئے۔ ان کی آبائی رجمنٹ پنجاب رجمنٹ تھی۔ اسی سے منتخب ہو کر وہ پی ایم اے آتے تھے۔

بظاہر انہیں پنجاب گروپ ہی میں جانا تھا اور شاید ان کی اپنی خواہش بھی یہی تھی لیکن جیسا کہ خود میجر اکرم نے اپنے استاد غلام نبی صاحب کو بتایا کہ جب ان کے کمانڈانٹ نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کی رجمنٹ ایف ایف میں جائیں تو اس خواہش کو اکرم نے اپنی عزت افزائی سمجھا اور اس رجمنٹ کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان کمانڈانٹ صاحب کی نظر کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ انہوں نے سینکڑوں میں سے وہ سچا موتی چن لیا۔ جس کو ان کی رجمنٹ اور پاکستان کا نام اونچا کرنا تھا۔

جب سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد اکرم ملک ۴ ایف ایف آر سے وابستہ ہوئے تو بٹالین کے ایڈجوٹنٹ میجر اب بریگیڈیئر اے قادر تھے۔ چنانچہ ہم نے اے قادر صاحب سے درخواست کی کہ وہ شروع کے چند سالوں میں ۴ ایف ایف آر میں اکرم کی کارکردگی پر اپنے تاثرات سے آگاہ فرمائیں۔ بریگیڈیئر اے قادر سے ہماری یہ گفتگو ہوئی۔

بریگیڈیئر اے قادر کا انٹرویو

سوال:۔ قادر صاحب اکرم سے آپ کا تعلق کہاں اور کب پیدا ہوا؟

جواب :۔ جب اکرم سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ۴ ایف ایف میں شامل ہوئے تو اس وقت یہ بٹالین لنڈی کوتل میں تھی۔ مئی ۱۹۶۵ء میں جب ایمرجنسی کا اعلان ہوا تو پلٹن کو سیالکوٹ پہنچ کر سرحدی دفاع سنبھالنے کا حکم ملا۔ میں اس وقت ۴ ایف ایف کا میجر کے رینک میں ایڈجوٹینٹ تھا۔ جب ستمبر ۶۵ء میں جنگ شروع ہوئی تو جنگی ضرورت کے مطابق ہیڈ کوارٹر ۱۵ ڈویژن سے فون آیا کہ ایک اچھے افسر کو ڈویژن ہیڈ کوارٹر کے ساتھ رابطہ افسر مقرر کیا جائے۔ اس وقت پلٹن کے سی۔ او لیفٹیننٹ کرنل لطیف تھے۔ (بعد میں لیفٹیننٹ کرنل اب بریگیڈیئر محمد حیات نے یہ ذمہ داری سنبھالی) انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا۔ کیپٹن اکرم کو اس ڈیوٹی کے لئے موزوں سمجھا گیا۔ اس لئے ان کو ۱۵ ڈویژن کے ساتھ رابطہ افسر کی حیثیت سے وابستہ کر دیا گیا۔ لیکن اکرم اپنی پلٹن کے ساتھ فیلڈ میں رہنا چاہتے تھے۔ ادھر پلٹن میں بھی ان کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ جلد ہی ہم نے اپنے ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے درخواست کی کہ اکرم کو پلٹن واپس کر دیا جائے ان کی جگہ دوسرا افسر بھیج دیا جائے گا۔ جب اکرم واپس یونٹ میں آئے تو انہیں ڈی کمپنی کا کمپنی افسر مقرر کیا گیا۔

سوال :۔ اس کمپنی کا کمانڈر کون تھا؟

جواب :۔ ڈی کمپنی کی کمان کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) محمد اعظم کے ہاتھ میں تھی۔ پہلے بھی میں نے اکرم کی تعریف سنی تھی۔ لیکن جنگ کے دوران اکرم کی کارکردگی کا مشاہدہ کر کے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ سنجیدہ صورت نوجوان کپتان بڑے دل گردے کا آدمی ہے اور سچا اور کھرا سپاہی ہے۔ اکرم کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے سے بڑی ذمہ داری اور خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے اور پھر اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتے تھے

سوال :۔ کیا آپ اس امر کی کوئی مثال دینا پسند کریں گے؟

جواب :۔ کیوں نہیں ۱۸ ستمبر ۶۵ء کا واقعہ ہے۔ جبکہ ہماری پلٹن جسڑ کے علاقے میں

دفاعی پوزیشن لئے ہوئے تھی کہ ہیڈ کوارٹر سے اطلاع ملی کہ دشمن کا ایک
ٹینک اسکواڈرن نارووال کی طرف پیش قدمی کرتے دیکھا گیا ہے۔ فوراً اس
کا کھوج لگایا جائے اور سدباب کیا جائے۔ یہ اطلاع بڑی تشویش ناک تھی
اگر خدانخواستہ نارووال دشمن کے قبضے میں چلا جاتا تو ہمارے وہ تمام دستے
جو نارووال سے آگے اہم فوجی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ سپلائی لائن کٹ
جانے سے دشمن کے گھیرے میں آجاتے اور ہماری جنگی حکمت عملی کو سخت نقصان
پہنچتا۔ اس خبر کے ملنے کے بعد ہم نے بھی دیکھا کہ ٹینکوں کا ایک دستہ نارووال
کی طرف گرد اڑاتا ہوا پیش قدمی کر رہا ہے۔ چونکہ دستہ گرد وغبار اڑاتا ہوا دشمن
کی سمت سے آرہا تھا اس لئے گمان ہوتا تھا کہ دشمن ہی کے ٹینک ہیں۔ لیکن چونکہ
جنگی صورت حال کے مطابق دشمن کے ٹینکوں کے وہاں پائے جانے کا امکان نہیں
تھا اس لئے کچھ شبہ بھی تھا۔ لیکن آنکھوں کے سامنے جو تھا اسے جھٹلایا بھی نہیں
جاسکتا تھا۔ بہرحال سخت تشویشناک صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ فوری اقدام
ضروری تھا۔ اتفاق سے اکرم اس وقت پلٹن کی کمانڈ پوسٹ میں موجود تھے کرنل
لطیف نے انہیں کو حکم دیا کہ فوراً ریکی پٹرول لے جائیں اور بٹالین ہیڈ کوارٹر
کو صورت حال سے مطلع کریں تاکہ ضروری کارروائی کی جاسکے۔ اکرم نے حکم ملتے ہی
فوراً ایک مختصر پٹرول لیا۔ ایک منصوبہ بنایا اور اس بکتر بند دستے کی طرف بڑھنے
لگے جس کے متعلق گمان نہیں یقین سا تھا کہ دشمن کا دستہ ہوگا۔ دن کی پوری
روشنی تھی۔ میدانی علاقہ تھا۔ دور دور تک ہر چیز صاف نظر آرہی تھی کوئی گھنا
پیڑ وغیرہ یا کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کی اوٹ میں آگے بڑھا جاسکے۔ اکرم ٹینکوں
کے فائر کی براہ راست زد میں تھے۔ لیکن وہ ذرا نہ جھجکے اور ضروری احتیاط کے ساتھ
آگے ہی بڑھتے گئے۔ اور توقع سے بہت پہلے وہ ٹینکوں تک پہنچ گئے۔ بہت قریب

جاکر انہیں پتہ چلا کہ ٹینکوں کی مارکنگ، پاکستانی ہے اور وہ اپنے ہی ٹینک ہیں لیکن انہوں نے اسی پر بس نہ کیا۔ بلکہ جب تک ٹینک کمانڈر سے خود بات نہ کر لی پیچھے نہ لوٹے۔ واضح رہے جب تک انہوں نے اسکواڈرن لیڈر سے خود بات نہ کی تھی۔ قیاس یہی تھا کہ یہ دشمن کا بکتر بند دستہ ہے جس جرأت اور ہمت سے انہوں نے اپنی ذمہ داری کو نبھایا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی ان کی کارکردگی قابل تعریف تھی۔

سوال:۔ اس واقعہ کے علاوہ بھی اکرم نے کسی مہم میں حصہ لیا؟

جواب:۔ اکرم کا دوسرا ایکشن ظفر وال میں ہوا تھا۔ جب ہماری بٹالین ظفر وال میں لڑ رہی تھی تو ایک اطلاع ملی کہ دشمن کا ایک مضبوط دستہ ظفر وال کو چھوڑ کے شکر گڑھ کے قصبہ درمان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ درمان میں ہمارے دستے نہیں تھے۔ اسلئے اعلیٰ ہیڈ کوارٹر سے حکم ملا کہ دشمن کے دستے کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ اس کی تعداد اور قوت کتنی ہے۔ اور اس کا ارادہ کیا ہے۔ اس مہم کے لئے پھر کیپٹن اکرم کو منتخب کیا گیا۔ اکرم اپنے لڑا کا پٹرول کے ساتھ اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ دن میں فائیٹنگ پٹرول کا کام بہت مشکل اور خطرناک ہوتا ہے اکرم نے اس خطرناک مہم کو ایک بار پھر جرأت اور ذہانت سے انجام دیا۔ دشمن سے رابطہ قائم ہونے پر معلوم ہوا کہ دشمن کی تعداد تقریباً ایک بٹالین کے برابر ہے۔ اور اس کا ارادہ درمان پر قبضہ کرنا ہے۔ اکرم نے اپنے فائیٹنگ پٹرول کو پھیلا کر اس طرح فائر کرایا کہ دشمن نے سمجھا کہ ہماری تعداد بہت زیادہ ہے چنانچہ دشمن درمان کے پاس جاکر رک گیا۔ اور اس نے درمان پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ درمان خالی تھا۔ اس طرح اکرم نے دشمن کی ایک بڑی جنگی چال کو محض اپنی جرأت اور جنگی فراست سے ناکام بنا دیا۔ تو یہ تھے وہ دو اہم

کارنامے جو اکرم نے ۱۹۶۵ء ستمبر کی جنگ میں ظفروال سیکٹر میں انجام دیئے۔ میں ان واقعات کا عینی شاہد ہوں۔ میں بٹالین کا ایڈجوٹینٹ تھا۔ اور بٹالین کے کمان ہیڈ کوارٹر میں پہلے لیفٹیننٹ کرنل لطیف پھر لیفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیئر) محمد حیات کے ساتھ ان تمام مہمات کی منصوبہ بندی میں شریک رہا تھا اس سے پہلے کہ میں بات ختم کروں ایک اور بات بھی بتانا چاہتا ہوں۔

سوال :۔ وہ کیا؟

جواب :۔ جنگ میں کھچاؤ کا ہونا لازمی سی بات ہے لیکن اکرم اس دوران میں بھی پُرسکون اور نارمل رہے۔ بڑے سے بڑے خطرے میں بھی ان کے چہرے کی وہ مسکراہٹ نہیں جاتی تھی۔ جو ان کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی۔ اس لڑائی کے دوران کئی بار انہیں اہم اور خطرناک مہمات پر بھیجا گیا۔ ہر بار انہوں نے یہ ذمہ داری شوق سے قبول کی۔ اکرم کے کردار کی یہ خصوصیت تھی کہ جو کام بھی سپرد کیا جاتا ان کے چہرے کی مسکراہٹ میں کمی نہیں آتی تھی۔

قادر صاحب کی اس بات سے کہ جنگ کے زمانے میں ۴ ایف ایف کی کمان لیفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیئر) محمد حیات کے ہاتھ میں تھی۔ بریگیڈیئر محمد حیات (کالج نمبر ۴۸) ستارۂ جرأت ہیں اور ان کا شمار کالج کے ممتاز اولڈ بوائز میں سے ہے۔ ہم نے حیات صاحب کو لکھا کہ ہمیں بتائیں کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اکرم کے تیور کیسے تھے۔ انہوں نے جواباً لکھا۔

"آپ نے بھی کون سی داستان چھیڑ دی۔ ۴ ایف ایف آر کے کارنامے اور اکرم شہید وہ زخم جو خشک ہونے لگے تھے اب پھر ہرے ہو گئے"۔

ظفروال کے معرکے میں ۴ ایف ایف کی ڈی کمپنی نے سب سے آگے مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ اور شدید ہندوستانی حملے کی زد میں تھی۔ اس کمپنی کے کمانڈر میجر (اب لیفٹیننٹ

کرنل) محمود اعظم تھے۔ اکرم کا تعلق بھی اس کمپنی سے تھا۔ میں نے اکرم سے کہا میں فارورڈ کمپنی کے اگلے مورچوں کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ یاد رہے کہ اس وقت کمپنی کے زیر دفاع تمام علاقے پر دشمن کی توپیں اور ٹینک گولے برسا رہے تھے۔ اکرم نے اس شدید گولہ باری کی قطعاً پرواہ نہ کی اور مجھے کمپنی کے پچھلے مورچوں سے ہٹتے ہوئے کمپنی کی انتہائی فارورڈ خندقوں کی طرف لے چلے میں سمجھا کہ شاید اکرم میرا منشا نہیں پا سکے۔ میں نے کہا۔ نوجوان کمپنی ہیڈ کوارٹر کمپنی کی پوزیشن کے درمیان میں کہیں ہوگا۔ اس پر اکرم نے جو انتہائی کم گو اور محتاط تھے بے جھجک کہا سر اس کمپنی کی روایت یہ ہے کہ اس کا کمانڈر جب اس کی کمپنی دشمن کے حملے کی زد میں ہو سب سے اگلے مورچوں میں ہوتا ہے، اور جناب والا میں آپ کو سب سے اگلے مورچے ہی میں لے جا رہا ہوں۔

آخر میں بریگیڈیئر حیات لکھتے ہیں۔ یہ الفاظ اکرم نے جس سکون اور اعتماد سے کہے اس انداز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ چنانچہ ہم اسی طرح توپوں اور ٹینکوں کی گھن گرج میں کمپنی ہیڈ کوارٹر تک پہنچے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں اکرم شہید کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بہنوئی ملک محمد حنیف لکھتے ہیں۔

جب اکرم ۶۵ء کی جنگ کے بعد گھر آئے تو میں نے پوچھا۔ اکرم تم نے جنگ میں کیا کیا؟ انہوں نے کہا۔ اس جنگ میں میں نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ دو چار بار پٹرول پر گیا اور جنگ کے آخری روز ایک سکھ کمانڈر سے نپٹنا پڑا۔ وہ واقعہ یوں ہے۔ ۲۳ ستمبر فائر بندی ہوئی۔ رات کو مقررہ وقت کے بعد ایک سکھ کرنل نے پاکستانی علاقے میں کچھ آگے بڑھنے کی کوشش کی میں نے کہلوا بھیجا اگر اپنی اور اپنے جوانوں کی خیریت چاہتے ہو تو جہاں ہو وہیں ٹکے رہو۔ ایک انچ بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔ چنانچہ وہ آگے نہیں بڑھا۔ اسی موقعہ پر میجر اکرم شہید کی بہن مختار بیگم نے پوچھا، بہت سے افسروں جوانوں کو تمغے

ملے ہیں تمہیں کیا ملا۔ اکرم" اس کا جواب انہوں نے یہ دیا۔

میں نے کچھ نہیں کیا اس لئے مجھے کچھ نہیں ملا۔ لیکن بہن تم دیکھنا جب وقت آئے گا تو وہ کام کروں گا کہ دنیا یاد رکھے گی۔

۶۵ء کی جنگ کے بعد صوبیدار میجر عبداللہ صاحب نے میجر اکرم شہید سے اپنی ملاقات کا حال یوں لکھا ہے۔

۶۵ء کی سترہ روزہ پاک بھارت جنگ ختم ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ اکرم شہید کی پلٹن (۴ ایف ایف) سیالکوٹ گئی ہے۔ ایک دن ۹-۱۰ کے قریب موصوف کو ملنے گیا۔ وہ کمپنی لائن میں بیٹھے ایک انگریزی رسالہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ کمیشن کے بعد میری اور اکرم شہید کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت وہ کیپٹن تھے بڑے تپاک سے ملے میں گھنٹہ بھر ان کے پاس رہا۔ دوران گفتگو وہ کہنے لگے اس لڑائی میں تو مجھے لڑنے کا کوئی خاص موقعہ نہیں ملا۔ میدان جنگ میں دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کی حسرت ہی رہی۔ بہر حال پھر کبھی سہی۔ ٹھیک چھ سال بعد میجر اکرم کو خدا نے وہ موقع بھی فراہم کر دیا۔ جس کی انہیں حسرت تھی۔

کیپٹن محمد اکرم کو اپریل ۱۹۶۷ء میں بٹالین کوارٹر ماسٹر بنا دیا گیا۔ اکرم کی کوارٹری ماسٹری پر تبصرہ کرنے کے لئے ہم نے پھر بریگیڈیر اے قادر صاحب کو زحمت دی۔ انہوں نے کہا۔

کرنل حیات کے بعد بٹالین کی کمان جب میں نے سنبھالی تو اس وقت اکرم بٹالین کے کوارٹر ماسٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بٹالین کی کوارٹر ماسٹری ایک مشکل اور پیچیدہ کام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ اس منصب کے تمام باریک سے باریک قواعد و ضوابط سے پوری طرح باخبر تھے۔ رجمنٹل مسائل سے وہ بخوبی واقف تھے اور انہیں حل کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس کام کو انہوں نے انتہائی دیانت داری، لگن اور تندہی سے انجام دیا۔ یونٹ کے چھوٹے بڑے کسی فرد کو ان سے کبھی کوئی جائز شکایت

نہیں ہوئی۔

بریگیڈیر اے قادر صاحب کا یہ تبصرہ سن کر ہمیں ایک مفکر کا وہ قول یاد آیا۔ کہ آدمی ہر جگہ وہی ہوتا ہے جو اندر سے ہوتا ہے جگہ بدلنے سے آدمی نہیں بدلتا۔ اکرم سچے اور کھرے آدمی تھے۔ میدان جنگ میں بھی اور زمانہ امن میں بھی۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں ہم نے ۴ ایف ایف آر کے موجودہ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل جولین پیٹر کو لکھا کہ وہ دو چار ایسے اصحاب سے ہمیں انٹرویو کرنے کا موقع دیں جن کا اکرم شہید سے ان کی کپتانی کے زمانے قریبی واسطہ رہا ہو۔ انہوں نے ۲۱ ایف ایف کے۔سی۔ او کے تعاون سے حوالدار نواب خان سے ہماری ملاقات کا بندوبست کرایا۔ نواب خان صاحب سے ہماری یہ باتیں ہوئیں۔

حوالدار نواب خان کا انٹرویو

سوال:۔ نواب صاحب آپ کا تعارف؟

جواب:۔ میں ۶۵ء میں ۴ ایف ایف آر میں بھرتی ہوا تھا۔ میجر اکرم (اس وقت کیپٹن) ایف ایف کی ڈی کمپنی کے افسر تھے اور میرے پلاٹون کمانڈر۔ اس طرح وہ میرے پہلے افسر تھے۔ ہماری ڈی کمپنی کے کمانڈر میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) محمود اعظم تھے میں ستمبر ۶۵ء سے دسمبر ۷۳ء تک ۴ ایف ایف کے ساتھ رہا اب ۲۱ ایف ایف سے منسلک ہوں۔

سوال:۔ میجر اکرم سے آپ کا واسطہ کتنے عرصے رہا؟

جواب:۔ جب تک میں ۴ ایف ایف میں رہا کسی نہ کسی طریقے سے ان سے واسطہ پڑتا ہی رہا مجھے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اکرم کی شہادت کے بعد ان کے مورچے سے بٹالین ہیڈ کوارٹر تک جو دو سپاہی ان کی لاش اٹھا کر لائے ان میں سے ایک میں بھی تھا۔

سوال:۔ دوسرا کون تھا؟

جواب:۔ سپاہی محمد یار۔ ہم دو اکرم شہید کی لاش پیچھے اٹھا کر لائے تھے۔

سوال:۔ اس مہم کی تفصیلات تو ہم بعد کو پوچھیں گے۔ پہلے یہ بتایئے ۶۵ء کی جنگ میں آپ نے میجر اکرم کے ساتھ کوئی ایکشن کیا تھا؟

جواب:۔ نہیں۔ میں اس وقت نیا ریکروٹ تھا۔ لڑائی کے بعد مجھے انہیں زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ۶۷ء میں جب وہ انٹیلی جنس کورس کے لئے جانے لگے تو وہ مجھے ازراہ کرم اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

سوال:۔ اس زمانے کا آپ کا خاص تاثر کیا ہے؟

جواب:۔ ۶۵ء کی لڑائی کے بعد وہ ۴ ایف ایف کے کوارٹر ماسٹر مقرر ہو گئے تھے۔ اس حیثیت سے بھی انہوں نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ سرکاری ساز و سامان کی جیسی دیکھ بھال انہوں نے کی۔ ایسی کوئی اپنے گھر کے ساز و سامان کی بھی نہیں کرتا ہوگا۔ غرض یہ بہترین کوارٹر ماسٹر تھے۔

سوال:۔ اس تاثر کی بنیاد جن واقعات پر ہے کیا آپ ان کی مثال دینا پسند کریں گے؟

جواب:۔ بالکل ایک نہیں ہزاروں واقعات ہیں۔ جن سے میں نے اور پوری بٹالین نے اثر لیا ہے اس وقت صرف دو باتوں کا تذکرہ کروں گا۔

ہم میں سے بعض سپاہی کبھی کبھی چارپائی پر پاؤں رکھ کر بوٹوں کے تسمے باندھتے تھے۔ ایک بار کیپٹن اکرم صاحب نے دیکھا تو بہت ناراض ہوئے کہنے لگے بوٹوں کی کیلوں سے پلنگ کی نوار کٹ جاتی ہے۔ سرکاری املاک کا نقصان ہوتا ہے تم لوگ ایسا نہ کیا کرو۔ پھر دیر تک سمجھاتے رہے۔ پلنگ نوار ہر چیز پاکستان کی امانت ہے اس کا تحفظ ہر چھوٹے بڑے کا فرض ہے۔ اور یہ کہ چھوٹی چھوٹی لاپرواہیوں سے بڑی بڑی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ یہی بات کوئی اور کہتا تو شاید اتنا اثر نہ ہوتا۔ لیکن چونکہ یہ بات ان

کے دل سے نکلی تھی۔ بیرک میں جتنے سپاہی تھے سب کے دل میں اتر گئی۔

س :۔ دوسرا واقعہ یہ ہے ؟

جواب :۔ دوسرا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے ان کی کوارٹر ماسٹری کے زمانے کا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یونٹوں میں ٹینٹوں (خیموں) کا بڑا استعمال ہوتا ہے ایک بار ایسا ہوا کہ ہمارا ایک خیمہ کسی وجہ سے مٹی میں ضرورت سے زیادہ اٹ گیا۔ کچھ کیچڑ بھی لگ گئی تھی ہم جلدی اس کو تہہ کر رہے تھے کہ کپتان اکرم صاحب آ نکلے۔ خیمہ کی حالت دیکھی تو کہنے لگے نہ بھئی نہ اس کو فولڈ نہ کرو۔ پہلے اس کو دھوؤ پھر اسٹور کرنا۔ خیموں کو دھوتے کسی نے نہ سنا تھا سب حیران ہوئے کہ یہ کیا حکم دے رہے ہیں۔ ہماری ذہنی حالت بھانپ کر انہوں نے بتایا کہ اس طرح اسٹور کرنے سے خیمہ کچھ دنوں میں بالکل خراب ہو جائے گا۔ اور پھر ضرورت کے وقت کام نہ آسکے گا۔

تو جناب اندازہ کیجئے یہ عالم تھا ان کی فرض شناسی کام سے لگن اور پاکستان سے محبت کا۔

اکرم مشرقی پاکستان میں

میجر اکرم شہید پہلی بار مشرقی پاکستان ۸ پنجاب کے ساتھ نائیک کی حیثیت سے ۱۹۶۳ء میں گئے تھے۔ اور پاکستان ملٹری اکیڈمی میں کمیشن کی تربیت کے لئے جلد واپس آ گئے تھے دوسری بار وہ کیپٹن کی حیثیت سے ایسٹ پاکستان رائفلز میں چھٹے ونگ کے اسسٹنٹ کمانڈر کے منصب پر گئے اور ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء تک وہیں رہے۔

اس عرصے میں انہیں مشرقی پاکستان کے ایک بڑے حصے کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اکرم صرف ڈیوٹی کے طور پر بیدلی سے یا لاتعلق ہو کر نہیں گھومے پھرے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے دریاؤں، پہاڑوں، جھیلوں، قصبوں چھوٹے بڑے شہروں کو بہت قریب سے دیکھا۔ اور بہت غور سے دیکھا۔ اور بہت محبت سے دیکھا۔ موسموں کی تبدیلی، ہواؤں کے رخ اور کھیتوں

کی فصلوں اور سب سے بڑھ کر وہاں کے باسیوں کا مطالعہ انہوں نے ایک محقق کی نظر سے کیا۔ اور پھر اپنے مشاہدات و تاثرات کو خطوط کی شکل میں سپرد قلم بھی کیا۔ غالباً وہ پہلے پاکستانی افسر تھے۔ جنہوں نے مشرقی پاکستان کے حالات و ماحول پر غیر رسمی طور پر اس تفصیل سے لکھا ہے۔ بقول ان کے بھتیجے محمد اصغر ملک کے، مطالعہ کے بعد اکرم شہید کا پسندیدہ ترین مشغلہ خطوط نگاری ہی تھا۔

مشرقی پاکستان کے اس قیام کے دوران انہوں نے بڑی تندہی سے بنگالی سیکھی ان کی نجی ڈائری میں لکھی ہوئی عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بنگالی پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا۔ اور اپنا سارا کام بنگالی سے چلاتے تھے۔

اکرم نے مشرقی پاکستان جاتے ہی جس طرح وہاں کے حالات و ماحول کا مطالعہ کیا وہاں کی زمین کا اور زمین کے باسیوں کا بھی، اور جس ذوق سے انہوں نے بنگالی سیکھی وہ محض علمی یا ادبی تجسس نہ تھا۔ اس قدر کاوش کی تہہ میں اپنے فرائض منصبی کو احسن طریقے سے نبھانے اور اسلام اور پاکستان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کا جذبہ تھا۔ اکرم بظاہر ایک سنجیدہ طبیعت انسان تھے۔ لیکن ان کے بعض خطوط میں مزاح کی چاشنی سے زندہ دلی کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔

۱۹۶۸ء ۱۹۶۹ میں مشرقی پاکستان سے اکرم کے خطوط

کیپٹن محمد اکرم
اسسٹنٹ ونگ کمانڈر
سکس ونگ ای۔پی۔آر
نواب گنج

ڈیر اصغر

السلام علیکم!

اس سے پہلے دو عدد خط لکھے ہیں۔گو پہلے خط کے جواب کا انتظار نہیں تھا۔ لیکن دوسرا خط لکھے بھی تقریباً ۲۰ دن ہوئے ہیں اور آپ کا جواب نہیں ملا ہے۔ اس وجہ سے شک گزرا ہے کہ ممکن ہے کہ خط آپ تک نہ پہنچا ہو۔کیونکہ یونٹ سے چند خط مل گئے ہیں لیکن نہ تو گھر سے کوئی خط آیا ہے اور نہ بھائی صاحب حنیف کا یا آپ کا خط ملا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تینوں خط کہیں اِدھر اُدھر گئے ہوں۔

میں نے یہاں پہنچتے ہی تین عدد خط ایک گھر، ایک جہلم اور ایک آپ کے نام پر ارسال کئے تھے۔ان تینوں کا جواب نہیں ملا ہے۔گھر اور آپ کی طرف سے سستی کا امکان تھا لیکن عام حالات میں بھائی صاحب حنیف خط کا جواب دینے میں دیر نہیں کرتے۔اور چونکہ ان کا خط بھی نہیں ملا۔اس وجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شاید یہ خطوط کہیں غائب ہو گئے ہیں۔اس صورت میں انہیں بھی خط نہیں ملا ہو گا۔ لہٰذا جواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر آپ کو خط ملا ہے اور پھر بھی سستی کی وجہ سے جواب نہیں دے سکے۔تب بھی کوئی شکوہ نہیں۔

اس کے بعد جو خط لکھے ان میں سے بھی صرف عبدالرزاق۔لیفٹیننٹ مشتاق حسین

اور لیفٹیننٹ زاہد زمان کا خط ملا ہے۔

پہلے خط میں، میں نے ڈھاکہ سے نواب گنج کے سفر کے حالات تفصیل سے لکھے تھے آئندہ کے خط میں یہاں کے حالات تحریر کروں گا۔

امید ہے کہ میجر صاحب، آپا جان، صفیہ اور زیب، آصف خیریت سے ہوں گے۔ اور سیالکوٹ کے موسم برسات سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ یہاں تو بارش تقریباً روز ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے گرمی سے بچت ہے۔ اس علاقے میں سیلاب بھی نسبتاً کم ہے۔

میری طرف سے والدین کو سلام عرض کریں اور چھوٹوں کو پیار۔

والسلام
اکرم ملک

(اس خط کے صفحے کی دوسری طرف)

پیاری صفیہ، زیب۔ سلامت و خوش رہو۔

آپ لوگوں کو الگ خط لکھنا چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ آپ نے پہلے خط کا جواب نہیں دیا ہے۔ اس وجہ سے الگ لکھنے کی تکلیف نہیں کر رہا ہوں۔

یہاں آپ لوگ اکثر یاد آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پچھلے چند ماہ میں اکٹھے رہتے ہوئے ہم ایسے گھل مل گئے تھے کہ چند دن بھی دور رہنا مشکل نظر آتا تھا اور عام حالات میں بھی مجھے وہ دن یاد آتے رہتے۔ لیکن یہاں کے حالات تو بالکل ہی مختلف ہیں۔ یہاں اتنے بڑے گھر ہیں، میں بالکل اکیلا ہوں۔ ونگ کمانڈر بھی شادی شدہ ہیں، اس وجہ سے ان کے گھر جانا پسند نہیں کرتا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دعوت پر پہنچ جاتا ہوں۔ کھانے کی میز پر بالکل عجیب سا لگتا ہے اور یہاں تقریباً آپ سب یاد آتے ہیں۔ لیکن خاص طور پر سے صفیہ ایک تو کھانے کی میز پر دو گھنٹے بیٹھنے کی وجہ سے اور دوسرے جب کبھی مچھلی پکتی ہے

تو ان کا یاد آ جانا قدرتی سی بات ہے اور پھر یہاں تو مچھلی روز ہی بکتی رہتی ہے لک
اچھا ہے لہذا کھانا اچھا ہی پک جاتا ہے۔ کھانے کا سامان مغربی پاکستان سے نسبتاً سستا
ہے۔ جبکہ باقی ہر طرح کا سامان اسی طرح مہنگا ہے جو چیز سب سے سستی اور ٹھیک
ملتی ہے وہ دودھ ہے بالکل خالص گھر کی طرح۔ مصروفیت کافی ہے۔ لیکن پھر بھی جب
گھر میں ہوں تو اکیلا پن محسوس ہوتا ہے اور اس کے حل کے لئے ایک تو چند مرغیاں خرید
لی ہیں اور اب خیال ہے کہ جلد ہی ایک عدد گائے بھی خرید لوں گا۔ گھی تو گھر کا ہو جائیگا۔

پہلے خط میں آپ کی دلچسپی کے لئے سفر کے حالات تفصیل سے لکھے تھے خط مل گیا ہو
تو بہتر ورنہ لکھیں۔ آئندہ خط میں ساتھ کے گھر اور علاقے سے واقفیت دلواؤں گا۔

جہلم اور گھر سے بھی خط نہیں ملا ہے۔ اس وجہ سے آج ان کو بھی خط لکھ رہا ہوں
آپ کے سکول جانے کے دن بھی تو قریب آ رہے ہیں۔ خوب محنت سے پڑھائی جاری رکھیں

آصف کے الفاظ "ماموں ماموں"، کان میں گونجتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ اب ماموں
کو بھولتا جا رہا ہو گا۔ ٹھیک ہے نا۔

امید ہے کہ اس کا جواب ملے گا۔ کیا خیال ہے؟

والسلام
اکرم ملک

نواب گنج

۱۲-۷-۶۸

ڈیر اصغر

السلام علیکم! امید ہے کہ آپ لاہور سے واپس سیالکوٹ پہنچ گئے ہوں گے۔ میرا
خیریت نامہ موصول ہو گیا ہو گا۔ میں کل ڈھاکہ سے بخیریت نواب گنج پہنچ گیا تھا خیال تو تھا
کہ پرسوں شام تک یہاں آ جاتا۔ لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے پرسوں سفر نہ کر سکا۔ پہلے میرا

ہوائی جہاز سے یہاں آنے کا پروگرام تھا۔لیکن بارش اور طوفان کی وجہ سے ہوائی سروس بند ہو گئی۔ لہذا میں شام کی گاڑی سے یہاں کے لئے روانہ ہوا۔نواب گنج تک کا سفر جو ہوائی جہاز اور ریل کے ذریعہ ۳ گھنٹے تک ہونا تھا۔مجھے ۱۸ گھنٹے میں طے کرنا پڑا خیر یہ بھی اچھا تجربہ تھا اور خاص طور سے اس خراب موسم میں۔

ڈھاکہ اور نواب گنج کے درمیان کافی علاقہ زیر آب ہے۔کئی جگہ تو میلوں تک پانی پھیلا ہوا ہے۔جس میں جگہ جگہ چند جھونپڑیوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ سب طرف پانی پانی ہے جو کہ ۳ سے ۴ فٹ تک ہے۔اور اس کے باوجود بارش پیچھا چھوڑنے کا نام نہیں لیتی۔جب سے میں یہاں پہنچا ہوں اس سے دو دن پہلے سے بارش ہو رہی ہے اور ابھی تک سورج کی کرن نظر نہیں آئی۔ آج بھی پورا دن مطلع ابر آلود رہا البتہ بارش بند رہی سوائے سہ پہر کو جب کہ معمولی بارش ہوئی۔کل اور بارش ہونے کا امکان ہے۔کم از کم موسمیات والے تو یہی کہتے ہیں۔

لاہور سے ڈھاکہ کا سفر دلچسپ تھا لیکن ڈھاکہ سے نواب گنج البتہ تکلیف دہ تھا۔ایک تو ڈھاکہ کے نئے سٹیشن پر کافی گھپلہ تھا۔ریلوے سٹاف کو بھی صحیح معلوم نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے۔بہرحال ہماری گاڑی ڈھاکہ سے دو گھنٹے دیر سے چلی اور اس وجہ سے کافی پریشانی ہوئی۔جبکہ اس وقت سخت طوفان اور بارش کی کیفیت تھی۔ گاڑی رات ڈیڑھ بجے چلی اور باقی رات آرام سے گزری۔اور صبح ہم دریائے جمنا پر پہنچے یہ دریا بھی تو اصل میں سمندر ہے۔ریل گاڑی سے اتر کر ہم اسٹیمر پر سوار ہوئے اور اس وقت بھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔اور دریا کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آرہا تھا۔دریا کی موجیں یا لہریں کافی غضبناک معلوم ہوتی تھیں۔خیر (اللہ کے کرم سے) سٹیمر سے تقریباً ۲ گھنٹے کا سفر خیریت سے گزر گیا۔اور بارش ہی میں دوسری گاڑی پکڑنی پڑی جو کہ پہلے سے تیار کھڑی تھی۔باقی سفر کسی تکلیف یا حادثہ کے بغیر طے ہو گیا۔جب نواب گنج پہنچے تو استقبال

کا مناسب انتظام تھا۔

نواب گنج ہیڈ کوارٹر ہے اور ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ناردوال کی طرح سمجھ لیں۔ ضرورت کی سب چیزیں مہیا ہو جاتی ہیں۔ راجشاہی جو کمشنری اور ضلع ہے تقریباً ۳۰ میل پر واقع ہے۔ اور نواب گنج سے ریل اور پکی سڑک سے ملا ہوا ہے، کالج، بنک اور ہسپتال وغیرہ قسم کی سہولتیں مہیا ہیں اگر نا پید ہے تو کلب، اچھی قسم کا ہوٹل یا سینما وغیرہ جہاں آدمی چند گھنٹے گزار سکے۔ ویسے مشرقی پاکستان کے چھوٹے شہروں میں ہمارا گھومنا مناسب بھی نہیں ہے لہذا مجھے ڈیوٹی کے علاوہ باقی سارا وقت گھر ہی میں رہنا ہوگا۔ ویسے مصروفیت کافی ہوگی۔ کیونکہ اکثر سرحد پر جانا پڑے گا۔

مجھے ایک دو منزلہ گھر ملا ہے۔ کافی کمرے ہیں۔ اور بھی آرائش وغیرہ کا دوسرا سامان وغیرہ مہیا ہے۔ ٹیلیفون وغیرہ بھی ہے اور ایک کُک ہے جو کھانا اچھا ہی بنا لیتا ہے۔ کم از کم میس سے اچھا بناتا ہے۔ ویسے کمرے میں اکیلے ڈرائینگ ٹیبل پر بیٹھے عجیب سا لگتا ہے۔ کیونکہ کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا ہے۔ یا تو میس میں یا پھر گھر میں۔ لیکن اب امید ہے کہ جلد ہی اکیلے کھانے کا عادی ہو جاؤں گا۔

ابھی تک سرحد پر نہیں گیا ہوں۔ یہاں ہیڈ کوارٹر کا کام سمجھنے کے بعد دو تین دن تک باہر جانے کا پروگرام بناؤں گا۔

میری طرف سے بھائی صاحب اور ابا جان کو سلام آداب عرض کریں۔ بچوں کو پیار۔



۷۸۶

نواب گنج

۱۷-۸-۶۸

ڈیر اصغر

السلام علیکم!

خدارا فضلے امی بھالو آچھی۔ آپونی بھالو؟ آپونی پوری بار تو بھالو؛ چاکری کی ہولو آپ کے رسم الخط میں لکھ دیا ہے۔ ورنہ! ورنہ کیا۔ کسی پروفیسر کی خدمات حاصل کرنی پڑتیں اور وقت کے ساتھ ساتھ رقم بھی خرچ ہوتی۔ آپ کا فائدہ سوچا ہے کہ نہیں۔ بنگالی کا پہلا قاعدہ آدھا ختم کر لیا ہے۔ اپنے قاعدوں کی طرح اس میں بھی تصویروں کی کمی نہیں ہے۔ لہٰذا بنگلہ سیکھنے سے پہلے خوب تھا۔ بھلا کیا سمجھے۔ کیا مصیبت ہے ابھی تک نہیں سمجھے۔ بتادوں۔ انداز تحریر؟ آپ کے اندیشے کے خلاف نہ تو ناراض ہیں اور نہ ہی ناپسند کرتے ہیں۔ البتہ پسند ضرور کیا ہے لیکن ایسے انداز میں جواب دینے کی ہمت نہیں ہے۔ بھلا کیوں حیران دیکھ رہے ہیں۔ آسان سا مسئلہ تھا۔ لیکن آپ عمل نہیں کر سکتے۔ سادہ سی بات یہ ہے کہ جہاں آپ کا خط سیدھا میرے ہاتھوں میں پہنچتا ہے اور محفوظ ہوتا ہے۔ میرا خط آپ کے نام۔ ایسا خوش قسمت ہو ممکن نہیں اور گھر کے باقی افراد کے لئے انداز تحریر شاید مناسب نہ ہو (خیر اب کے کوشش کر رہے ہیں ممکن ہے ہمارا خط محفوظ رہے) تین خطوط جن کا کافی دنوں سے انتظار تھا یکے بعد دیگرے ملے۔ حسب توقع سب سے پہلے بھائی صاحب حنیف کا خط ملا۔ دو دن کے بعد گھر سے حفیظ کا تحریر کردہ خیریت نامہ ملا۔ البتہ آپ کا خط ان دنوں خطوں کے بعد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیوں یہی ارادہ تھا نا اس کا ۱۴ اگست کو پہلے دونوں خطوں کے جواب دیئے اور آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

آپ لکھتے ہیں کہ میں نے آپ کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ بھئی مشورہ تو اچھا تھا۔ لیکن

یہ تو قسمت کا کھیل ہے۔ ہمارے ارادے یا آپ کے مشورے یا کچھ نہیں بنتا۔ اور پھر موجودہ حالات بھی وہاں زیادہ امید افزا نہیں تھے۔ البتہ یہاں کے حالات کچھ ساز گار نظر آتے ہیں کم ازکم ایک واقعے سے امید ہوگئی کہ.... ۱۴ / اگست کو جب میں صبح دورے سے واپس نواب گنج پہنچا تو میز پر دو لفافے پڑے تھے۔ اوپر والا تو نظر پڑتے ہی پہچان لیا۔ حفیظ کا خط تھا۔ جس کا کئی دن سے انتظار تھا اور عام حالات میں اسے فوراً ہی پڑھنے بیٹھ جاتا لیکن جب دوسرا لفافہ دیکھا تو پتہ پڑھ کر خوشی سے ہمارے نیچے سے زمین نکل گئی۔ معلوم نہیں خوشی میں پاؤں کے نیچے سے زمین کا نکلنا کہاں تک درست ہے۔ لیکن ہے یہ حقیقت، اس وجہ سے یہ عرض کر رہا ہوں۔ کیوں سننے کو بے تاب ہو رہے ہو۔ بھئی یہ تو ہمارے اپنے گھر کی بات تھی۔ خیر آپ ضد کرتے ہیں تو بتاتے دیتا ہوں۔ دوسرا لفافہ مسز کیپٹن اکرم کے نام تھا۔ کیوں خوش ہونے کی بات تھی کہ نہیں۔ اس حالت میں ہم تو حفیظ کا خط بھول ہی گئے۔ جلدی سے اپنی منہ کا لفافہ کھولا (لیکن غلط کام تھا۔ کیونکہ دوسروں کے خط کھولنا اخلاقاً بری بات ہے۔ لیکن وہ تو مسز اکرم کے نام تھا) معلوم ہوا کہ یوم آزادی کی ۱۲۔ سالگرہ کی خوشی میں گورنمنٹ کالج ایک تقریب منا رہی ہے۔ اور اس میں شمولیت کے لئے مسز کیپٹن اکرم کو دعوت نامہ ارسال کیا گیا تھا۔ تقریب کا خیر کیا سوچنا تھا خوشی اس بات کی ہوئی کہ چلو ہماری تین دن کی غیر حاضری میں کوئی محترمہ تشریف لائی ہیں اور وہ بھی گھر کی مالکہ بننے کے لئے۔ کیوں خوش ہونے کی بات نہیں ہے۔ آپ کو تعجب کس بات کا ہو رہا ہے۔ مجھے تو یہ خوشی تھی کہ بغیر تکلیف، خرچ اور محنت کے ایک اہم مسئلہ حل ہو گیا۔ نوکروں کو اطلاع دیئے بغیر گھر میں محترمہ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ لیکن وہ تو ایسے غائب تھیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ جب یقین ہو گیا کہ تلاش بے کار ہے۔ تو جلدی سے نوکروں کو اکٹھا کیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔ لیکن یہ تفتیش بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہ کر سکی۔ محترمہ پرنسپل صاحبہ کے دعوت نامے کی صداقت سے انکار کرنے کو جی نہیں

چاہ رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنی آنکھوں اور نوکروں کی زبان پر یقین کرتے ہوئے ماننا پڑا کہ یہ خبر کسی دشمن نے اڑائی ہے۔ خیر ہم نے پھر بھی امید کا دامن نہ چھوڑا۔ سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ محترمہ پرنسپل صاحبہ سے مدد طلب کی جائے۔ ممکن ہے کہ وہ مسز اکرم کو تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ دن بھر تو اسی سوچ و بچار میں گزر گیا۔ اور شام کو ہم نے محترمہ پرنسپل صاحبہ کے نام ایک خط لکھ دیا۔ جس میں جہاں ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہاں سے میں نے ان سے ایک محترمہ ڈھونڈنے میں مدد کی درخواست بھی کی۔ معلوم نہیں عرضی منظور بھی ہوئی کہ نہیں۔ اس کے موڈ کی بات ہے۔ چاہے بغیر دیکھے ردی کی ٹوکری میں پھینک دے اور چاہے تو مہربان ہو جائے۔ خیر آپ ہمارے فیصلے کی داد تو ضرور دیں گے۔ یہ تو آپ کو بتایا نہیں کہ حفیظ کا خط پورا پورا دن کہاں کہاں گھومتا رہا۔ مجھے پتہ نہیں ہے رات سونے سے پہلے دیکھنے کی فرصت ملی۔ وہ بھی پڑھ سکا کہ نہیں، یاد نہیں پڑتا۔ آپ خود ہی سوچیں ایسے موقعے پر اور خط پڑھنے کی فرصت کیسے ہو سکتی ہے۔ اس میں میرا قصور تو نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نا۔ اور کیا پوچھا ہے۔ مورال۔ ایک لفظ جس نے لوگوں کو شش و پنج میں ڈالا ہوا ہے۔ بھئی راستہ میں مورال ہائی ہوا تھا کہ نہیں۔ یہ تو خیر یاد نہیں رہا۔ البتہ نواب گنج میں ایک ماہ رہنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مورال ہائی نہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔ گھر کا جغرافیہ بیان کروں تو آپ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ میں گھر میں بھی تنہا نہیں ہوں۔ اب آپ کہیں گے۔ کہ دولت خانہ کا بیان کروں۔ نہیں اتنی جلدی نہیں مجبور کیا تو آئندہ تکلیف کر لوں گا۔ اس کے علاوہ حلقہ احباب بڑھتا جا رہا ہے۔ گو شہر میں تھوڑے (آفیسرز) ہیں لیکن ان سے واقفیت ہو گئی ہے اور کوئی نہ کوئی ملاقات کے لئے آ ہی جاتا ہے۔

آپ لکھتے ہیں کہ لوگ سانولے۔ کیا۔ کیا۔ کالے ہیں۔ کسی حد تک آپ کا اندازہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ اس خطے کی خوبصورتی تک نہیں پہنچ سکی گورے اور صحیح معنوں میں خوبصورت لوگوں کی کمی نہیں۔ ایک سے تو پرسوں راجشاہی یونیورسٹی

میں ملاقات ہوگئی۔ لیکن ایک نہیں دو تھیں۔ نہیں نہیں دو تھے۔ ایک دل کو بھاگئی بی اے کی طالب علم۔ شباب جوانی اور بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہماری قیمت پر آپ بھی اپنا مورال ہائی کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں ان کے ساتھی کے متعلق تو بتایا ہی نہیں بھئی ابھی سولہ سترہ کا سن ہوگا۔ لیکن سرونما قد جو کسی حالت میں بھی پانچ فٹ سات انچ سے کم نہ ہوگا۔ اس کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ کیوں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن آپ کا سن ہی کیا ہے ایسی باتوں میں دلچسپی لینے کا یہ تو صرف آپ کی اطلاع کے لئے ہے۔ یہ تو حال ان دوستوں کا تھا۔ جن کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ایسی ملاقات میں گھنٹے بھی سیکنڈ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ٹھیک کہا کہ نہیں۔ ایسی ملاقات اگر نہ بھی ہو اور راجشاہی یونیورسٹی کا شام کو ایک گھنٹے کے لئے چکر صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ پشاور یونیورسٹی کی طرح یہ یونیورسٹی شہر سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ خوبصورت علاقہ ہے۔ خوبصورت درختوں، باغ اور دل کو بھا جانے والی کلیوں کی کمی نہیں ہے۔ ہفتہ میں ایک چکر آنکھوں کے لئے فائدہ مند ہے۔ لیکن روزانہ ایک چکر دل کے مریضوں کے لئے بہت سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ کیا سمجھے! نادان ہو نہیں سمجھ سکو گے۔ یونیورسٹی کے علاقہ کی خصوصیت آپ کے علم میں اضافے کے لئے لکھی ہیں گو ہم صرف ان لوگوں (جن کا ذکر اوپر کیا ہے) سے ملنے کیلئے یونیورسٹی گئے تھے۔ ویسے چکر تو بے سود بھی ہے اور زندگی کافی مصروف ہے اس وجہ سے بور ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اکثر باہر جانا پڑتا ہے گو وقت کی پابندی نہیں ہوتی۔ موسم اور یہاں کی مصروفیات کا خیال کرتے ہوئے دورے کا پروگرام بناتے ہیں۔ بہرحال ہر ماہ آٹھ سے دس دن کے لئے باہر جانا لازمی ہے۔ کبھی کبھی وقت پر ضروری جانا پڑتا ہے۔ جیسے کہ میرا پچھلا دورہ تھا۔ خیال تھا کہ آپ کو اس خط میں باہر کی سیر کروائیں گے۔ لیکن آپ نے اتنی باتیں پوچھ لی ہیں کہ باہر کی سیر ہم نے آئندہ کے لئے (ملتوی) کر دی ہے۔ ہمارا ایک سپاہی تیس جولائی کو کشتی ڈوبنے کے حادثے میں جان کھو بیٹھا۔ یہ جوان مغربی پاکستان

سے تعلق رکھتا تھا اور جولائی کی ۲۰ تاریخ کو اس کی شادی ہوئی تھی۔ اور شادی کے بعد ۲۸ کو وہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوا۔ لیکن خداوند کریم نے اس کے لئے کچھ اور ہی فیصلہ صادر کیا تھا۔ اس کی لاش حادثہ سے ۲۰ گھنٹے بعد ملی اور پانی میں رہنے کی وجہ سے خراب ہوگئی (ایسٹ پاکستان رائفلز ہیڈکوارٹر) نے اس کی میت کو مغربی پاکستان لے جانے کی اجازت تو دے دی تھی۔ لیکن لاش کی حالت دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس مجاہد شہید کو ونگ ہیڈکوارٹر کے علاقے میں ہی دفن کیا جائے۔ اس کے کفن دفن کے وقت اس کے بھائی اور بیوہ کی حالت دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ دونوں کی حالت غیر تھی۔ خداوند کریم مرحوم کی مغفرت کرے۔ اور اس کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے (آمین) اس حادثے کی تحقیقات کے لئے بارہ اگست کو جائے حادثہ پر گیا۔ جس جگہ یہ حادثہ پیش آیا ہے وہ دریا کا حصہ نہیں اور سنا ہے کہ سردیوں کے موسم میں جگہ خشک ہوتی ہے بلکہ (ایسٹ پاکستان رائفلز) کے افسر جیپ پر اس علاقے پر سفر کرتے ہیں۔ لیکن آج کل میلوں تک پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ بلکہ سمندر کا گمان ہوتا ہے۔ یہ پانی جو کم از کم پانچ چھ میل چوڑائی اور ۳۰ میل تک لمبائی میں پھیلا ہوا ہے۔ ۲۰، ۲۵ فٹ تک گہرا ہے۔ اس علاقے میں جہاں میلوں تک نہ تو آبادی ہے اور نہ ہی درخت وغیرہ معمولی ہوا (جس کو ہم ویسے پسند کریں گے) بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ وہ کشتی بھی ہوا کی وجہ سے لہریں اٹھنے کے سبب ڈوب گئی۔ میں جس دن گیا اس دن بھی موسم اچھا نہ تھا۔ لیکن ہم نے خداوند کریم کا نام لے کر (سپیڈ بوٹ) اس سمندر میں داخل کر ہی دی۔ ویسے اب ہم نے (۴۰ ہارس پاور) کا انجن خرید لیا ہے۔ اور بڑی کشتی بن رہی ہے۔ اس کے مکمل ہونے پر اس علاقے کا سفر کافی حد تک محفوظ ہو گا۔ دوسرے چھوٹے دریاؤں کے لئے موجودہ سپیڈ بوٹ ۲۰ ہارس پاور اچھی ہیں۔ ماسوائے گنگا۔ جس کو پاکستان میں (پدما) کہتے ہیں۔ اس کو پار کرنے کے لئے موٹر لانچ ہے۔ لیکن وہ بھی صرف اچھے موسم میں استعمال کرتے ہیں ورنہ (پدما) کے پار نہیں جاتے۔ یہ دریا کم از کم تین میل چوڑا ہے اور اس کا

پانی بہت تیز اور خطرناک ہے۔ کل راجشاہی سے واپسی پر (پدما) عبور کر کے چند جگہوں کا معائنہ کرنا تھا۔ لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے دورہ منسوخ کرنا پڑا۔ اور جب نواب گنج واپس پہنچا تو آپ کا خط منتظر تھا۔ ممکن ہے اسی کے لئے جلدی آگیا موٹا ہونے کا خیال تو نہیں تھا۔ لیکن پرسوں وزن کر کے تشویش ضرور ہوئی ایک ماہ میں وزن میں ۵ پونڈ کا اضافہ ہوگیا۔ خیر اب ہم نے احتیاط شروع کر دی ہے۔ موٹا ہونا تو اچھا نہیں ہے۔ البتہ گھر کا خالص دودھ اور گھی استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایک آدھ سوال رہ گیا ہے۔ آئندہ خط میں لکھوں گا۔ کل فلم دیکھنے کا ارادہ ہے۔ تفصیل آئندہ۔

میری طرف سے والدین کو سلام آداب عرض کریں۔ زیب اور آصف کو پیار۔ ہاں زیب کے لئے اخبار کی دو کٹنگ بھیج رہا ہوں۔ کچھ اور بھی ہیں۔ لیکن خط بھاری ہو رہا ہے اس وجہ سے دوسرے لفافے میں بھیجوں گا۔ اور پھر اگر اس کو پسند آئیں تو کم از کم انتظار کا لطف تو اٹھائے گی۔ باقی آئندہ

والسلام

اکرم ملک

۷۸۶

نواب گنج

۲۴-۱۰-۶۸

ڈیر اصغر

السلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ اس سے پہلے بھائی صاحب حنیف کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ سیالکوٹ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ بھائی صاحب اسلم بھی ان کے ساتھ ہی سیالکوٹ پہنچے۔ سیالکوٹ سے آپ کے خط کے ساتھ اقبال اور زاہد کے خطوط ملے۔ مشتاق کا خط چند دن پہلے ملا تھا۔ لیکن جواب

ابھی تک باقی ہے۔

میں آپ کا دلچسپ خط پڑھنے میں بُری طرح مگن تھا اور آدھا پڑھنے کے ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ لمبا خط اور بھی دلچسپیوں کا حامل ہو گا۔لیکن آپ نے خط میں ایک دم سے اپنے لہجے میں تبدیلی کر کے خط کا سارا مزہ کرکرا کر دیا۔آپ کے خیال اور تشویش کا پڑھ کر اپنے بھی ہوش کچھ دم کیلئے ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔لیکن پھر میں نے ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچنے کے بعد یہ اندازہ کیا کہ آپ نے جو حالات لکھے ہیں ضروری نہیں کہ وہ سچ ہوں۔آپ کو شاید معلوم نہ ہو۔لیکن مجھے اس حقیقت سے واقفیت ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں۔ اپنے قرابت داروں میں بھی اور ان کے علاوہ بھی جو ہم لوگوں کو آپس میں خوش اور اچھے تعلقات میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فساد ڈلوانے کے لئے افواہیں پھیلانے کی کوشش کی ہے لیکن کامیابی نصیب نہیں ہوئی ممکن ہے یہ بھی اسی کڑی کی ایک اور کوشش ہو۔بہر حال میں حالات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔اور پھر آپ کو مطلع کر سکوں گا۔

اس دفعہ آپ کو ایک لمبا چوڑا خط لکھنے کا ارادہ تھا۔لیکن اب اس ارادے کو آئندہ پر ملتوی کرتا ہوں اور اتنے میں آپ سیالکوٹ سے لاہور پہنچ جائیں گے۔ لہٰذا آپ کے پہنچنے پر خط لکھتے ہوئے اور بھی بے تکلف رویّہ اختیار کر سکوں گا۔

میری طرف سے والدین کو سلام عرض کریں۔ بھائی صاحب حنیف۔ اسلم کو السلام علیکم چھوٹوں کو پیار۔ سلطان کو السلام علیکم۔

والسلام

اکرم ملک

پی۔ایس

ریاض نے پیسے کیا بھیجے ہیں۔ فراڈ کھیلا ہے۔ایک ماہ سے اطلاع ملی ہے لیکن نہ معلوم

اس نے بنک ڈرافٹ یا جس ذریعہ سے رقم بھیجی ہے اس میں کیا غلطی کی ہے کہ ابھی تک رقم مجھے نہیں مل سکی۔ خیر اب تو رقم ملنا شروع ہو گئی ہے۔ لہٰذا تشویش کی بات نہیں ہے۔

اکرم ملک

سونا مسجد

۱-۱۰-۶۸

ڈیر اصغر ملک

السلام علیکم!

امید ہے کہ آپ لاہور کی سیر بلکہ داخلہ لینے کے بعد واپس سیالکوٹ پہنچ چکے ہوں گے اور میجر صاحب جیسے کہ آپ نے لکھا ہے سکیم کے لئے سیالکوٹ سے باہر گئے ہوئے ہوں گے اور باقی افراد گھر میں باخیریت ہوں گے۔

میں کل نواب گنج سے سونا مسجد پہنچا۔ میرا یہاں آنے کا مقصد اپنے ہندوستانی مقابل افسر سے ملاقات کرنا تھا۔ ہندوستان کی طرف سے کیپٹن پودھان نے کانفرنس میں حصہ لیا سونا مسجد راجشاہی مالدہ روڈ پر نواب گنج سے ۲۴ میل پر پاکستان کی آخری چوکی ہے۔ جنگ سے پہلے دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت اسی راستے سے ہوتی تھی۔ جو فی الحال بند ہے میرا خیال تھا کہ آج کا دن دوسری چوکیوں کی انسپکشن میں گزر جائے گا۔ لیکن شام کو نواب گنج سے خبر ملی کہ آرمی کے دو افسر (کرنل اور میجر) آج گیارہ بجے سونا مسجد دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں۔ لہٰذا میں ان کی ملاقات کے لئے ساڑھے دس بجے ہی (رجمنٹل ہیڈ کوارٹر) میں واپس آ گیا۔ اب تو تقریباً ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کا نام و نشان نہیں نظر آ رہا لہٰذا میں نے سوچا کہ اس وقت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور چونکہ پچھلے خط میں میں نے آپ کو کافی انتظار کرایا تھا۔ اس وجہ سے مناسب سمجھا کہ پہلے آپ کو جواب دیا جائے۔

درگا پوجا (دسہرہ) اور اتوار کی چھٹیاں (تین دن) ہونے کی وجہ سے تین دن سے ڈاک

نہیں آئی تھی۔ لہٰذا کل شام میں نے نواب گنج خبر بھیجی کہ اگر میری ڈاک ہو تو سونا مسجد پہنچا دی جائے۔ چونکہ تین دن سے ڈاک نہیں آئی تھی۔ اس وجہ سے امید تھی کہ چند خط ضرور ہوں گے۔ اور اب جو ساڑھے دس بجے واپس رجمنٹل ہیڈ کوارٹر پہنچا تو چار خط میرا انتظار کر رہے تھے جن میں آپ کا ایک بھائی صاحب حنیف کا اور دو دوستوں کے خط شامل تھے آپ کے خط کے ساتھ ساتھ ایک دوست کا خط بھی دلچسپیوں سے خالی نہ تھا۔ سب خط پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آپ کے خط کا جواب سب سے پہلے دیا جائے۔

معلوم نہیں کہ ہماری خط و کتابت میں یہ شکوہ اور جواب شکوہ کا سلسلہ کیسے چل پڑا ہے۔ آپ کا یہ گمان کہ مجھے آپ کا خط ناپسند یا ناگوار گزرا ہے حقیقت نہیں ہے۔ جیسے کہ میں نے اپنے پہلے خط میں لکھا تھا آپ کا خط بہت دلچسپ تھا۔ لیکن اس میں جو شاعرانہ بو آرہی تھی اس کے خیال سے مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں یہ آپ کی صحت کے لئے نقصان دہ نہ ہو ورنہ شاعرانہ کلام کس کافر کو پڑھنے کی خواہش نہ ہو۔ آپ کی محفل موسیقی اور کلب سے بوریت ہوئی۔ لیکن اشعار بہت پسند آئے۔ غزلیں شاید اور بھی اثر انداز ہوں گی۔ آپ کے خط میں اور کوئی جواب طلب بات نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو اتنی جلدی چھٹی ہو جاتے گی۔ کیوں کیا ارادہ ہے۔ اگر کہیں تو آپ کو سونا مسجد کی سیر کرا دیں۔ ورنہ چند دن پہلے دریائے پدما میں جو خوفناک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس سے آپ کی واقفیت کروا دی جائے۔ جوان آدمی ہو اسی لئے خوفناک سفر کے حالات سننا چاہتے ہو۔ ورنہ سونا مسجد کی سیر کے لئے ضرور کہتے کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے جس کو دیکھنے کیلئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ خیر ہم آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے آپ کی پدما میں ایک سیر کرواتے ہیں۔

پدما جس کو شاید صفیہ زیب کی کتابوں میں گنگا کا نام دیا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کا دوسرا بڑا دریا ہے۔ ہماری بہت سی چوکیاں دریا کے اس پار ہیں۔ دریا کی چوڑائی مختلف جگہوں

بر مختلف ہے اور کئی ایک جگہوں پر دریا ایک سے زیادہ حصوں میں بہتا ہے۔ اس دریا کو یہ خاصیت حاصل ہے کہ ایک ہی موسم میں یہ گاؤں کے گاؤں برباد کر دیتا ہے اور زمین کو کاٹنے میں اس کا ثانی نہیں ہے۔ برسات کے موسم میں پانی کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اس موسم میں صرف بڑی کشتیاں دریا سے پار جاتی ہیں اور جب کبھی طوفان وغیرہ کا اندیشہ ہو تو کشتیوں وغیرہ کی آمد و رفت بند ہو جاتی ہے۔ اور طوفان اس علاقے میں روز بلکہ دن میں کسی وقت اچانک آجاتے ہیں۔ اس دریا کو پار کرنے کے لئے ہمارے ایک موٹر لانچ ہے جو کہ پدما میں سفر کرنے کے لئے محفوظ ہے اور دوسرے دریاؤں میں ہم سفر سپیڈ بوٹ سے کرتے ہیں۔ سپیڈ بوٹ چونکہ چھوٹا ہے اور اس کے انجن کی پاور اچھی ہے اس کی وجہ سے اس کی رفتار موٹر لانچ کی نسبت اچھی ہے۔

ستمبر کے آخری ہفتے میں بارش نسبتاً کم ہوئی اور ساتھ ہی ہوائیں بھی زیادہ تیز نہ ہوئیں اس لئے اپنے ایک دورے کے دوران میں نے فیصلہ کیا کہ وقت کی بچت کے لئے بہتر ہے کہ سپیڈ بوٹ کا استعمال پدما میں کیا جائے۔ یہ فیصلہ موسم کی کیفیت اور پانی کی سطح کو مدنظر رکھ کر کیا تھا۔ پدما میں پانی کی سطح ۱۲ سے ۱۵ فٹ ہو گئی تھی۔ ۲۳ سے ۲۵ ستمبر کے درمیان میں نے کئی دفعہ پدما کو عبور کیا اور کافی عرصہ دریا میں سفر کرتا رہا۔ لیکن اس عرصے میں موسم بہت اچھا رہا۔ اور مجھے سفر میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہوئی۔ بلکہ دریا کا پانی جھیل کی مانند رہا اور ہم سپیڈ بوٹ میں سفر کرتے ہوئے لطف اندوز ہوتے رہے۔ میرے اس دورے کے صرف دو دن بعد سیکٹر کمانڈر نے ہماری ایک کمپنی کا دورہ کرنا تھا۔ میں نے اپنے پچھلے دورے کی بنا پر فیصلہ کیا کہ اسے سپیڈ بوٹ میں ہی لے جاؤں گا۔ خیال یہ ہی تھا کہ وقت کی بچت ہو جائے گی۔ جس جگہ اب دورہ تھا اس میں اور جہاں میں چند دن پہلے گیا تھا دریا کی کیفیت میں یہ فرق تھا کہ جہاں اب دریا صرف تین میل میں پھیلا ہوا تھا پہلے والی جگہ میں اس کی چوڑائی ۶ میل میں آتی تھی اور دوسرا یہ کہ اس علاقے میں پدما اور مہانندہ۔

(جو کے نواب گنج کے ساتھ سے گزرتا ہے) دونوں آپس میں ملتے ہیں اور ہوا چلنے کی صورت میں خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

ہم نے صبح نو بجے سفر شروع کیا۔ سفر شروع کرنے سے پہلے کرنل صاحب سیکٹر کمانڈر نے خیال ظاہر کیا کہ پدما کے لئے سپیڈ بوٹ کے بجائے موٹر لانچ میں سفر کرنا بہتر ہوگا لیکن جب میں نے اپنے چند دن پہلے کے تجربہ کا ذکر کیا اور انہیں یہ بھی بتایا کہ سپیڈ بوٹ کے ۴۰ ہارس پاور انجن کی وجہ سے اس کی رفتار موٹر لانچ کی نسبت زیادہ تیز ہوگی۔ تو انہوں نے سپیڈ بوٹ میں سفر کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور ہم اللہ کا نام لے کر روانہ ہوئے۔ صبح نو بجے سے ۳ بجے شام تک ہم نے مختلف چوکیوں کو ملاحظہ کرنے کے لئے دو دفعہ پدما کو عبور کیا اور کافی دیر پانی کی سمت کے خلاف سفر کرتے رہے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ ۳ بجے سخت بارش ہوئی اور اس کے ساتھ ہی تیز ہوا بھی چلنا شروع ہوئی لیکن اس وقت ہم ایک چوکی پر پہنچنے ہی والے تھے لہذا کوئی دقت نہ ہوئی اور ساتھ ہی ہوا کی سمت اور پانی کی سمت ایک تھی۔ لہذا دریا میں طوفان کی کیفیت پیدا نہ ہوئی۔ دونوں بارش اور ہوا تقریباً ۴ بجے تھم گئیں اور چند منٹ بعد دریا میں سکون پیدا ہو گیا اور ایسا سکون پیدا ہوا کہ پانی پھر پہلے کی طرح ساکن نظر آنے لگا۔ ایسی حالت میں ہم نے واپسی کے لئے روانگی کی اور جب سپیڈ بوٹ کے ڈرائیور نے پوری رفتار پر کشتی کو چلایا تو کرنل صاحب بول اٹھے کہ کشتی کو الٹا کرنے کا ارادہ تو نہیں اصل میں پہلے اس کشتی کے ساتھ ۲۰ ہارس پاور کا انجن تھا لیکن نیا ۴۰ ہارس پاور کا انجن لگنے کے ساتھ اس کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ اور کرنل صاحب پہلی دفعہ اس حالت میں اس میں سفر کر رہے تھے۔ لیکن رفتار کی یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ روانگی سے تھوڑی دیر کے بعد پانی کے برخلاف سمت سے ہوا چلنی شروع ہو گئی۔ مشرقی پاکستان آکر پتہ چلا کہ پانی کے بہاؤ کے خلاف ہوا کس قدر خطرناک ہوتی ہے۔ تو خیر ہوا چلنے کی دیر تھی کہ پدما میں طوفان کی کیفیت پیدا

ہو گئی۔ اور پھر پدما کا طوفان اور ہماری سپیڈ بوٹ پدما جس کے طوفان سے مشرقی پاکستان کے ماہی گیر اور بڑی بادبانی کشتیاں بھی پناہ مانگتی ہیں ہماری چھوٹی کشتی کو گھیرنے میں کامیاب ہو گیا۔ طوفان نے ہمیں اتنا وقت بھی نہ دیا کہ ہم اپنی کشتی کو کنارے پر لگا سکتے۔ انجن کی طاقت اور پانی کا بہاؤ ایک طرف اور ہوا سے پیدا ہونے والی لہریں مخالف سمت سے کشتی کو اچھالنے میں مشغول ہیں۔ دونوں طاقتیں کشتی کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ بلکہ یہی نہیں طوفان کی خطرناک حالت کو دیکھتے ہی کشتی میں بیٹھے دونوں افسر اور دونوں جے۔ سی۔ او غریب ڈرائیور کو ہدایات پہ ہدایات دے رہے ہیں۔ اور وہ طوفانی لہروں کے خلاف کشتی پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں مصروف ہے یہ کشمکش کچھ دیر تک جاری رہی۔ جس کا ایک ایک لمحہ ہم سب کو کشتی سمیت پانی کی نذر کر سکتا تھا۔ لیکن خداوند کریم کی مہربانی سے خیریت رہی۔ اس عرصہ میں اگر انجن ایک سیکنڈ کے لئے بھی بند ہو جاتا تو انجام کچھ اور ہی ہوتا۔ خیر اس کشمکش میں جیت طوفان کی ہوئی وہ اس صورت میں کہ پدما کی لہریں کشتی کو دریا کے کنارے کی طرف دھکیلنے میں کامیاب ہو گئیں جس کے نزدیک جانا خاص کر اس حالت میں موت کو دعوت دینے کے برابر ہے ڈرائیور اگر کشتی کو تیزی سے گھمانے کی کوشش کرتا تو اژدھا کی طرح اٹھتی ہوئی ایک ہی لہر کشتی کو پانی کی نذر کر دیتی اور وہ آہستہ آہستہ کشتی کو کنارے سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو ہوا اس کو اور بھی کنارے کی طرف دھکیلتی ہے اور دریا کا یہ کنارا ہیبت ناک صورت بنائے (قلم بھی لکھتے ہوئے سوکھ جاتے) مسافروں سمیت کشتی کو نگلنے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ کھڑا ہے کہنا موزوں موزوں نہ ہوگا کیونکہ طوفانی لہریں کنارے کو اس تیزی سے کاٹ رہی تھیں کہ ہر لمحہ کنارا بدلتا جا رہا تھا۔ پانی کی ایک آٹھ سے دس گز لمبائی سے پانچ گز چوڑائی دریا کی نذر کرتی جا رہی تھیں کناروں کی اونچائی دس سے ۱۵ فٹ تک اور ایسی حالت میں جب مٹی کا یہ تودہ پانی میں گرتا ہے ایک خوفناک لہر کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے جو کہ طوفانی لہروں سے کہیں زیادہ خطرناک

تھا کافی دیر ہماری کشتی دونوں قسم کی لہروں سے مقابلہ کرتی رہی اور خداوند کریم کے فضل وکرم سے پھر بھی پانی کی سطح پر قائم رہی۔ اس موقع پر ایک دفعہ ہم نے کشتی کو پانی سے باہر نکالنے کی ناکام کوشش کی۔ کشتی کے بچاؤ کی امید ختم ہوتی جارہی تھی۔ کہ کیا دیکھتے ہیں کہ تھوڑے فاصلے میں دریا کا کنارا اور پانی کی سطح ایک ہے۔ بلکہ دریا سے چھوٹا نالہ نکلتا تھا۔ دیکھتے ہی ہم نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ کشتی کو اس نالے میں ڈالنے کی کوشش کرے۔ نالے کی گہرائی اور کنارے کی اونچائی کے بارے میں واقفیت کے بغیر اس میں کشتی ڈالنے کی کوشش ہوائی جہاز کو، کریش لینڈ کرنے کے موافق تھا۔ لیکن یہی ایک امید کی کرن نظر آرہی تھی۔ اسی وجہ سے چانس لینے کا فیصلہ کیا اور کرتے بھی کیا۔ ایک طرف بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی اور دوسری طرف ایک ہلکی سی کرن لیکن ہمیں اپنے اس ارادے میں بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی ڈرائیور نے زور اور کوشش سے کشتی کو نالے میں لے جانے کی کوشش کی۔ لیکن پانی کی تیز رفتاری کشتی پر پوری طرح قابو پاچکی تھی۔ اور انجن کی ۴۰ ہارس پاور کی طاقت کشتی کو مقام پر لے جانے کی کوشش میں ناکام ہوئی۔ بلکہ اس کوشش میں کشتی ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ امید کی ہلکی سی کرن جس نے چند سیکنڈ پہلے بچنے کی امید ظاہر کی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پیچھے رہ گئی اور کشتی پھر پانی کے رحم وکرم پر ڈولتی ہوئی بہے جارہی تھی۔ دریا سے نکلنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے ساتھ ہم ایک اور مصیبت میں پھنس گئے۔ باہر نکلنے کے لئے ہم دریا کے بالکل کنارے پر آگئے تھے اور وہ نالہ گزرنے کے بعد پھر ایک ہیبت ناک کنارا ہمارے سر پر آگیا۔ ہمارے آگے پیچھے تو مٹی کے تودے دریا میں گر رہے تھے۔ لیکن اللہ کا فضل ہوا کہ کوئی تودہ ہماری کشتی پر نہ گرا۔ ورنہ اب ایک طرف دریا کی طوفانی موجیں، دوسری طرف ہیبت ناک کھڑا کنارا اور سامنے پدما اور مہانندہ کا جنکشن اور درمیان میں ہم خداوند کریم کے فضل وکرم سے باخیریت سفر کر رہے تھے۔ لیکن امید کی ایک کرن جو چند منٹ پہلے جلی تھی اب بجھ گئی تھی۔ اور اب تو سامنے پدما اور مہانندہ کا جنکشن نظر آرہا تھا جس سے محفوظ گزرنے کی

امید کرنا نادانی تھا۔ لیکن خداوند کریم کو بہتری منظور تھی۔ اور وہ ہمیں محفوظ کنارے سے لگانے کے لئے مناسب بندوبست کر رہا تھا۔ جس کا نہ تو ہمیں خیال تھا اور نہ ہی امید تھی۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے تقریباً ۳۰۰، ۴۰۰ گز کے فاصلے پر زمین کا ایک بہت بڑا تودہ ۲۵ گز لمبائی کا پانی میں گرا۔ جس کی وجہ سے ۲۰ گز سے ۲۵ گز کے علاقے میں زمین کی سطح ایک دم سے اونچی ہوگئی۔ اور وہاں پانی کا بہاؤ رُک گیا۔ جب ہم اس جگہ سے تقریباً ۱۰۰ گز سے فاصلے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ خداوند کریم نے بچاؤ کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اس تھوڑی سی جگہ میں پانی کا بہاؤ تقریباً رک گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر خیریت سے کنارے پر پہنچنے کی امید بندھی لیکن اس وقت یہ خدشہ دل کو پریشان کئے ہوئے تھا کہ پانی کی رفتار نے ہمیں کشتی کو اس محفوظ مقام کی طرف لے جانے کا موقع ہی نہ دیا تو پھر لیکن خداوند کریم نے کمال طریقے سے ہمیں مدد دی۔ جیسے ہی ہماری کشتی مقررہ جگہ والے کنارے کے نزدیک آئی تو ہمیں کنارے کی طرف آتے ہوئے چند آدمی نظر آگئے ہم نے ان کو فوراً مدد کے لئے طلب کیا اور کشتی کی رسی کنارے پر پھینک دی۔ خدا نے بہتر کیا کہ رسی ان میں سے ایک آدمی کے ہاتھ میں آگئی اور اس طرح ہماری کشتی کنارے پر رک گئی۔ کنارہ پانی کی سطح سے تقریباً دس فٹ اونچا تھا اور بہت ہی کچا خیر مشکل سے جلدی جلدی اوپر پہنچے۔ کیونکہ دیری نقصان کا موجب بن سکتی تھی۔ بلکہ ہمارے اوپر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد طوفانی موجیں پھر کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔ جو مٹی کا تودہ تھوڑی دیر پہلے گرا تھا وہ پانی بہا کر لے جا چکا تھا۔ اور اب اور کنارا کاٹنے کے لئے بے تاب تھا۔ جس جگہ ہم کنارے پر اترے وہاں سے پدما اور مہاندہ کا جنکشن صرف سو گز رہ گیا تھا۔ ہم نے ۴ آدمیوں کو کشتی پدما سے مہاندہ میں لانے کو کہا۔ سب نے مل کر کنارے کے ساتھ چلتے چلتے کشتی کو ایک دریا سے ہوتے ہوتے دوسرے دریا میں ڈال دیا۔ ہم لوگ اللہ کا شکر کرتے ہوئے دونوں دریاؤں کے درمیان آرام کرنے لگے۔ اور دونوں دریاؤں کو خطرناک حالت میں دیکھنے میں مشغول ہوگئے۔ دریائے مہاندہ دریائے پدما کی نسبت پرسکون نظر آرہا تھا۔

اس وجہ سے سے جیسے ہی سپیڈ بوٹ دہانہ میں ہمارے سامنے آئی تو ہم اس کو پار کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حقیقت میں دریا کنارے سے بالکل خطرناک نہیں معلوم ہو رہا تھا اور اس وجہ سے ہم نے احتیاطی تدابیر بھی ختم کر دیں۔ یعنی بوٹ وغیرہ پھر سے پہن لئے اور لائف جیکٹ اتار دیں لیکن ابھی ہم دریا میں صرف دو سو گز گئے ہوں گے کہ ہمیں حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ لہریں اس قدر اونچی تھیں کہ دریا کو سیدھا پار کرنا یا واپس آنا ناممکن تھا۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں کشتی کے ایک طرف لہر کا زور ہوتا اور کشتی دوسری طرف کو الٹ جاتی۔ اس وجہ سے فیصلہ کیا گیا کہ کشتی کو پانی کی لہروں پر چڑھا کر اوپر کی طرف سفر کیا جائے۔ پھر آہستہ آہستہ کنارے کی طرف سفر جاری رکھا جائے۔ دوبارہ بوٹ اتار کر اور لائف جیکٹ پہن کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار بیٹھ گئے۔ لیکن اس دریا کو عبور کرتے ہوئے ڈرائیور نے خوبصورتی اور اپنی ماہرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشتی کو خداوند کریم کے فضل و کرم اور مدد سے باخیریت کنارے لگا دیا۔ کنارے پر پہنچ کر پھر خداوند کریم کا شکریہ ادا کیا۔ خداوند کریم کی مدد کے بغیر اور بزرگوں کی دعاؤں کے بغیر اس سفر سے باخیریت واپسی آنا ممکن نہ ہوتا۔

آج ۱۵ اکتوبر ہے۔ میں کل سونا مسجد سے نواب گنج پہنچا۔ خیال تھا کہ آپ کو اپنے ساتھ ساتھ سفر میں رکھتا۔ لیکن پھر خیال پیدا ہوا کہ اب تو تم پھر سے ماشاء اللہ طالبعلم ہو گئے ہو اور تمہارا وقت ضائع کرنا ناانصافی ہوگا۔ ویسے مشرقی پاکستان کے قدرتی ساحل کا نظارہ کرنا ہو تو لکھو ضرور بیان کروں گا۔ کیونکہ ایسے ساحل تو شاید تم نے کسی انگلش کی پکچر میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔ آئندہ خط میں، میں آپ لوگوں کو یہاں کے رسم و رواج وغیرہ سے واقفیت دلانے کی کوشش کروں گا۔ گو آپ نے مشرقی پاکستان دیکھا ہے۔ لیکن ڈھاکہ اور راجشاہی کے علاقے میں ہر لحاظ سے بہت فرق ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ آصف اب بھی کبھی یاد کر لیتا ہے۔ میری طرف سے آپا جان

کو سلام آداب۔
صفیہ، زیب اور آصف کو پیار۔ میجر صاحب تو امید ہے اکتوبر کا مہینہ باہر ہی رہینگے۔

والسلام

اکرم ملک

پی۔ایس
میں نے سٹینڈرڈ بنک میں ریاض صاحب کو لکھا ہے کہ میرا اکاؤنٹ تبدیل کر دیں لیکن ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ یہاں یہ حالت ہے کہ تنخواہ شروع نہیں ہوئی اور چیک بک سیالکوٹ بھیج دی اور اب ہم پانی پر گزارہ کر رہے ہیں۔ بھئی پانی ہی ایک چیز ہے جو کہ پیسے کے بغیر ملتی ہے۔ لہٰذا اسی پر گزارہ ہو رہا ہے۔ آپ اسے کہیں کہ وہ فوراً میرا اکاؤنٹ یہاں بھیج دے میرا ۱۱۸۹ اکاؤنٹ نمبر ہے۔
نوٹ:۔ ابھی خط بند کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ریڈیو پر آپ کا تحریر کردہ شعر سنا مناسب سمجھا کہ اس کی مقبولیت سے آپ کو واقفیت دلائی جائے۔ شعر تھا۔

اب کے جو ہم بچھڑے تو شاید خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں۔
بعد مرنے کے میری قبر پر رونے آئی ہو
لوگ کہیں گے - - - - - - - - -

ریڈیو مجھ سے تیز ثابت ہوا۔

نواب گنج

ڈیر اصغر ۶۸-۱۱-۷

السلام علیکم!
آپ کے خط کا انتظار کئے بغیر آپ کو مشرقی پاکستان کے علاقے سے واقفیت دلانے

کے ارادے کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا ہے۔ ویسے امید ہے کہ اس خط کے مکمل ہونے تک آپ کا خیریت نامہ مل جائے گا۔ کہاں سے سیالکوٹ یا لاہور؟ گو آپ نے بھی کچھ دن مشرقی پاکستان میں گزارے ہیں اور آصف کے علاوہ گھر کے سب افراد نے ڈھاکہ میں اتنا عرصہ گزارا ہے کہ میرا موجودہ رہائش کا عرصہ اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مشرقی پاکستان کے حالات لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک تو ڈھاکہ اور راجشاہی میں بہت فرق ہے۔ اور دوسرا آپ نے شہری زندگی دیکھی ہوئی ہے۔ جبکہ یہاں تو دیہات ہیں۔ اس تمہید کے ساتھ شروع کرتا ہوں۔ کیوں تمہیں پسند آئی کہ نہیں۔

راجشاہی ڈھاکہ سے تقریباً ۲۵۰ میل کے فاصلے پر ہے اور مشرقی پاکستان کا ایک اہم اور قابل دید شہر ہے۔ یہاں اور ڈھاکہ کے موسم میں کچھ ایسا ہی فرق ہے جیسے کہ کراچی اور جہلم میں۔ یہاں کا موسم شدید ہے۔ گرمی بھی کافی پڑتی ہے اور سردی بھی باقی علاقے کی نسبت زیادہ ہے۔ ۳۱ اکتوبر سے موسم نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں سردی نہیں پڑتی ان کا نالج کس قدر سطحی ہے۔ بارش ایسی شدت سے نہیں ہوتی جیسے کہ باقی علاقوں میں ہوتی ہے۔ زمین کی سطح بھی ایسی ہموار نہیں جیسے کہ جنوبی علاقے میں ہے۔ کافی حد تک اونچی نیچی ہے۔ جس کی وجہ سے بارش کا پانی جلد ہی بہہ جاتا ہے اور علاقہ سیلاب کی زد میں نہیں آتا۔ البتہ ناہموار ہونے کی وجہ سے کچھ جگہیں اس قدر نیچی ہیں کہ پورے پورے سال پانی کھڑا رہتا ہے اور کچھ علاقہ نسبتاً کم گہرا ہے۔ لیکن پھر بھی دریائی پانی کی سطح سے نیچے رہ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایسے علاقے برسات کے موسم میں ۱۰ سے ۱۵ فٹ تک گہرے پانی میں ڈوبے رہتے ہیں اور جھیل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جس میں سے سفر کافی خطرناک ہوتا ہے۔ ہمارے علاقے میں اس قسم کی ایک جھیل کی لمبائی چوڑائی اور گہرائی سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ پانی کیسا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس علاقے میں

سب سے بڑی جھیل کی لمبائی تقریباً ۲۵ میل چوڑائی ۴ سے ۶ میل اور گہرائی ۳۰ فٹ
تک برسات کا پانی ختم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ خشک ہوجاتا ہے اور جنوری
تک دھان کی فصل کاٹنے کے قابل ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جیپ وغیرہ اس
علاقے سے گزر سکتی ہے۔ باقی جگہوں پر پانی نسبتاً کم رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے
کا سب سے بڑا دریا پدما یا گنگا ہے جس کا ذکر میں نے اپنے پہلے خط میں بھی کیا تھا۔ مشرقی
پاکستان کے مغربی حصے کی خوش حالی کا انحصار اس دریا پر ہے۔ اس دریا پر فرخا کے مقام
پر ہندوستانی ایک بند تعمیر کر رہے ہیں۔ جو کہ کافی عرصہ سے پاکستان اور ہندوستان کے
درمیان بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ فرخا سرحد سے آٹھ سے دس میل تک دور ہے اور چند
ایک جگہوں سے تعمیری کام ہوتا نظر آتا ہے۔ اس وقت تک ۵۰ فیصدی سے زیادہ کام
مکمل ہوگیا ہے۔ دریائے پدما جہاں مشرقی پاکستان کی خوشحالی کے لئے لازمی ہے وہاں ہی
برسات کے موسم میں کافی تباہی مچاتا ہے۔ کئی گاؤں اس کے نذر ہوجاتے ہیں اور سفر کے
دوران اکثر حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن برسات کا پانی جو مٹی لاتا ہے وہ اس علاقے
کی فصلوں کے لئے بہت مفید ہے۔ یہ اس تازہ مٹی کا کرشمہ ہے۔ دوسرا بڑا دریا مہاندہ ہے
جو امن پسند ہے نواب گنج اسی کے کنارے واقع ہے۔ اور اکثر دکانیں دریا کے کنارے نظر
آتی ہیں۔ یہی دریا ہمارے ہیڈکوارٹر کے شمال میں باؤنڈری کا کام دیتا ہے۔ گرمیوں میں
دفتر میں بیٹھے بیٹھے پانی کا نظارہ ہوجاتا ہے۔ لیکن سردیوں میں کنارے کے نزدیک پہنچ کر بھی
پانی کے لئے نیچے دیکھنا پڑتا ہے۔ ہمارے کیمپ کے پاس دریا کی گہرائی ۸۰، ۱۰۰ فٹ کے قریب
ہے اور سردیوں میں پانی تقریباً آدھا کم ہوجاتا ہے۔ ان دنوں تقریباً ۲۰ فٹ کی کمی واقع ہو
گئی ہے شمال میں جاکر یہ دریا چند میل تک پاکستان اور ہندوستان کے درمیان باؤنڈری کا
کام دیتا ہے۔ تیسرا دریا پگلا ہے۔ اس کے نام ہی سے اس کی خصوصیت عیاں ہوجاتی ہے
اپنے جسامت کے لحاظ سے زیادہ ہی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ ویسے بھی صرف برسات کا دریا

ہے۔ دو تین ماہ میں تباہی مچانے کے بعد رخصت لے لیتا ہے۔ چند دن ہوئے دیکھنے کا موقع ملا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹا سا نالہ ہے۔ جبکہ برسات میں طوفانی ہو جاتا ہے۔ اور کوئی دریا قابل ذکر نہیں ہے۔

یہاں کی زمین بہت ہی زرخیز اور اپنی زبان میں قابل ہے۔ کاشتکاروں کو فصل بونے اور کاٹنے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اور یا پھر عادی ہی صرف اتنے کام کے ہیں کیونکہ زمین پر کام کرتے کم ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر محنت کریں اور کھاد وغیرہ استعمال کریں تو یہ زمین فصل پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ زمین پر کام کرنے کے بجائے لوگ مچھلیاں پکڑنے میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ دریا سے مچھلیاں پکڑنے کے اتنے اور ایسے ایسے طریقے ہیں کہ آدمی سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ سمگلنگ کو بھی کاروبار میں شامل کرتے ہیں۔ یہاں کی آبادی اور آمد و رفت کے ذرائع ایسے ہیں کہ کوشش کے باوجود اس کو بالکل روکنا ناممکن ہے۔ بات زمین کی ہو رہی تھی اور ہم کدھر چلے گئے۔ خیر یہاں کی مقبول فصلیں دھان اور پٹ سن ہیں۔ اس کے علاوہ ماش کلائی کی دال بہت مقبول ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ بسنے والے اکثر لوگ اسی دال کی روٹی پکا کر کھاتے ہیں۔ چکھنے کا خیال ہے لیکن ابھی فصل تیار نہیں ہوئی ہے۔ گاؤں میں تقریباً ہر ایک گھر میں سبزی نظر آئے گی۔ یہاں پر سبزی لگانے کا بہت شوق ہے اور وہ بھی گھر میں۔ باہر کھیت میں سبزی نہیں بوتے اور نہ ہی اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ سب لوگ اپنی ضرورت کے لئے سبزی لگا لیتے ہیں۔ اس کے لئے چمن کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسے سبزی لگاتے ہیں جس کی ڈالیں چھت پر چلی جائیں اور زمین تین سے چار فصلیں دیتی ہے اور کسی وقت اور کسی حالت میں زمین کا کوئی ٹکڑا خالی نہیں رہنے دیتے۔ پھل کا تو شاید میں نے پہلے ہی لکھا ہے آم اس علاقے کا مشہور پھل ہے اور پورے مشرقی پاکستان میں پھل یہاں سے جاتا ہے۔ اچھا آم روپے کا ۸ سے ۱۰ سیر تک مل جاتا ہے لیکن رہتا صرف دو ماہ کے لئے ہے۔ پھر نواب گنج آم سے خالی ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس آم کی

بدولت دوسرے شہروں میں آم کی منڈیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ آم کے علاوہ پپیتا بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ باقی پھل تھوڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ میرے اپنے مکان میں گولان چھوٹا ہے۔ لیکن پھر بھی پپیتا کے ۶ درخت، اناس ۱۵ درخت کے علاوہ ٹماٹر، پالک، پیاز، لہسن، دھنیا، گوبھی اور ایک مشرقی پاکستان کی سبزی جس کا نام مجھے معلوم نہیں۔ لگی ہیں۔ اس فارم میں بیڈمنٹن کورٹ بنایا ہوا ہے اور ایک عدد مرغی فارم بھی ہے۔ ایک مرغی کے بچوں کی عمر ۷ دن ہوگئی ہے اور دوسری نے ابھی تک پانچ بچے نکالے ہیں۔ دیکھیں پندرہ پورے نکالتی ہے یا نہیں۔ اور تیسری مرغی اتوار کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ کھانے کے لئے مرغوں کی فوج موجود رہتی ہے (۱۰ سے ۲۰ کے درمیان) دیکھا میں کیسے بھٹک گیا۔ آپ کو راستہ ہی دکھلاتے دکھلاتے گھر لے آیا۔ تو چلئے پھر کوچ کریں اسی زمین کی دوا ور خصوصیات تو بتانا بھول ہی گیا۔ برسات کے موسم کے علاوہ یہاں اس قدر گرد ہوتا ہے کہ ملتان، بہاولپور پناہ مانگتے ہیں۔ ابھی بارش ہوئے دو ماہ بھی نہیں ہوئے لیکن گرد نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ اور سردیوں میں پتا چلا کہ طوفان اس گرد کو اور بھی مقبول کرتے ہیں۔ دوسری چیز کیکر کے درخت ہیں جو اس علاقے میں اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ کیکر کے جنگل میں ہیں یا پھر باغ اور باغ سے ہمیں پھر اپنے گھر میں پودینہ کا باغ یاد آگیا جس کا ذکر خیر میں پہلے کرنا بھول گیا۔ بھئی کیا سمجھے ہو اپنے بھی پودینے کے باغ ہیں۔

موسم اور علاقے کے ساتھ ساتھ یہاں کی آبادی بھی پنجاب سے ملتی جلتی ہے۔ جنوبی علاقے کی نسبت یہاں کی اکثریت اونچے قد، چوڑی جسامت اور گورے رنگ کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ زیادہ آدمی اونچے، گندمی یا گورے رنگ کے ہیں اور اپنے علاقے کا لباس پہن لیں تو پہچاننا مشکل ہو جائے کہ بنگالی ہیں کہ پنجابی۔ ویسے کالوں کی بھی خاصی تعداد موجود ہے۔ مرد ملازمت کو خاص پسند نہیں کرتے۔ کھیتی باڑی اور تجارت کا پیشہ اختیار کرتے

ہیں۔ البتہ اب تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ لوگوں کا لباس سادہ ہے۔ گاؤں میں مرد لنگی بنیان یا قمیض پہننا پسند کرتے ہیں۔ جوتوں کا خاص رواج نہیں۔ شہر میں قمیض اور لنگی ہی لباس ہے۔ عام مرد جوتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شہر میں تقریباً سب مرد چھتری استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ گاؤں میں پتوں سے بنا ہوا ہیٹ۔ یہ گرمیوں میں لباس کا لازمی جزو ہے۔ شاید ہی کوئی آدمی اس کے بغیر نظر آئے۔ عورتوں کا لباس تو بالکل سادہ ہے۔ ایک چادر کا کپڑا جس کو یہ ساڑھی کے طور پر استعمال کرتی ہیں اور گاؤں میں شاید ہی کوئی عورت ایسی نظر آئے جس نے ساڑھی کے نیچے بلاؤز پہنا ہو۔ اور اسی طرح گھر کا کام کاج کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے پردہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف ساڑھی نامکمل سا لباس ہے۔ عورت کے جسم کا کافی حصہ ننگا رہتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس حالت کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ مردوں کو اور نہ ہی عورتوں کو اس لباس میں کوئی عیب نظر آتا ہے۔ البتہ وردی پہنے ہوئے آدمی کو دیکھ کر جسم کو کپڑے میں لپیٹنے یا بھاگ کر گھر میں چلے جانے کا فضول رواج ہے کیونکہ باقی مردوں کے سامنے تقریباً ننگی حالت میں گھومنے پھرنے یا کام کرنے میں کوئی برائی محسوس نہیں ہوتی۔ شہر میں اکثر عورتیں بلاؤز پہنتی ہیں۔ خاص کر امیر گھرانے کی سب عورتیں ایسا لباس پہنتی ہیں۔ بلاؤز پہننے سے لباس کافی حد تک مکمل ہو جاتا ہے۔ ویسے لباس میں ایک خوشنما تبدیلی نظر آ رہی ہے۔ سکول میں جانے والی لڑکیاں شلوار قمیض پہنتی ہیں اس طرح امید ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ لباس اس حصے میں کافی مقبول ہو جائے گا۔ اس علاقے میں ایک بات اور دیکھنے میں آئی ہے کہ کھاتے پیتے گھرانے کی عورتیں اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو معیوب سمجھتی ہیں۔ ۴۰۰، ۵۰۰ روپے سے زیادہ تنخواہ پانے والے گھروں میں عورتیں اور لڑکیاں کھانے پکانے اور دیگر کاموں سے احتراز کرتی ہیں۔ یہی حالت تاجروں اور بڑے زمینداروں کی ہے۔ میرا ہمسایہ ایک لکھ پتی ہے۔ اس کے گھر تو تین چار نوکر نظر

آتے ہیں اور یہی حالت گلی کے پار رہنے والے ڈاکٹر کی ہے۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ ایک نوکر رکھنے کی بھی ہمت نہیں ہے۔

مشرقی پاکستان کے باقی حصوں کی طرح یہاں بھی تعلیم عام ہے۔ جگہ جگہ ہائی سکول اور کالج ہیں۔ نواب گنج جو کہ ایک سب ڈویژن ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کے کالج ہیں۔ اس علاقے میں دو دیہات جہاں کہ کالج ہیں۔ ان کا فاصلہ صرف چھ میل ہے ہائی سکول تو جگہ جگہ ہیں۔ دیہاتوں میں ہائی سکول تک مخلوط تعلیم کا انتظام ہے۔ جبکہ شہروں میں سکول الگ الگ ہیں۔ غریب لڑکوں کو پڑھائی میں مدد دینے یا تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ دینے کے بارے میں ایک اچھا رواج ہے۔ غریب بچے جن کے گھروں کے نزدیک سکول نہ ہو وہ جہاں اسکول واقع ہیں اس گاؤں میں چلے جاتے ہیں اور وہاں کسی کھاتے پیتے گھرانے میں رہ کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں کتابوں اور فیس کے خرچ کے علاوہ رہنے کھانے پینے کا خرچ طالب علم سے نہیں لیا جاتا ہے۔ اس طرح اس کو پڑھائی کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ طریقہ دیہاتوں اور نواب گنج جیسے چھوٹے شہروں میں ہے۔ بڑے شہروں میں تو خیر ممکن نہیں ہے۔ اتنے سکول کالج اور سہولتیں ہونے کے باوجود تعلیم کا معیار اچھا نہیں ہے۔ پڑھائی دس بجے شروع اور تین بجے سکول بند ہو جاتے ہیں۔ مغربی پاکستان کی نسبت چھٹیاں بھی زیادہ ہیں اور اس پر مزے کی بات یہ کہ سکول میں طالب علم پڑھائی کے لئے نہیں صرف حاضری کے لئے جاتے ہیں۔ اور حاضریاں کس قدر ہوتی ہیں اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ میٹرک کے طالب علم امتحان سے چار ماہ پہلے سکول سے فارغ ہو جاتے ہیں یہ وقت ان کو پڑھائی کی تیاری کے لئے دیا جاتا ہے۔ سالانہ چھٹیاں اس کے علاوہ ہیں۔ یہی حالت دوسرے امتحانوں کے سلسلوں میں ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ طالب علم استادوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اکیلے اکیلے تو یہ لوگ بزدل ہیں۔ لیکن گروپ میں مشرقی پاکستان کے طالبعلم فساد جھگڑا پسند کرتے ہیں۔ ڈسپلن نام کی کوئی چیز ان لوگوں نے سنی نہیں ہے۔ جس چیز کو

جی چاہتا ہے غلط استعمال کرتے ہیں۔ ریل گاڑی کو تو وہ اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ اور بغیر ٹکٹ ٹکٹ سفر کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ ریلوے اسٹاف نے بھی ان کو اپنا گورو مانا ہوا ہے۔ اور غلطی سے بھی ان کو پکڑنے یا ٹوکنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ جب فسٹ کلاس کا مسافر نہ ہو تو ٹکٹ چیکر اور طالب علم مل کر فسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ چیکر کا قصور بھی تو نہیں۔ اس کو اپنی جان عزیز ہے۔

آپ کی اجازت کے بغیر ۵ دن غائب رہا ویسے امید ہے کہ آپ کو محسوس نہیں ہوا ہو گا۔ اس خیال سے کہ ابھی تو آپ کے خط آنے میں چند دن ہیں میں نے اس عبارت کو نوٹ کر لیا اور اس دوران بھی راجشاہی جانے کی ضرورت پڑ گئی۔ اور وہاں سے واپسی پر جانے کا خیال آگیا۔ اور اس طرح بغیر چھٹی کے غیر حاضری کا عرصہ کافی لمبا ہو گیا۔ شروع میں خیال تھا کہ آپ کو مرغی کی بچہ کاری پر کمینٹری سناؤں گا۔ لیکن اس کام کو پورا نہ کر سکا۔ ویسے امید ہے کہ آپ نے امریکہ کے صدر کے انتخاب کے سلسلے میں وائس آف امریکہ سے نشر ہونے والی کمینٹری تو ضرور سنی ہو گی اور اگر نہیں سنی تو کم از کم نتیجہ پر اکتفا کیا ہو گا۔ اس کیس میں بھی آپ کو نتیجہ سے آگاہ کرنا کافی سمجھوں گا۔ تو خیر بچوں کی فوج کی نفری گیارہ اور آٹھ ہے۔ اس طرح سے چھوٹے بچوں کی تعداد ۷ تک پہنچ گئی ہے اور اس کے ساتھ رونق بھی۔

ہاں تو ۷ نومبر کو ہم کیا بات کر رہے تھے۔ خیر یاد آیا طلبا، اور ریلوے کا نظام زیر بحث تھا۔ تو ابھی ریلوے کے ساتھ ساتھ باقی ٹرانسپورٹ کا جائزہ لیتے ہیں۔ مغربی پاکستان کی گاڑیوں میں سفر کرنے کے بعد پاکستان کے اس حصے کی گاڑیوں میں سفر کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ ریلوے سروس سست رفتار ہونے کے ساتھ ساتھ بدانتظامی کا ایک مکمل نمونہ ہے ڈھاکہ سے نواب گنج آتے ہوئے ڈھاکہ کے عظیم ریلوے سٹیشن پر جو حالت ہوئی تھی۔ اس کے بعد فی الحال اس سروس سے فائدہ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی ہے۔ ویسے ریلوے حکام کا بھی زیادہ قصور نہیں ہے کیونکہ ۵۰ فیصد سے زیادہ مسافر بغیر ٹکٹ کے سفر کرنے

کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ریلوے تو خیر پھر سفر کرنے کے قابل ہے۔ لیکن روڈ ٹرانسپورٹ سروس تو بالکل ہی قابل رحم ہے۔ نواب گنج ایک سب ڈویژنل شہر ہے اور اس کے اور راجشاہی کے درمیان صرف ۳۰ میل کا فاصلہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود صرف ۵، ۶ بسیں دونوں شہروں کے درمیان چلتی ہیں اور ان کی حالت ایسی خراب ہے کہ موجودہ زمانے میں ان بسوں میں سے کوئی بس اپنے گاؤں کی سڑک پر روانہ ہو تو ممکن نہیں کہ کوئی آدمی اس میں سفر کرنا پسند کرے اور صرف یہی نہیں کہ بسیں پرانی اور آرام دہ نہیں ہیں بلکہ نواب گنج اور راجشاہی کے درمیان ۳۰ میل کا فاصلہ طے کرنے میں تین گھنٹے تک کا وقت صرف کرتی ہیں۔ جبکہ ریل گاڑی راجشاہی گھوم کر جاتی ہے اور دونوں شہروں کا فاصلہ ۶۰ میل تک ہوجاتا ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان سڑک دو حصوں میں مکمل ہوتی ہے۔ سڑک کا ۲۰ میل کا ٹکڑا مارشل لاء کے فوراً بعد ۱۹۶۰ء میں بنا تھا۔ جبکہ دوسرا ۱۰ میل کا ٹکڑا ۶۶-۱۹۶۵ء میں بنا۔ پہلے کی بنی ہوئی سڑک سے گاڑی چلانے کا لطف آجاتا ہے۔ جبکہ نئی سڑک پر دوران سفر کھایا پیا آسانی سے ہضم ہوجاتا ہے۔ سڑکوں کو بہتر بنانے کے لئے یہ لوگ جس ایمانداری اور جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ اس کی جھلک آپ کو بھی دکھلا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نواب گنج اور ایک اور قصبے کے درمیان ۱۰ میل سڑک کے لئے حکومت نے ۹۸ لاکھ روپے منظور کئے۔ اس رقم کے کچھ حصہ یعنی ۸۷ لاکھ روپے میں منظور شدہ سڑک کا بڑا حصہ یعنی چھ میل سڑک مکمل ہوگئی اور صرف چھ ماہ استعمال کے بعد بیماری کی فہرست پر چلی گئی۔ خیال رہے کہ ۶ میل سڑک ۸۷ لاکھ روپے میں بننے کے بعد صرف ۶ ماہ استعمال کے بعد نازک حالت اختیار کر گئی کہ لوگوں کی چیخ و پکار کے نتیجے میں حکومت کو مجبوراً تفتیش کرانی پڑی۔ تفتیش کا نتیجہ کیا ہوگا وہ تو سوچنے کی بات نہیں ہے۔ نواب گنج کی مقبول اور ہر دلعزیز روڈ ٹرانسپورٹ بیل گاڑی ہے۔ نواب گنج کے تقریباً سب علاقے میں زیادہ تر لوگ اس میں سفر کرتے ہیں۔ سست ہونے کے ساتھ ساتھ تکلیف دہ بھی ہے

لیکن مجبوری، اس سے ایک قدم اوپر بڑے قسم کی چیز ہے۔ جس کو یہ لوگ ٹم ٹم سے یاد کرتے ہیں۔ اچھی سڑکوں پر وہ سروس بھی چلتی ہے یہ تو رہا سڑک۔ اب دیکھئے دریا اور نالے مشرقی پاکستان تو دریاؤں نالوں کا ملک ہے۔ اس وجہ سے شاید کبھی سکندر مرزا نے بنگال کو ہندوستان کا ہاتھ روم کے نام سے یاد کیا تھا۔ تو خیر ملک کے زیادہ حصے دریائی پانی سے ملے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں کے درمیان جو کہ دریا سے ملے ہوئے ہیں سٹیمر سروس چلتی ہے۔ جبکہ عام علاقے میں کشتیوں سے سفر کرنے کا رواج ہے۔ کشتی تو تقریباً ہر گھر میں ہوتی ہے اور لوگ اکثر اس کا استعمال کرتے ہیں اور کوئی کام نہ ہو تو دریا میں مچھلی پکڑنے میں مشغول ہو جاتے ہیں ٹرانسپورٹ کے لحاظ سے دریائی سروس بھی بہت ناقص ہے سفر کا دارومدار پانی کی رفتار، طوفان اور ہوا کے رخ پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر موسم خراب ہونے کی صورت میں چار پانچ میل چوڑائی کا یہ دریا ۳۰ منٹ میں عبور کر سکتے ہے لیکن اگر موسم موافق ہو لیکن ہوا مخالف ہو تو بھی دریا عبور کرنے میں چار سے پانچ گھنٹے تک وقت صرف ہو جائے تو عجیب نہیں ہوگا۔ بچپن میں ہی اس کام میں شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور پوری زندگی ساتھ رہتا ہے۔ تیرنا بھی بچے چھوٹی عمر میں سیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور دونوں مرد عورتیں تیرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ بیل اور گائے بھی دریا کو عبور کرتے میں کافی ماہر ہیں۔ اپنی طرف تو یہ نسل پانی کے نزدیک نہیں آتی شاید یہاں مجبوری اور قدرتی بات ہے۔

آپ کا خط کل ملا۔ آپ کے خط کے ساتھ اقبال کا۔ اور آج مشتاق کا خط ملا۔ اس کے بچے کی پیدائش کی خبر سب میں نمایاں تھی۔ ریاض کو میں ایک نمکین خط لکھنے کا موڈ بنا رہا ہوں۔ تین ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس کو اپنی حالت پر ترس نہیں آتا۔ میرے خیال میں اس کو چٹنی کی ضرورت ہے شاید اس سے ہماری رقم نواب گنج پہنچ جائے۔

چند دن ہوتے آپ کی رجمنٹ یعنی سگنل سے ایک میجر صاحب کا نوابگنج آنے کا

اتفاق ہوا۔ اور ہم نے فراخدلی سے ان کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی اور وہ ہمارا گھر دیکھ کر گھبرا ہی تو گئے۔ اور اس کے سوا کچھ نہ پوچھ سکے۔ آپ اس (گیارہ روم) مکان میں اکیلے کیا کرتے ہیں۔ میں اس کے سوا کیا جواب دے سکتا تھا کہ کمروں سے آنکھ مچولی کرتا ہوں۔ کیوں کیسا رہا؟

میری طرف سے بھائی صاحب اور ہمشیرہ صاحبہ کو سلام آداب، چھوٹوں کو پیار یہ خط کافی بور ہوگا۔ لہٰذا آئندہ خط دلچسپ ہوگا۔ انشاء اللہ۔ لیکن آپ لاہور پہنچ تو لیں تب

والسلام

اکرم ملک

نواب گنج

۲۲-۱۲-۶۸

ڈیر اصغر

السلام علیکم!

آپ کا ارسال کردہ خط اور ایک دلفریب عید کارڈ موصول ہوا۔ شکریہ۔ آج عید مبارک کا دن ہے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بجے ہیں اور میں ابھی عید پڑھ کر واپس گھر آیا ہوں۔ جبکہ شہر کے لوگ خوب گہما گہمی میں عید گاہ کی طرف جاتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ ہاں بھائی عید پڑھنے کے وقت مختلف ہیں۔ ہم لوگ فوجی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے نو بجے صبح خداوند کریم کے حضور حاضر ہوتے۔ جبکہ اس وقت شہری ابھی تک گھروں میں عید کی تیاری میں مصروف تھے۔ اب جبکہ یہ لوگ عید گاہ کو تشریف لے جارہے ہیں ہم کمرے میں داخل ہوگئے ہیں۔ اور عید سونی سونی ہے۔ پڑوسی کے بچے جو کہ کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ وہ بھی عید کا ثواب حاصل کرنے کی تلاش میں عید گاہ پہنچ چکے ہیں۔ البتہ سب سے چھوٹی بیٹی۔ جو آصف کی عمر کی ہوگی میرے گھر میں آتے ہی آگئی ہے۔ بلکہ اس کی امی

نے خود ہی اس کو میرے صحن میں دھکیل دیا ہے۔ ممکن ہے یہ اسے کھانا پکاتے ہوئے تنگ کرتی ہو۔ یا پھر اسے میرے اکیلے ہونے کا خیال ہو۔ خیر میں نے اسے پھل وغیرہ پیش کئے لیکن انہیں دیکھتے ہی وہ رونے کو تیار ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پھل وغیرہ کبھی نہیں کھائے۔ لیکن جب میں نے اسے مٹھائی دی تو خوشی سے تیار ہوگئی۔ بلکہ ایک دم سے کھانے میں مصروف ہوگئی۔ ہاں بھئی کون بچہ مٹھائی پسند نہیں کرتا۔ مشرقی پاکستان کی مشہور مٹھائی ہے اور خاص کر نواب گنج کی۔ کہ یقین نہ آئے تو کرنل اسماعیل ۴ ایف ایف سے تصدیق کرسکتے ہیں جو اس کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ اس وقت میرے ٹرانسسٹر پر وہ گانا ہو رہا ہے۔ میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند سا مکھڑا رہتا ہے۔ جو یہاں بھینس کے آگے بین بجانے کے مصداق ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ عید کا دن ہے اور میں اس وقت گھر میں تقریباً اکیلا ہوں بالکل اکیلا تو نہیں ہوں۔ پچھلے سال یہ عید میں نے سیالکوٹ یونٹ میں دوستوں کے ساتھ گزاری۔ جبکہ بڑی عید آپ لوگوں اور دوستوں کے ساتھ کافی پرلطف رہی۔ گیارہ بجے ونگ ہیڈکوارٹر میں کھانا ہے اور اس کے بعد ایس۔ ڈی۔ او کے ہاں دعوت ہے۔ لنچ ان کے ساتھ ہی ہوگا۔ یہ ایس۔ ڈی۔ او چند دن ہوئے یہاں آیا ہے۔ مغربی پاکستان کا ہے۔ لائل پور سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ بال بچے اس کے ساتھ ہیں جب کہ ہمارے ونگ کمانڈر کے بچے مغربی پاکستان گئے ہوئے ہیں۔ ہم تو خیر اکیلے ہی ہیں اور شاید ایسے ہی دنیا سے گزر جائیں گے۔ تو ان حالات میں ایس۔ ڈی۔ او کا دعوت نامہ قبول کرلیا کیونکہ عید بہرحال فیملی، بچوں میں ہی اچھی ہوتی ہے اور یا پھر دوستوں کے ساتھ۔ بڑے کھانے کے لئے جانے میں (یعنی گیارہ بجنے میں) ابھی کچھ وقت ہے۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ آپ کے خط کا جواب ہی دے دیا جائے۔ آپ کی جگہ کی نسبت یہاں کا موسم اچھا ہے۔ دن کو اکثر دھوپ رہتی ہے۔ کبھی کبھار بادل نظر آتے ہیں۔ ورنہ صبح دفتر میں بیٹھنے کی بجائے

دھوپ میں دفتر لگانا سود مند ہوتا ہے۔

البتہ دس بجے کے بعد دھوپ میں بیٹھنا سود مند نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد دھوپ کچھ زیادہ ہی گرم ہو جاتی ہے۔ یہاں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ واپڈا والے بہت اچھے آدمی ہیں پچھلے پانچ ماہ میں میں نے بجلی خراب ہوتے نہیں دیکھی۔ حالانکہ شروع شروع میں تو بارشوں اور طوفانوں کی وجہ سے موسم بھی کافی خراب رہا لیکن مرحبا ہمارے واپڈا کی۔ وہ پھر بھی آب وتاب کے ساتھ دنیا کو روشن کرنے میں مشغول رہی۔ خیر دنیا کہنا تو زیادتی ہو گی۔ کیونکہ یہ کیفیت صرف نواب گنج ہے۔ جبکہ یہاں کے دوسرے شہروں میں بھی بجلی کی خرابی کی شکایات ہوتی رہتی ہیں۔ گو آپ کے ملک سے کم۔ کیا سمجھے۔

اچھا تو سردی کی وجہ سے خط لکھنے کا موڈ نہیں رہا اور اپنی یہ حالت ہے کہ اکیلے بور ہو گئے ہیں۔ خط لکھنا تو ایک طرف کسی کام کے کرنے کا موڈ ہی نہیں بنتا۔ خط لکھنے کے لئے تو دل گردے کی ضرورت ہے۔ لیکن آج عید کا دن ہے ایسے دن نیک کام کرنے کے لئے دل کو مجبور کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ خود بخود اچھا کام شروع کر دیتا ہے۔ اور وہ آپ ان صفحات میں دیکھ رہے ہیں۔ ورنہ شاید ہم آج یہ خط نہ لکھتے۔

جہلم سے خط لکھنے والا کون ہو سکتا ہے۔ جواب ایسا آسان نہیں ہے جیسا ممکن ہے بھائی صاحب حنیف ہوں۔ لیکن زیادہ امکان ہے کہ آپ کے لیکن آپ کے خط سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ کیونکہ آپ نے خط پڑھ کر ایک دم سے الگ رکھ دیا اور پھر مجھے خط لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ خط بھائی ملک حنیف صاحب کا تھا نہ کہ ان کا۔

آپ اگر نہ لکھیں تو پھر بھی ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ آپ کہاں اتنا عرصہ غائب رہے ہیں کہ ایک ایک ماہ تک ہمیں خط کے جواب کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ خیر آپ کی مصروفیت کی باتیں ہیں ہمارے خط کا کیا ہے۔ فرصت ہوئی لکھ دیا ورنہ اور ان دنوں فرصت ملنا

تو کچھ مشکل ہی نظر آتا ہے۔ لاہور سے راولپنڈی کا ایک چکر اس میں گاؤں کی سیر بھی
شامل ہے۔ گریزن سینما اور سیالکوٹ مارکیٹ کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ وہ تو پتہ
ہی ہے اور پھر آصف بھی تو کافی ورزش کراتا ہوگا۔ کیونکہ ٹھیک تو کہا میں نے ایسی
مصروفیت میں مشرقی پاکستان خط لکھنا ناممکن آپ کبھی کبھی خط لکھنے کا موڈ تو بنا لیتے ہیں ہیں۔
آپ کی جگہ ہوتا تو یہ بھی مشکل ہوتا۔ آپ پڑوسی گریزن سینما جا کر دیکھتے ہیں۔ بلکہ ہم اپنے بستر
پر لیٹے لیٹے پڑوسی کو دیکھنے کا شرف حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ خط لکھنے کے دوران بھی کئی موقعہ
پر ان کی زیارت ہو چکی ہے۔ عید کا دن ہے کھانے پکانے کی بھیڑ ہے۔ اور پھر ہمارے پڑوسی
آجکل دوسری منزل کی چھت پر کھانا پکاتے ہیں۔ کھانا پکانے کے سلسلے میں وہ اوپر نیچے
کے چکر لگا رہے ہیں۔ اس طرح کبھی کبھی آنکھیں مل جاتی ہیں ہاں تو کیا کہہ رہا تھا یاد آیا عید
کا دن ہے۔ دن کے گیارہ بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔ اب ونگ ہیڈکوارٹر کو کوچ کرنے
کا ارادہ ہے۔ اور وہاں سے ایس۔ڈی۔او کے گھر جائیں گے۔ اور امید ہے کہ ۳، ۴ بجے کو
واپسی ہوگی۔ اور اس وقت تک لکھنے کا موڈ ہوا تو پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے
ورنہ عید کا کھایا پیا ہضم ہونے پر آئندہ ملاقات تک خدا حافظ۔

عید کو گزرے ۱۲ سے زیادہ گھنٹے ہو چکے ہیں اور اب ہم ایک اور عید کے انتظار میں
ہیں ہاں بھائی ۲۵ دسمبر بھی کی تو عید کا سا دن ہے گو اس کی اہمیت وہ نہیں ہو سکی جو
کہ عید الفطر اور بقر عید کی ہے۔ لیکن اپنی جگہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ عیسائیوں کے لئے
عید اور پھر پاکستانیوں کے لئے بھی تو خوشی کا دن ہے اور خاص کر چھٹی کا دن ہے۔ گو آج
کل ہم چھٹی خاص پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ پورا دن بغیر کام کے گزارنا مشکل ہوتا ہے۔ اور پورا
دن یا زیادہ وقت پڑھنا اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ بلکہ آج کل تو پڑھنے کا موڈ بھی نہیں
بنتا ہے۔ ہاں عید تو رخصت لے چکی ہے لیکن ہمیں ابھی تک آپ نے رخصت نہیں دی۔ اس
سے پہلے کہ ہم اپنی عید کے بارے میں کچھ لکھیں اپنے خط میں چند ایک سوال ہیں جن کا جواب

زیت ممکن ہے۔

آپ کو کس نے بتایا کہ باس اب ہمارے اولڈ باس بن گئے ہیں۔ نہیں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ہمارے باس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا خط نہ ملنے پر بھی ہم نے دو تین خط لکھنے پر اصرار کیا ورنہ جواب نہ دینا ان کی عادت میں شامل ہے۔ البتہ ہماری بھابھی کے خط کا جواب دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس خط میں کوتاہی نہیں کرتے جبکہ باقی سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ اچھا تو اچھا تو آپ گاندھی کی سرزمین کے اوپر سے گزر کر اس طرف آنا چاہتے ہیں۔ سفر مبارک ہو ہم انتظار کریں گے اگر کہیں تو ان کا کام کرنے کے لئے جوان مقرر کر دیں۔

یہ سچ ہے کہ آپ نے ایک ماہ تک خط کا جواب نہیں دیا۔ اور میں نے پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ اس کی تصدیق میرے خط سے ہو گی۔ اور پھر آپ نے نہیں پوچھا تو کم از کم اپنے اردلی سے ہی پوچھ لیتے۔ خیر خط تو آتے رہے ماسوائے آپ کے اور پھر گھر سے۔ گھر سے تو چند دن ہوئے ایک خط ملا۔ جب کہ اس سے پہلے خط کوئی تین ماہ پہلے آیا تھا۔ خیر دونوں طرف یعنی آپ اور گھر یاد دہانی بھیجنے کی ضرورت پڑی اور اتفاق سے دونوں طرف سے خط موصول ہوگئے۔ جبکہ میرے لکھے ہوئے خط شاید ابھی جبکہ ڈھاکہ ہوائی سفر کے لئے قطار میں کھڑے ہونے تھے۔ خیر اچھا ہوا آپ عید سے پہلے پہلے آپ لوگوں کی خیریت کی اطلاع مل گئی اور ساتھ ہی عید مبارک بھی۔

اچھا تو آپ کی داڑھی بے قابو ہو رہی ہے کچھ اس قسم کی تکلیف ہمارے ایک جوان کو ہے۔ آج دن میں ایک درخواست پڑھ رہا تھا جوان کی داڑھی تو بالکل بے قابو ہو رہی تھی۔ جو ان کے لئے تو ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ اس کو لگام دے اس وجہ سے اس نے درخواست دے دی ہے کہ اسے داڑھی رکھنے کی اجازت دی جائے۔ آپ کا خط پڑھنے کے بعد مجھے اس کی پریشانی اور تکلیف کا صحیح اندازہ ہوا اور میں نے ایک دفعہ اس کی درخواست منظور کرتے

ڈاڑھی بڑھانے کی اجازت دے دی۔ ونگ کمانڈر صاحب آج صبح ایک ماہ کی رخصت پر روانہ ہوتے ہیں۔ لہذا ایک ماہ کے لئے مابدولت ہی ونگ کمانڈر ہوں گے۔ میرے خیال میں آپ بھی اس کے تجربہ سے فائدہ اٹھائیں اور آپ کو تو اجازت نامہ کے لئے ضرورت نہیں ہو گی۔ کم از کم فی الحال نہیں بعد کی ذمہ داری میں نہیں لے سکتا۔

میرے خط کی ترتیب شاید آپ کو بھلی نہ لگے۔ لیکن اس میں میرا قصور بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جس ترتیب سے آپ نے درج کی ہیں اس ترتیب سے جواب دیتا جا رہا ہوں تاکہ ۱۰۰ فیصد پرچہ حل ہو جائے۔ ہاں بھائی ۱۰۰ فیصد حل کیا تو کہیں ۴۵ فیصد نمبر ملیں گے۔ اور سیکنڈ ڈویژن مل سکے گی۔ کیونکہ اس سے کم اور فیل میں تو آج کل خاص فرق نہیں ہے۔ گو صدر صاحب نے اعلان کیا ہے۔ تھرڈ ڈویژن کو بھی پاس تصور کیا جائے گا۔ اور داخلہ مل جائے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے جبکہ سیکنڈ ڈویژن والوں کو بھی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے ہم زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ تمہید لکھنے کی ضرورت اس وجہ کہ آپ کے خط میں دوبارا واپڈا کا ذکر پڑھ کر اپنے واپڈا کی کارکردگی کے بارے میں کچھ اور لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ عید کے دن شہر کے باہر بڑے اجتماع میں لاؤڈ سپیکر وغیرہ کا انتظام تھا۔ لیکن عید کا وقت ہونے سے عین پہلے بجلی فیل ہو گئی۔ سب لوگوں نے واپڈا کو کوسنا شروع کر دیا۔ جلدی سے بیٹری کا انتظام کیا گیا اور نماز عید ادا ہوئی۔ جب ہم۔ ایس۔ ڈی۔ او کے گھر گئے تو اس نے اس حادثہ کا ذکر کیا اور کہا کہ بجلی کا جتنا اچھا انتظام نواب گنج میں ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے لیکن یہاں پر انہوں نے آج ہی عید کے مبارک دن نا امید کیا ہے۔ پتہ نہیں وجہ کیا ہے خیر بعد میں واپڈا کے ریزیڈنٹ انجنیئر سے پتہ چلا کہ انہوں نے عید پڑھنے کے لئے سب آدمیوں کو چھٹی دے دی تھی۔ جس کی وجہ سے بجلی کا انجن دو گھنٹے کے لئے بند کر دیا گیا تھا تو یہاں پر بھی بجلی فیل ہونے اور آپ کے ہاں بجلی فیل ہونے میں نمایاں فرق تھا۔

آپ لکھتے ہیں کہ بابا جان یہاں آتے ہوئے ہیں۔ بھائی کافی دن ہوتے ہم نے ان کو

واپس روانہ کر دیا تھا۔ ہوائی جہاز بھیجا تھا۔ امید ہے پہنچ گئے ہوں گے۔ انہی دنوں چھوٹے بابا جان بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دن زیادہ ہی دن گھومتے رہے۔ اصل میں انہوں نے پہلے اچھی طرح مشرقی پاکستان کی سیر نہیں کی تھی۔ اب کے تو خوب سیر رہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شادی یا پھر نکاح کی رسم میں انہوں نے حصہ لیا تھا۔ کیونکہ ان کے کپڑوں پر کافی رنگ نظر آرہا تھا۔ ان کو بھی ہم نے عید کے دو دن پہلے رخصت کر دیا تھا۔ البتہ ان کو پھر دعوت دی ہے کہ ۴، ۵ جنوری کو تشریف لائیں امید ہے آخر خدمت کا موقعہ دیں گے۔ آپ کا جوان دوست تو سنا ہے آج کل چلہ کاٹ رہا ہے عید بھی شاید اکیلے کی ہو گی۔ ہاں بھئی یہ تو چلے کی شرائط میں شامل ہے صبر اور عبادت کے بعد ہی کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

مرغیاں بہت بڑی مقدار میں ایکسپورٹ کر دی ہیں آپ ہی تو پوچھ رہے تھے کہ آپ ایکسپورٹ کرتے ہیں یا کہ نہیں ہم نے سوچا کہ نہ جواب دینا اچھا نہیں ہو گا لہٰذا جلد از جلد ایکسپورٹ کرنا شروع کر دیں۔ پانچ درجن کے قریب مرغیوں میں سے اب اپنے پاس صرف نصف درجن رہ گئی ہیں۔ کیا خیال ہے۔ ایکسپورٹ ریٹ پسند آیا یا کہ نہیں۔ اس رفتار سے اگر پاکستان سامان دوسرے ملکوں کو ایکسپورٹ کرے تو ہم بہت جلد مالی لحاظ سے پوزیشن مضبوط کر سکتے ہیں۔ خیر میں نے اپنی مرغیاں کسی ملک کو ایکسپورٹ نہیں کیں بلکہ اللہ میاں کو ایکسپورٹ کی ہیں۔ ہاں بھئی سچ ہی تو کہہ رہا ہوں۔ مرغیوں کے ساتھ آپ کا سوال بھی ختم ہو رہا ہے آئندہ ملاقات تک رخصت۔ خدا حافظ۔

آج اتوار کا دن ہے۔ نہیں نہیں بھائی اتوار تو بہت دور ہے البتہ آج سماں اتوار کا سا ہے۔ صبح کے آٹھ بج چکے ہیں۔ ماید ولت ابھی تک رضائی کو لپیٹے بیٹھے ہیں۔ کیا کہتے ہو کس خوشی میں اتوار منائی جا رہی ہے۔ نہیں سمجھے بھائی آج ۲۵ دسمبر ہے۔ بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح کا یوم پیدائش ہے۔ ویسے ۲۶ دسمبر کو پیدا ہوئے تو اس صورت میں دو چھٹیاں ملنے کا امکان تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے انہیں کرسمس ڈے سے خاص رغبت تھی۔ اسی وجہ سے

تو اس دن میں تشریف فرما ہوئے یا پھر یہ خیال تھا کہ قوم زیادہ چھٹیاں منانے کی عادی ہو جائے گی۔ لہذا پہلے ہی چھٹی کے دن کو چھٹی کر دینا مناسب سمجھا۔ خداوند کریم بھی تو کچھ اس فارمولے پر عمل کرتے ہیں۔ ۲۷ر اکتوبر پھر عید دونوں آتوار۔ گو یہ تو بھلا ہو حکومت کا انہوں نے ۲۸ر اکتوبر کو بھی چھٹی دے دی۔ لیکن عید کے دوسرے دن کو چھٹی کا فتویٰ تو مولوی ہی دے سکتا ہے۔ اور ایسے دل گردے والا مولانا دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

خیال تھا کہ دونوں دنوں کی اہمیت مدنظر رکھتے ہوئے اور غیر مساوی سلوک کی وجہ سے کچھ تو ہو گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگ عید کی خوشیوں میں ایسے مگن تھے کہ انہوں نے شاید اس فرق کو محسوس ہی نہیں کیا اور کیا بھی تو عید کی خوشیوں پر قربانی کرنا مناسب نہ سمجھا سوچنے کی بات ہے۔ اچھا تو آپ سے عید کے دن کی رخصت لینے کے بعد ہم ونگ ہیڈکوارٹر گئے۔ "بڑے کھانے" کا اہتمام تھا۔ قد میں گو خاص بڑا نہیں تھا لیکن جسامت کافی چوڑی پھیلی ہوتی تھی۔ عام فوجی قسم کا کھانا تھا کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں تھی۔ البتہ اس مبارک دن ہم نے اپنے دفتر کی نئی عمارت کا افتتاح عید کے کھانے کی میز دفتر میں لگا کر کیا۔ دیکھیں آئندہ بھی دفتر میں کام کی بجائے دعوتیں بھی ہوتی رہیں۔ ممکن تو نظر نہیں آتا۔ لیکن نیک دن کی بسم اللہ کی ہے۔ اس وجہ سے امید ہے کہ کچھ اثر ہو گا۔ خیر دفتر کی نئی عمارت ہم نے تقریباً بتیس ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر کی ہے۔ آجکل انتظامات کو آخری شکل دی جا رہی ہے کہ ہم یکم جنوری کو نئے آفس کو رونقیں بخشیں گے۔ ہاں تو بڑے کھانے کے بعد ایس۔ ڈی او سے گھر گئے اور شام چار بجے واپس دولت خانہ تشریف لاتے۔ گپ شپ میں وقت اچھا گزر گیا۔ گھر پہنچے تو ایک دو آدمی ملاقات کے لئے آ پہنچے اور اس طرح عید کا پورا دن مصروفیت میں گزر گیا۔

کچھ مہمان آنے کی اطلاع بھی ملی ہے ممکن ہے کہ وہ دیر تک تشریف رکھیں اور سہ پہر کو شکار کھیلنے کے لئے جانے کا ارادہ ہے۔ اس وجہ سے خط بند کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اسکے

بعد امید نہیں کہ کل دوپہر تک لکھنے کا وقت ملے یا طبیعت بنے۔ لہٰذا جو کچھ لکھا ہے کافی
خدا حافظ۔ میری طرف سے بھائی صاحب اور آپا جان کو سلام آداب۔
چھوٹوں کو پیار

والسلام
اکرم ملک

نواب گنج

۱-۲-۶۹

عزیزم جان من اصغر ملک سلامت باشد

السلام علیکم!
آپ کا خط ملا۔ خیریت سے آگاہ ہوا۔ امید ہے آپ سب بھی خیریت سے ہوں
گے آپ کہتے ہیں کہ آپ کو اپنے نام کے ساتھ ڈیر کا لفظ دیکھ کر ہنسی آجاتی ہے یہی وجہ
ہے کہ میں نے اس خط میں القاب میں (تبدیلی) لانے کی کوشش کی ہے۔ کیا خیال ہے؟
کامیاب رہا کہ خیر کامیابی تو ہو ہی گئی ہے۔ البتہ عوام کو یہ انقلاب پسند آیا بھی کہ نہیں۔
چند دن کے انتظار کے بعد پتا چلے گا۔
ویسے میرے اپنے خیال میں ڈیر اصغر کے الفاظ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ کم از کم مجھے تو
اس میں پیار اور چاہت کی جھلک نظر آتی ہے البتہ "انھارٹی سر" جیسے الفاظ میں مجھے کوئی
کشش نظر نہیں آئی۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جب دل صاف ہوں تو ان الفاظ
سے خاص فرق نہیں پڑتا اور آپ کے خطوط سے وہ پیار اور خلوص ظاہر ہوتا ہے کہ انھارٹی سر
القاب سے ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ آپ کا تحریر کردہ ۱۹ اگست کا خط میرے سامنے
ہے گو باقی سب خطوں کی طرح اس خط میں بھی آپ مجھے "انھارٹی" سر کہہ کر مخاطب ہیں
لیکن آپ کے خط اور خود ساختہ شعر سے آپ کے خلوص کا پتہ چلتا ہے اور یہی وجہ ہے

کہ میں نے کبھی ان الفاظ پر اعتراض نہیں کیا۔

ارشاد ہوتا ہے۔

ماموں لکھوں، سیمین لکھوں، ٹارزن لکھو، اتھارٹی سر لکھوں

حیران ہوں کہ اس خط میں کیا القاب لکھوں

آپ کا خط ملے تو کافی دن ہو گئے ہیں۔ جبکہ ایک ماہ ہوا آپ نے لکھنا شروع کیا۔ یعنی یکم جنوری کو مجھے یاد نہیں کہ یہاں کب پہنچا۔ بہر حال کافی دن ہو گئے ہیں۔ چونکہ آپ نے تاکید کر دی تھی کہ آپ دورے پر جا رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے شاید مجھے لمبا انتظار کرنا پڑے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہاں ہی اتنی دیر انتظار کر لیا جائے کہ آپ اپنے چکر ختم کرنے کے بعد واپس گھر پہنچ جائیں۔ تو آپ کو خط ملے اور اس طرح مجھے آپ کے خط کا انتظار کرنا پڑے۔ آپ لوگوں کی خیریت کے ساتھ ساتھ آپ کے دلچسپ خطوط کا مجھے کافی انتظار رہتا ہے۔ اور جیسے کہ آپ کو پتہ ہی ہے کہ انتظار کی گھڑی کٹھن اور لمبی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم نے سوچا کہ اس کا حل تلاش کیا جائے اور ہمارے خیال میں اس صورت کے علاوہ اور کوئی بات نہ آ سکی۔ کیونکہ آپ کے خطوں سے خیریت معلوم کرنے کے لئے بھی انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ خیر امید ہے کہ آپ جہلم اور گھر کا چکر لگانے کے بعد واپس آ چکے ہوں گے۔ اور سب طرف سے خیریت کی اطلاع ہم تک پہنچانے کے قابل ہوں گے۔

کچھ تو مضمون خشک ہو رہا ہے اور کچھ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے ذہن بھی خالی ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے کل تک رخصت لیتا ہوں۔ کل انشاء اللہ زندہ رہا تو حاضر خدمت رہوں گا۔

۲ر فروری آج اتوار ہے۔ اس وقت تقریباً صبح کے آٹھ بجے ہیں۔ آپ کے ہاں تو ساڑھے بسات بھی نہیں بجے ہوں گے۔ گو خاص سردی نہیں ہے پھر بھی تھوڑی دیر پہلے تک رضائی میں گھسا رہا۔ اب بالکونی میں بیٹھا دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا ہوں اور ساتھ ہی

پرانی فلموں کے گیت وہ دیکھو آخری گانا آپہنچا جو کہ سہگل کی زبان سے ہے۔

نئے سال کے ساتھ ساتھ مصروفیت اور کام بڑھتے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خط کو دلچسپ بنانے کا مواد دماغ میں آنے کا نام بھی نہیں لیتا۔ دماغ میں اور بھی تو کچھ نہیں ہے گو ضروری وقت گزر رہا ہے اور اپریل کے پہلے ہفتے میں پرموشن امتحان تشریف لا رہا ہے بلکہ ہم خود نفس بہ نفیس جس کران کے پاس کو میلا جا رہے ہیں۔ لیکن دماغ ہے کہ کسی بات کو قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہے۔ ویسے اپنے خیال سے تیاری تسلی بخش ہو رہی ہے۔ فالتو وقت میں کوئی نہ کوئی مضمون پڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی آپ کے دوست آجاتے ہیں اور گپ شپ بھی ہو جاتی ہے۔

خط لکھتے لکھتے ایم اوایل اور اے آر کی کتابیں میرے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہیں اور مجھے مجبور کر رہی ہیں کہ میں خط کو بے سود گپ شپ میں طویل کرنے کی بجائے کچھ دیر ان کو دیکھ لوں کیوں اجازت ہے کہ نہیں۔ شکریہ

میری طرف سے والدین کو سلام آداب عرض کریں۔ بھائی بہنوں کو پیار

والسلام

اکرم ملک

ایسٹ پاکستان رائفلز

ڈیر اصغر

السلام علیکم!

کافی دن ہوئے آپ کا خط ملا۔ ایسے خط کا اگر جواب فوراً دے دیتا تو بہت بڑی بے انصافی ہوتی۔ اس وجہ سے کئی بار پڑھا اور آپ کے خیالات کی پاکیزگی اور اظہار کی روانگی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ صرف خط ہی دلچسپ نہیں تھا بلکہ جس دن یہ خط ملا تھا وہ دن بھی اچھا ثابت ہوا ایک تو اس خط کے ساتھ تین اور خط مغربی پاکستان سے ملے۔ معلوم نہیں کہ یہ اس خط کی

برکت تھی یا پھر وہ اس خط کو اغوا کر کے یہاں تک لائے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس روز ہمارے ہاں مہمان تشریف لائے۔ وہ آئیں گھر ہمارے خدا کی قدرت کبھی ہم ان کو اور کبھی.... ہاں بھئی مہمان آتے۔ کون مہمان یہ لکھنے کی بات نہیں ہے۔ اگر میں اس خبر کو صیغہ راز میں رکھنا چاہوں تو...۔ خط بہت دلچسپ تھا۔ مگر آپ نے خط میں جو شاعرانہ روپ دھارا ہے اس سے تشویش لاحق ہو گئی ہے۔ شاعر وائر بننے کا خیال نیک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس راستے کی منزلیں کس قدر کٹھن ہے۔ اس کا اندازہ شاید آپ نے کبھی نہیں لگایا یہی وجہ ہے کہ آپ غلط راستہ پر جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس کوشش پر شاعر کا یہ بول کس طرح صادق آتا ہے۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ ہاں بھئی شاعر بننا اتنا آسان نہیں اور نہ ہی ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ شاعر بنیں۔ ویسے علامہ اقبالؒ غالب کا رتبہ پانے کا امکان ہو تو پھر ہم بھی تائید کریں گے ورنہ... اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنے طرزِ بیان کو مناسب طور پر تبدیل کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا ایک خط آپ کے شاعرانہ خیالات کو ہوا دینے کا سبب ہو گا۔ ورنہ پہلے سے ہی محتاط ہوتا۔ خیر ابھی کچھ بگڑا نہیں ہے۔ امید تو ہے ویسے گولی نکلے بہت وقت ہو گیا ہے اور ممکن ہے کہ اب آپ نے شاعرانہ معصومیت میں اتنے سوال پوچھ لئے ہیں کہ ان سب کا جواب ایک ساتھ دینا میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے اگر اس علم پر قابو ہوتا تو ان جوابات کے علاوہ بہت کچھ بیان کرنے کے قابل ہوتا۔ کیونکہ شاعر تو ایک شعر میں پوری کتاب کی تفصیل بیان کر دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کوزے میں سمندر کو بند کر دیتا ہے۔

لیکن میں ایک سپاہی....

آپ پوچھتے ہیں کہ باسکٹ بال سے فارغ ہو کر آ گئے ہیں لوگاؤں جہاں کہ باسکٹ بال کھیلنے کے لئے گئے تھے۔ وہاں سے تو کافی دن ہوئے واپس آ گئے تھے۔ لیکن کھیل سے فارغ کل ہوتے۔ کیوں یقین نہیں آ رہا۔ کیا کہا ممکن نہیں ہے بھئی وہاں دو دن مقابلہ رہا اور دونوں

دن کھیل برابر رہا اور فیصلہ یہ ہوا کہ فائنل نواب گنج میں کھیلا جائے گا۔ اب اگر اعلیٰ افسر اس قسم کا فیصلہ دے تو آپ کو ماننے سے کیوں انکار ہو رہا ہے۔ نوگاؤں بھی نواب گنج کی طرح راجشاہی کا سب ڈویژن ہے۔ لیکن قصبہ نواب گنج سے بہت بہتر ہے۔ اور پھر ایسٹ پاکستان رائفلز کے افسروں کی رہائش کی جگہ قابل رشک ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دو سال سے سول ایڈمنسٹریشن وہ عمارت ای۔پی۔آر سے واپس لینے کی کوشش میں ہے۔ فی الحال ان کی کامیابی کی امید نہیں ہے۔ لیکن آخر جیت ان کی ہو گی۔ کیونکہ یہاں تو حکومت ہی سول کی ہے۔ ای۔پی۔آر آرمی وغیرہ تو ان کی نہیں قوم کی خادم ہیں۔ عمارت کی خوبی بیان کرنے کے بجائے میں کس سمت میں پہنچ گیا۔ تقسیم ہندوستان سے پہلے یہ عمارت ایک راجہ کا محل تھا۔ جو جاتے ہوتے اس نے پاکستانیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ای۔پی۔آر نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ اب سول کہتی ہے۔ کہ ای۔پی۔آر کو اس سخت ذمہ داری سے چھٹی دینی چاہیئے۔ کیونکہ ان کی اور بھی کٹھن ذمہ داریاں ہیں۔ دیکھا ہمارا کس قدر خیال کرتے ہیں سول والے۔ بے چارے ہمارے غم میں . . .

نواب گنج سے بھاگے تھے کہ گورنر صاحب سے ملاقات کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی نوگاؤں اسٹیشن پر اترا تو استقبال کرنے والے افسر نے یہ خبر بتا کر کہ کل گورنر صاحب نوگاؤں پہنچ رہے ہیں۔ ہماری نوگاؤں پہنچنے کی خوشی کو ادھورا کر دیا۔ معلوم نہیں گورنر صاحب کو میرے نواب گنج سے بھاگنے کی خبر ہو گئی یا پھر عبدالپور ریلوے جنگشن پر کانٹے والے نے شرارت کی اور گاڑی کا رخ راجشاہی کے بجائے نوگاؤں کو پھیر دیا۔ خیر کوئی بھی وجہ یا ذریعہ ہو یہ خبر کہ گورنر صاحب نوگاؤں پہنچ رہے ہیں۔ جنگل کی آگ کی طرح سب طرف پھیل رہی تھی۔ بس پھر کیا تھا سب طرف افراتفری کا عالم تھا تمام سول انتظامیہ گورنر صاحب کی آمد اور استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ اور ساتھ ہی پبلک کو اطلاع دینے کیلئے کارندوں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ پورے شہر میں ایک دوسری جنگ عظیم

کی کار کے علاوہ اور کوئی ٹرانسپورٹ موجود ہی نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے سیلون ونگ کو مدد کرنی پڑی۔ معلوم ہوا گورنر صاحب دوسرے دن صبح دس بجے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ رہے ہیں۔ سیلون ونگ کے افسروں نے مجھے بھی گورنر صاحب کے استقبال کے لئے جانے کی دعوت دی۔ لیکن میری یہ معذرت کہ چونکہ گورنر صاحب میرے علاقے میں نہیں آرہے۔ لہٰذا میرا جانا کچھ مناسب نہیں۔ بہت مفید ثابت ہوئی۔ ایک طرف سے تو بچت ہو گئی۔ لیکن دوسرے دن صبح صبح نوگاؤں کے ایک ایم۔ این۔ اے ممبر نیشنل اسمبلی کی طرف سے گورنر صاحب کے اعزاز میں دعوت میں شرکت کیلئے ایک کارڈ ہمیں ڈھونڈھتے آنکلا۔ اب پیٹ سے دشمنی کی اجازت تو اسلام بھی نہیں دیتا۔ لہٰذا خوشی سے یہ دعوت قبول کر لی۔

بڑے لوگوں کے دورے اس قدر دلچسپ نہیں ہوتے کہ باقی لوگوں کو بیان کر کے ان کا وقت ضائع کیا جائے۔ لیکن شاید یہ بیان آپ کی دلچسپی کا باعث بنے۔ اس امید پر لکھے دیتا ہوں بلکہ اسی امید پر تو تمہید لکھی ہے۔ اب اگر آپ تمہید کو پڑھ کر ہی گھبرا گئے ہیں تو میرا قصور نہیں ہے۔ کیونکہ میں سب کچھ اعتماد سے لکھ رہا ہوں۔ ویسے پڑھنے والے کا یا جس کو کوئی چیز بھیجی جائے دماغ پڑھنا ممکن نہیں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیب کو جو کارٹونیں بھیجی تھیں اسے پسند نہیں۔ اس میں میرا مقصد شرارت نہیں۔ بلکہ وہ مجھے پسند آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ بھی ان کو پسند کرے گی۔

دورے کی تفصیل لکھنے سے پہلے تھوڑا سا جغرافیہ بتانا سود مند ہوگا۔ آپ کے امتحان کے لئے نہیں صرف نالج کے لئے۔

نوگاؤں سے ریلوے لائن نہیں گذرتی ہے اور اس سے نزدیک ترین سٹیشن صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ضلع بوگرہ کی حدود میں شامل ہے۔ گورنر صاحب چونکہ ریل سے سفر کر رہے تھے۔ اس لئے لازمی تھا کہ وہ سینئر ریلوے اسٹیشن پر اترتے۔ لہٰذا ان کے دورے کی ابتداء سٹیشن پر استقبال سے ہونی تھی جو کہ دس بجے صبح ہوتی اور پھر

وہ سیدھے کونسل ہال تشریف لاتے اور عوام کے نمائندوں سے خطاب کرتے۔ یہ ابتدا ہی غلط ہوئی اور پھر۔۔۔۔

صبح نو بجے ہی ریلوے سٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ گو ابھی گورنر صاحب کے آنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت تھا لیکن عوام کی نگاہیں ریلوے لائن کو دور تک دیکھ رہی تھیں اور عوام کے خادم یعنی سول انتظامیہ وہ آپس میں تکرار کر رہے ہیں سوال ہی پیچیدہ تھا اور عدالت کی غیر موجودگی نے صورت اور بھی نازک کر دی۔ ڈی۔ سی بوگرہ کا اصرار تھا کہ چونکہ گورنر صاحب جس سٹیشن پر اتر رہے ہیں وہ ان کے علاقہ میں ہے۔ اس لئے ان کے استقبال کا حق ان کو حاصل ہے اور اس غرض سے انہوں نے چند سکولوں کے بچوں کو لایا ہوا تھا۔ لیکن ایس ڈی۔ او نوگاؤں اور نواب گنج ڈی۔ سی کا خیال تھا کہ چونکہ گورنر صاحب نوگاؤں آرہے ہیں۔ اس وجہ سے استقبال کا حق صرف ان کو پہنچتا ہے اور اس غرض سے انہوں نے انصار کی طرف سے گارڈ آف آنر پیش کرنے کا انتظام بھی کیا تھا۔ اب ان کو کون سمجھاتا کہ بھئی گورنر صاحب کو گارڈ آف آنر بھی پیش کرو اور ساتھ ہی سکول کے بچوں کی تقریب کا انتظام بھی رہنے دو۔ خیر اچھا ہوا عدالت کی ضرورت کے بغیر ہی فیصلہ ہو گیا۔ ڈی۔ سی۔ بوگرہ نے اپنا فائنل فیصلہ سنا دیا اور چونکہ سٹیشن ان کی حدود میں تھا باقی دونوں کو خاموش رہنا پڑا۔ اور انصار اپنا سا منہ لے کر واپس لوٹے۔ ان کو کس قدر مایوسی ہوئی ہو گی۔ اس سے ہمیں غرض نہیں ورنہ۔۔۔۔۔

چونکہ گورنر صاحب کے پہنچنے کا وقت دس بجے تھا۔ اس وجہ سے بیون ونگ کمانڈر اور اے۔ ڈبلیو۔ سی پونے دس بجے ہمیں یعنی میں اور ٹو۔ آئی۔ سی ہیڈکوارٹر (دفتر) میں چھوڑ کر یہ کہتے ہوئے سٹیشن کے لئے روانہ ہوئے۔ کہ وہ دس بجے تک واپس پہنچ جائیں گے۔ ہم نے بھی سوچا ۴۵ منٹ ایک گھنٹہ انتظار زیادہ نہیں ہے کیونکہ سٹیشن پر ان کا سوائے

اس کے کہ گورنر صاحب سے شیک ہینڈ کرتا اور کوئی کام نہیں تھا۔ گیارہ بجے تک انتظار تو ہوا لیکن جب گیارہ بجے بھی اپنے افسروں کے آنے کے آثار نہ نظر آئے تو وائرلیس سیٹ والوں کو خبر بھیجی کہ حالات سے آگاہ کریں۔ معلوم ہوا کہ گورنر صاحب ابھی تک ناٹور سے نہیں چلے ہیں۔ اب تو انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی معلوم ہوئیں اور دفتر میں بیٹھے ہمارا یہ حال تھا تو استقبال کرنے والوں کی کیا حالت ہوگی۔ یہ سوچنے کو دل نہیں کرتا تھا۔ کیوں وہاں تو بیٹھنے کے لئے خاص انتظام نہیں تھا اور پھر گرمی۔ خیر گرمی سے جلد بچاؤ ہوگیا کیونکہ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے خوب دھوم دھام سے بارش آدھمکی۔ بارش نے سوچا گورنر صاحب تو تشریف لا نہیں رہے ہیں ہی ان کی انتظار کی گھڑیاں ختم کردوں۔ خدا خدا کرکے تقریباً ڈیڑھ بجے گورنر صاحب ریلوے سٹیشن پر تشریف لائے۔ کھانے کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ لہٰذا امید بندھی کہ اب دو بجے تک واپس آجائیں گے۔ اور پھر دعوت کے لئے روانگی ہوگی۔ لیکن جب دو بجے تک کوئی نہ آیا اور نہ ہی شہر میں ہل چل نظر آئی تو پھر دریافت کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ گورنر صاحب اسٹیشن پر عوام سے خطاب کر رہے ہیں۔ آپ کے لئے یہ فقرہ کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ لیکن ہمیں تشویش لاحق ہوگئی۔ کم از کم پیٹ کا سوچتے ہوئے ہمیں یقین ہوگیا کہ اب گورنر صاحب پانچ بجے سے پہلے سٹیشن سے روانہ نہیں ہوں گے۔ آپ کو خبر نہیں ہے گورنر صاحب کی تقریر عموماً پانچ چھ گھنٹے ہوتی ہے۔ اور تین گھنٹے سے کم خطاب، خطاب میں شامل نہیں۔ ایسی حالت میں ہم پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس کا اندازہ اب آپ کرسکیں۔ اپنے دونوں افسر بھی پھنس گئے۔ کیونکہ جیسے ہی گورنر صاحب گاڑی سے اترے۔ انہوں نے عوام کو نزدیک بلایا اور تقریر شروع کردی۔ اس سے پہلے بوگرہ کے ایک کالج نے گورنر صاحب کو ہار پیش کیا۔ تقریر کے دوران ایسٹ پاکستان رائفلز کے افسروں کا چلا آنا بھی مناسب نہ تھا۔ لہٰذا وہ وہیں بیٹھ گئے۔ انہوں نے سمجھا تھا۔ کیونکہ خطاب تو بنگالی میں ہو رہا تھا۔ بظاہر ہے کہ انہوں نے قابل رحم حالت میں یہ وقت گزارا۔ تقریر کے دوران گورنر صاحب

کو خیال آیا کہ انہیں سونے کے ہار کی نہیں بلکہ سیلاب سے متاثرہ افراد کی امداد کے لئے رقم کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انہوں نے ہار گلے سے اتارا اور نیلامی کے لئے پیش کر دیا۔ نیلامی کی خدمات وہ خود سر انجام دے رہے تھے۔ بولی ۲۵۰۰ سے شروع ہوئی اور ۲۵۰۰ پر ہی جمی رہی کہ اس سے بڑھنے کی کوئی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ گورنر صاحب کے ۲۵۰۰ ایک ۲۵۰۰ دو وغیرہ کہنے اور اسی کو بار بار دھرانے کے باوجود کوئی مائی کا لال اپنی جیب کو اس رقم سے زیادہ کا نقصان دینے کو تیار نہ ہوا۔ لیکن یہ رقم گورنر صاحب کو پسند نہ آئی اور آخر انہوں نے جوش اور غصے کے ملے جلے جذبات سے اعلان کیا کہ وہ اپنے پاس سے ۵۰۰۰ فنڈ میں جمع کروائیں گے اور ساتھ ہی ہار ایک لڑکی کے گلے میں ڈال دیا۔ ویسے گورنر صاحب اس روز مہربان ثابت ہوئے کہ اپنی تقریر ساڑھے چار بجے تک ختم کر دی۔

ہمارے افسر چار بجے تک تو تقریر سنتے رہے یا پھر ہجوم کو دیکھتے رہے۔ لیکن جب ان کے خیال میں تقریر ختم ہونے کی امید نہ رہی تو انہوں نے کوچ کا فیصلہ کیا۔ لیکن انکا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ کیونکہ ان کے اٹھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد تقریر بھی ختم ہو گئی۔ ان کے ونگ ہیڈ کوارٹر پہنچنے سے پہلے ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ لہٰذا ساڑھے تین بجے ہم نے کھانے کا انتظام کرنے کو کہا اور ابھی ہم نے کھانا شروع کیا ہی تھا کہ یہ دونوں حضرات پہنچ گئے۔ خیر سب نے مل کر تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ معلوم ہوا کہ ساڑھے چار بجے گورنر صاحب دوپہر کا کھانا کھا رہے ہیں۔ ہم لوگ بھی حاضری دینے چلے گئے۔ کیونکہ اتنی دیر کے بعد تھوڑا کھانے کے بعد بھوک ختم ہو جاتی ہے۔

جب پورا دن ایسی حالت میں گزرے تو پھر کھیل میں نہ تو ہارنے کو جی چاہتا ہے اور نہ ہی جیتنے کی ہمت رہتی ہے۔ ہمارا مقابلہ برابر رہا۔ دوسرے دن بھی فیصلہ نہ ہو سکا۔ پھر واپس نواب گنج آ گئے اور کل یہاں مقابلہ ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے اچھے مہمان نواز ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کھیل ان کے حق میں ہار دیا ہے۔ ویسے وہ بھی اچھے مہمان نواز تھے۔ باقی

پروگرام تو گورنر صاحب کی آمد کی وجہ سے خراب ہو گئے۔ البتہ شام کو مشرقی پاکستان کے آرٹسٹوں کا موقعہ ملا۔ انہوں نے ہمارے لئے محفل موسیقی کا انتظام کیا تھا۔ مجلس اچھی رہی۔ ہم لوگوں نے بھی کل انتظام کیا تھا۔ لیکن ونگ کمانڈر کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ختم کر دیا۔ ابھی تک میں نے اپنے شہر کے آرٹسٹوں کو نہیں دیکھا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ قابل قبول ہیں۔ شوقیہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ اور پھر ویسے بھی ایسٹ پاکستان رائفلز والے قوم کے خادم ہیں۔ ان کے لئے تھوڑا بہت کام کرنے میں لوگ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ تین آرٹسٹوں کا انتظام ہوا تھا۔ باقی چھ مرد تھے۔ اس وجہ سے تعداد میں شامل نہیں کیا۔ کیا خیال ہے۔

آپ کے خط کے لے آؤٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے سوال کو لیتے ہیں۔ میرے گھر کے نزدیک کالے سانولے قسم کے لوگ نہ بابا ایسا ظلم نہ کرو۔ میرے ہمسائے کو جن کے گھر اس وقت اس گانے کی دھیمی دھیمی آواز آرہی ہے۔ اکیلے نہ جانا۔ شاید فلم ارمان کا ہے۔ اگر آپ سانولے رنگ میں شامل کریں گے تو میں کہوں گا کہ مغربی پاکستان میں کوئی سفید رنگ کا انسان ہی نہیں ہے۔ آپ کے شہر سیالکوٹ میں کیپٹن زاہد زمان کے علاوہ کوئی فرد "مرد عورت" اتنے گورے رنگ کے نہیں ہیں جتنے کہ ویسے اگر آپ میرے گھر کی صورت حال کا آپ کو علم ہوتا تو آپ کبھی مجھے راجشاہی جانے کی ترغیب نہ دیتے اور اگر دیتے تو صرف دشمنی کی بنا پر لیکن چونکہ آپ بے خبر ہیں اس وجہ سے عام معافی -- ویسے سکھوں کی طرح بہت دیر سے کام کی بات کا خیال آیا ہے۔ اگر درخواست کریں گے تو اپنے پڑوسیوں سے آپ کا تعارف کروا دوں گا لیکن خیال رہے کہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ لہذا کام کل پر چھوڑتا ہوں۔

آج چھٹی کا دن ہے ابھی ابھی ناشتہ کیا ہے اور سوچا کہ آپ کو فارغ کر دوں بہت دنوں سے آپ کو خط بھیجنے کا سوچ رہا تھا۔ میرے گھر کے نزدیک ایک تالاب ہے خیال تھا کہ آپ کو اس کی سیر کرائی جائے۔ لیکن ابھی خبر ملی ہے کہ ہمارے شہر کے کسٹم آفیسر کی چھوٹی

بچی دریا میں ڈوب گئی ہے۔ اور اس نے مدد کے لئے پیغام بھیجا ہے۔ لہذا میں خط بند کرتا ہوں۔ اور بچی کو ڈھونڈھنے کے لئے مناسب امداد کا انتظام کرتا ہوں۔ چونکہ ونگ کمانڈر شہر میں موجود نہیں ہے لہذا مجھے ہی یہ کام کرنا ہوگا۔ آدمی اچھا ہے اس لئے مدد کرنا بھی ضروری ہے۔ ویسے بھی تو فرض ہے خیر۔

میری طرف سے سب کو سلام عرض کریں۔

والسلام

اکرم ملک

۷۸۶

نواب گنج

ڈیر اصغر

السلام علیکم! عید مبارک

سنائیے کیا حال ہے۔ خیریت تو ہے۔ کیوں کیا کہا غسل کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ صبح صبح غسل کی بھی کیا تیزی ہے اور گھر میں بھی افراتفری معاف کرنا گہما گہمی نظر آرہی ہے کیا فرمایا عید کی تیاری ہو رہی ہے۔ سچ! کیوں بناتے ہو۔ آج کے دن عید کرنے پر کیوں رضامند ہو گئے۔ حکومت نے آج کے دن عید کرنے کا اعلان کیا ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے کیا آپ کے شہر کے مولویوں میں دم خم نہیں ہے کہ رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے کے خلاف بغاوت کر سکتے۔ اس موسم اور موجودہ فضا میں تو یہ مشکل نہیں تھا۔ اگر اور کوئی فائدہ نہیں تھا تو کم از کم لیڈر بننے کے خیال سے ہی عید کو ایک دن آگے پیچھے کر سکتے ہیں ۲۸ فروری اگر پسند نہیں تھا تو ۲۶ ہی کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو راجشاہی کے مولوی صاحبان کی جرأت ہمت اور ایک ہی رات میں عوامی لیڈر بننے کے جذبہ کی خبر نہیں ہوئی ورنہ وہ بھی باغیوں میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو جاتے۔

وہاں ہم لوگ "راجشاہی والے" ہنگامی حالات کے آخری دنوں میں شہیدوں کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔ وہاں ہی ہمارے مولوی صاحبان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ ہم حکومت یا رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے کے خلاف ۲۸ر فروری کو عید منائیں گے۔ بزرگوں کو سمجھانے کی لاکھ کوشش کی اور یہ بھی بتایا کہ جناب عالی اس فیصلہ سے حکومت کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ الٹا عوام کو نقصان ہوگا۔ لیکن مولوی صاحبان جن کا اکثر مزاج ۱۰۰ فیصد باغیانہ ہے۔ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے اور آخر انہوں نے فتویٰ دے دیا اور ہم خاموش ہو گئے۔

عید کی چار چھٹیاں ہیں لیکن ہم نواب گنج میں ہی تشریف فرما ہوں گے۔ خیال تھا کہ دوستوان دنوں ڈھاکہ کی سیر ہو جاتی۔ لیکن خدا بھلا کرے ہمارے مولوی صاحبان کا کہ اگر ابھی نواب گنج چھوڑتے بھی ہیں تو دونوں طرف سے یعنی ڈھاکہ اور یہاں سے عید مبارک سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور اگر کل عید کر کے جائیں تو پھر ڈھاکہ خالی ہاتھ لگانے والی بات ہے۔ دیکھئے کیسا مشکل کٹھن مسئلہ درپیش ہے۔ نواب گنج میں عید کے دن سوائے دو رکعت نماز کے علاوہ اور کوئی جاذبیت نہیں ہے زیادہ سے زیادہ کھانا ایس۔ ڈی۔ او کے ہاں ہو جائے گا۔ اور باقی دن ہم کمرے میں بند پڑے رہیں گے اور پھر صرف عید ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بعد دو دن بھی تو گزارنے ہیں۔ دیکھئے کیا پروگرام بنتا ہے۔ ہاں تو آپ کو مبارکباد دینا تو میں بھول ہی گیا۔ آخر جیت گئے۔ آپ کو محنت اور قربانی تو دینی پڑی آپ کے جذبے کی ہم لوگ قدر کرتے ہیں۔ ویسے شہیدوں میں ہم بھی شامل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ جیسے ہی آپ کا خط تشریف فرما ہوا تو ساتھ ہی راجشاہی یونیورسٹی کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا۔ کچھ تو آپ کا خط پڑھنے کا شوق اور کچھ ویسے ہی نواب گنج چھوڑنے کو طبیعت نہیں کر رہی تھی۔ اس لئے ہم نے حیلے بہانے کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن طالب علموں کا اصرار تھا کہ میں دعوت میں شرکت کروں۔ اس کشمکش میں کافی وقت بیت گیا۔ ہمارے دعوت قبول کرنے کے

ساتھ ساتھ ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اور اس سے پہلے کہ میں وہاں پہنچتا ان لوگوں نے مرغن غذائیں تو ہضم کر لیں اور ہم ہڈیاں گننے پہنچ گئے۔ خیر اچھا ہوا کہ ہم دیر سے پہنچے۔ سنا ہے کہ کھانا اچھا نہیں تھا۔ بہت لوگوں کے پیٹ میں ابھی تک درد ہو رہا ہے۔ دیکھیں کیا رنگ لاتا ہے۔ ویسے امید ہے کہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔

نیچے صحن میں "مینا" السلام علیکم اور بسم اللہ سیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرا بیٹا مین اس کا استاد ہے۔ مینا ابھی بچی ہے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ سیکھ جائے گی فی الحال اللہ ہو مینا پکارتی ہے یہ دیکھیے ڈاکٹر تشریف لے آئے اس سے پہلے آپ کا ان سے تعارف نہیں ہوا گو چودھری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ہیں "گھوگھو" کل دوپہر سے طبیعت کچھ خراب ہے کوئی خاص بیماری تو نہیں البتہ بڑے لوگوں کی طرح کا زکام ہے۔ کل شام کچھ کیپسول وغیرہ دے گئے تھے۔ اور اب طبیعت پوچھنے آئے ہیں ابھی ان کو بتایا گیا ہے کہ بھالو اچھے اچھا میں اب ان سے گپ شپ کرتا ہوں اور نماز عید سے فارغ ہو لیں پھر ملیں گے۔ بلکہ آپ کو تو پورا دن تنگ نہیں کرنا چاہیئے۔ معلوم نہیں کہ نماز کے بعد کیا کیا پروگرام ہو تو اجازت....

کیا بات ہے کچھ غمگین نظر آتے ہیں آپ، چہرہ اترا ہوا ہے تھکاوٹ کے آثار بھی نظر آ رہے ہیں۔ کیوں کسی بات کا ملال ہے۔ عید کے چلے جانے کا ---اس کا غم نہیں کیا کرتے یہ تو آئی اسی لئے ہے کہ چلی جائے۔ -- ایک سال کی جدائی دے کر۔ -- کیوں ایک سال تک صبر کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو یہاں آجاؤ۔ صبح آپ کو راجشاہی میں عید کروائیں گے اور پھر سیر کا پروگرام بھی تو بن رہا ہے۔ فی الحال معلوم نہیں کہ کہاں کہاں کا چکر ہو گا ڈھاکہ کہ جیسور ---

صبح سوچ رہا تھا کہ یہ چار دن کیسے گزریں گے۔ اب کچھ بندوبست ہوتا نظر آ رہا ہے راجشاہی کے سیکٹر کمانڈر صاحب نے دوپہر کے کھانے پر دعوت دی ہے۔ لہٰذا صبح نماز پڑھنے کے بعد راجشاہی کے لئے کوچ کروں گا۔ اور پھر راجشاہی سے اگر ڈھاکہ کے لئے ٹکٹ مل گیا

تو شام تک انشاء اللہ ڈھاکہ پہنچ جاؤں گا۔ اور اگر ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہ مل سکا تو جلپور کا قصد کرنے کا خیال ہے۔ دوستوں سے ملاقات کے علاوہ امید ہے کہ اس چکر میں امتحان کے لئے بھی کچھ مل جائے گا۔

کیا کہنے آپ کے۔ ہم تو بچت کرتے ہیں۔ خیر بچت کرنا تو برا نہیں۔ کنجوسی جرم ہے۔ لیکن ہم بچت کرنے کا خیال دل میں نہیں لائے۔ البتہ آپ کے کہنے پر خط دیر سے لکھا۔ اور اس پر بھی اعتراض۔ ۔ ۔ یہ خط لکھنے میں بھی تو دیر ہو گئی ہے۔ لیکن میرا ایک عدد خط آپ کے ہاں تشریف رکھتا ہو گا۔ اور دوسرے دیری کی وجہ یہ ہے کہ ہم دعوت کھانے راجشاہی چلے گئے تھے اور وہاں سے واپسی پر اپنے دوروں کے چکر میں پھنس گئے اور آج ہم نے کہا کہ آپ کی عید ہے۔ لہٰذا آپ سے عید مبارک ہو ہی جائے۔ ہم لوگ تو آپ کو پتہ ہی ہے اپنے ہمسایوں سے زیادہ اثر لیتے ہیں۔ گو مغربی پاکستان میں آج عید ہے۔ بلکہ ڈھاکہ اور دوسرے مشرقی پاکستان کے شہروں میں عید منائی گئی۔ لیکن ہمارے ہمسایہ ملک میں کل عید ہے ہم نہیں چاہتے کہ وہاں کے رہنے والے مسلمان اکیلے میں عید کریں۔ ان کا ساتھ دینا بھی تو ضروری ہے۔ کیوں ہمارے جذبے کی قدر کرتے ہیں کہ نہیں۔ ورنہ مولوی صاحبان سے نمٹنا مشکل نہ تھا۔ صرف اپنے ہمسائیوں کا خیال آگیا اور ہم خاموش ہو گئے۔

کیسی سہانی صبح ہے موسم بہت اچھا ہے اور یہ چڑیوں نے کیسا شور و غل مچا رکھا ہے ذرا غور سے سنیں پہلے تو اس قدر شور نہیں سنا تھا۔ ہیں ۔ ۔ ۔ کیا کہا! عید مبارک کہہ رہی ہیں۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو۔ وہ بھی تو ہماری خوشیوں میں شامل ہیں۔ لیکن آپ خوش نہیں نظر آ رہے۔ آپ کو کہا تھا کہ عید کے لئے یہاں آجائیں۔ آپ کی دو عیدیں بھی ہو جاتیں اور طبیعت بھی بہل جاتی۔ آئے کیوں نہیں۔ انکار کی خاص وجہ نظر نہیں آئی۔ کیا کہا! پردہ داری ہے۔ اچھا تو اب ہم سے بھی باتیں خفیہ ہونے لگی ہیں۔ یہ تبدیلی کب سے عمل میں آئی ہے۔ خیر آپ کی مرضی ۔ ۔ ۔ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔

اوہ ۔ ۔ ۔ سنو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ شور صرف چڑیوں کا نہیں ہو سکتا۔ ایک آدھ بکری کی آواز بھی آجاتی ہے ۔ ۔ ۔ اللہ جانے اس کو خبر ہے بھی کہ نہیں کہ جلد ہی وہ اللہ کو پیاری بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر قربان ہونے والی ہے۔ اس کے علاوہ شور کس کا ہے۔ فوج کا ۔ ۔ ۔ ہاں بھئی یہ تو چھوٹی فوج کا ہے۔ لیکن اس چھوٹی فوج کا بھی تو آپ سے تعارف نہیں ہے۔ یہ ہمارے ہمسایوں کی فوج ہے اپنے خالد اور اس سے کم عمر کے تقریباً دس افراد پر یہ فوج مشتمل ہے۔ آزاد معلوم ہوتے ہیں شرارت کے شوقین ہیں جس کی وجہ سے کافی شور و غل اور کبھی رونق رہتی ہے ابھی چند منٹ پہلے اس فوج ہی کی زوردار آوازیں آرہی تھیں۔ لیکن اب اس محاذ پر خاموشی چھا گئی ہے کیوں ۔ ۔ ۔ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب خیال ہے کہ عید کی نماز پڑھنے کی تیاری کی جائے۔ رخصت دیں گے کہ نہیں۔ بھئی ہم نے تو کل پورا دن آپ کو چھٹی دی تھی۔ اب آپ کیوں چھٹی دیتے گھبرا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا اجازت ۔ ۔ ۔ ۔

میری طرف سے بھائی صاحب، آپا جان کو سلام و آداب ۔ ۔ ۔ چھوٹوں کو پیار

والسلام

اکرم ملک

۷۸۶

۱۶-۲-۶۹

عزیز ترم اصغر ملک

السلام علیکم!

آپ کا ۲۰ جنوری کا تحریر کردہ خط تین دن ہوئے یعنی ۱۲ فروری کو تشریف لایا۔ ویسے تو میں اس کا شکر گزار ہوں کہ اس سرد موسم اور دشوار راستہ کو عبور کرتے ہوئے وہ آخر منزل مقصود تک پہنچ ہی گیا۔ کافی فرض شناس معلوم ہوتا ہے۔ ویسے آپ نے لفافے پر جو پتہ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کا راستہ خواہ مخواہ کٹھن کر دیا تھا۔ خیر آپ نے ابھی تک

ملٹری ٹریننگ نہیں کی۔ ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ ایک کمانڈر کے لئے کتنا ضروری ہے
کہ وہ اپنے قاصد یا پیٹرول پارٹی کو آسان درست راستہ بتلائے اور منزل مقصود تک پہنچنے
کے باقی ضروری ہدایات تھے۔ تاکہ راستہ میں جدا ہونے کی صورت میں :: ضروری بندوبست
کر سکے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے راستہ میں آپ کو کوئی خطرہ نظر نہیں آیا پھر بھی۔۔
دسمبر میں بھی کیپٹن زاہد زمان بھی اسی غلطی کا شکار ہوا تھا۔ عید سے چند دن پہلے انہوں
نے ایک عدد عید کارڈ ارسال کیا تھا۔ لیکن آپ کی طرح اس نے بھی منزل مقصود تک سیدھا
راستہ نہیں سمجھایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کارڈ پندرہ بیس دن کے بعد کٹھن راستوں سے گزرتا
ہوا یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ خیر اس کی صورت میں غلطی کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے
کہ وہ مشرقی پاکستان سے واقف نہیں ہے۔ لیکن آپ تو کچھ دن تک یہاں تشریف فرما تھے۔
خیر ممکن ہے کہ آپ بھی بھول گئے ہوں۔ لہٰذا آپ کی اطلاع کے لئے عرض کئے دیتا ہوں۔ ڈائری
میں نوٹ کر لیں۔ اور ضرورت پڑنے پر دیکھ لیا کریں۔ تاکہ۔۔۔

جیسے کہ آپ کو معلوم ہے (اگر یاد نہ ہو تو ذہن پر زور دیں) کہ پاکستان کے اس خطے میں نوابوں
کی بھرمار تھی۔ جس کی وجہ سے قدرتی طور پر نواب گنج کا وجود میں آنا لازمی تھا۔ لیکن نوابوں
کی تعداد کے لحاظ سے چند ایک نواب گنج سے کام نہیں چلتا تھا۔ لہٰذا نواب گنج کی تعداد بڑھتی
گئی۔ شروع شروع میں تو صرف ایک کی صورت میں نواب گنج کافی محسوس کیا گیا۔ لیکن وقت
کے ساتھ ساتھ جہاں اور میدانوں میں انقلاب اور ترقی ظہور پذیر ہوئی وہاں نواب گنج بھی
متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

آپ کو خط لکھنا ۱۴ فروری کو شروع کیا تھا۔ لیکن اسی شام مکمل نہ ہو سکا اور ۱۵ فروری
ہم گھومنے چلے گئے۔ اور اس سیر سے قدر تھک گئے کہ کل شام خط لکھنے کی ہمت نہ ہوئی
سفر تو شاید ۰۵ میل تھا۔ لیکن سڑک ایسی بنی ہے کہ ایک دفعہ گزرنے سے کھانا ہضم ہونے
کے ساتھ ساتھ جسم کی ورزش اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔ اس ورزش کا اثر ہے کہ آج صبح

کافی دیر سے اٹھے اور جلدی جلدی ناشتہ کھانے کے بعد ایک عدد فلم دیکھنے کے بعد ابھی ابھی واپس آیا ہوں۔ اس وقت دن کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ ڈھاکہ سے آپ کی ایک سہیلی فرمائشی پروگرام نشر کر رہی ہے۔ گا نے بنگلہ ہیں لیکن ہم بھی تو کافی حد تک بنگلہ سیکھ گئے ہیں۔ فرمائش کرنے والی کی آواز، گانوں کے ساتھ ساتھ ہم نے سوچا کہ خط کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ کیا خیال ہے حضور۔ اگر کچھ پڑھنے سننے کے لئے تیار ہیں تو لکھنے کی اجازت دیں۔ ۔ ۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ نواب گنج بھی موجودہ ترقی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ موجودہ نواب گنج (ہمارے والا) کچھ عرصہ پہلے جنگل ہوا کرتا تھا۔ مرشد آباد جو کہ یہاں سے ۰۰ امیل کے فاصلے پر ہے سے نواب شکار کھیلنے اس جگہ آیا کرتے تھے یہ نواب عموماً شکار کے بعد واپس چلے جایا کرتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک نوجوان نواب نے شکار کے لئے ایک عدد ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑا دیا۔ اور اس طرح اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور شام تک شکار کی تلاش میں پھرتا رہا۔ لیکن بدقسمتی سے نہ تو شکار ہی شہزادی کی صورت میں اس کے سامنے آیا۔ اور نہ ہی ہرن کی صورت میں اس کے تیر کا نشانہ بن سکا۔ شہزادہ آخر تھک کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کے ملازم اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے۔ نواب زادہ اس قدر تھک گیا تھا۔ اور پھر اندھیرا بھی تو چھا گیا تھا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ اب جنگل میں ہی رات بسر کی جائے۔ حکم دیا گیا کہ چارپائی کا انتظام کیا جائے۔ لیکن جنگل میں چارپائی ۔ ۔ ۔ اور پھر اس علاقے میں تو چارپائی کا رواج ہی نہیں تھا۔ نواب زادہ صاحب کو وہ رات بغیر چارپائی کے گزارنا پڑی۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ نواب صاحب نے فرمان جاری کر دیا کہ اس جنگل میں رات بسر کرنے کا انتظام کیا جائے اور چارپائی بھی بنائی جائے نواب کا حکم ہوا اور چارپائی نہ بنے۔ لہٰذا فوراً چارپائی کا انتظام کیا گیا۔ اور رات بسر کرنے کے لئے ایک راج باڑی بھی وجود میں آگئی۔ ہاں تو نواب گنج تو بنا ہی تھا۔ لیکن اس

چارپائی کی ایجاد نے چارپائی سے چپائی نواب گنج بنا دیا۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے یہ یہاں تک پہنچنے کے لئے چارپائی کا سہارا ضروری ہے۔ آئندہ کے لئے خیال رکھیں۔ ورنہ خط منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے مشکل دشوار گزار راستوں سے گزرتے گزرتے ممکن ہے کہ راستہ ہی میں دم توڑ دے۔ اور یہ چیز مجھے منظور نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کے دلچسپ خط کا مجھے کافی انتظار رہتا ہے۔ آپ کا یہ خط خوش قسمتی سے ڈھاکہ کے نزدیک ترین نواب گنج چلا گیا۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ وہ نواب گنج (ایسٹ پاکستان رائفلز) ہیڈ کوارٹر سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ اس طرح خط نے ہیڈ کوارٹر ایسٹ پاکستان رائفلز کا سہارا لیا۔ اور چھونک میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اگر یہ خط نواب گنج جانے پر بضد رہتا اور چھونگ کو بھول جاتا تو اس صورت میں اس کی شکل دیکھنا پھر میرے لئے ممکن نہ ہوتا۔

سمجھے حضور۔ قاصد کو بھیجنے سے پہلے صحیح راستہ اور ضروری ہدایات دینا لازمی ہے۔ ذرا دماغ پر زور دے معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم نے جو عید کارڈ ارسال کیا تھا۔ اس نے کیوں اتنی دیر لگائی۔۔۔ اب تو عید کی تاریخ بھی یاد نہیں ہے۔ خیر عید سے تقریباً پانچ دن پہلے چپائی نواب گنج سے ایک عید کارڈ بذریعہ ریل مغربی پاکستان کے نئے کمبستہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس عید کارڈ کے پتہ پر دو الفاظ نمایاں تھے۔ ایک اصغر اور دوسرا مغربی پاکستان اس کو بھی اتفاق سمجھ لیں کہ کچھ انہی دنوں میں پورے پاکستان میں اور خاص طور پر مغربی پاکستان میں اصغر نام نمایاں طور پر لیا جانے لگا۔ مغربی پاکستان میں تو اس قدر عام ہو گیا کہ ہر عام و خاص نے اس نام پر عید کارڈ ارسال کرنا شروع کر دیا۔ نواب گنج سے چلتا چلتا جب یہ کارڈ دارالخلافہ کو سلام کرتا ہوا لاہور پہنچا تو ڈاک والوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاک میں اس نام کے بہت سے عید کارڈ موجود تھے۔ اور صرف نام کی وجہ سے یہ بھی دوسروں کے ساتھ سفر پر چل نکلا۔ یہاں اس کی بریفنگ تو خوب کی تھی کہ لاہور پہنچنے پر کسی صورت میں بھی جہاز پر سفر نہ کرنا اور چھوٹے سے چھوٹے راستے سے سیالکوٹ پہنچنے کی کوشش کرنا۔ لیکن یا تو اس جہاز

جہاز میں سفر کرنے کا شوق پیدا ہو گیا ہوگا اور یا پھر ہجوم میں شامل ہونے کا شوق اس قدر بڑھ گیا ہوگا کہ اس نے سب کے ساتھ مل کر کراچی کا سفر شروع کر دیا۔ اب کراچی میں تو اس نام کے کارڈ بہت تعداد میں آ گئے اور پھر ان کے وصول کرنے یا استقبال کرنے کا خاص انتظام نہیں تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یعنی کہ اس سے پہلے اس نام کے اس قدر کارڈ کبھی نہیں آئے تھے۔ جس کی وجہ سے وصول کرنے کے انتظام کا کبھی خیال نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے مہمانوں کو سارٹ آؤٹ کرنے میں وقت کے ساتھ ساتھ دیر بھی ہوئی۔ نواب گنج سے گیا ہوا کارڈ خوش تھا کہ اس کو بھی ہجوم میں شامل ہونے کا موقع مل گیا۔ اور وہ یہ خیال کبھی اس کے دل و دماغ میں نہیں آیا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ کہ ایک دن عید سے چند دن بعد جب تک کہ ڈاک کو دیکھنے کے لئے مناسب سٹاف کا بندوبست ہو گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ چند صاحب ہر ایک کارڈ کو کھول کر پڑھتے ہیں اور پھر الگ الگ گروپ بنا رہے ہیں یہ صورت دیکھ کر ہمارے اس دوست کو تشویش ہوئی کہ کہیں چوری پکڑی گئی تو کیا ہوگا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت والا معاملہ تھا۔ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی خیر صبر سے بیٹھ گیا۔ البتہ چین پھر بھی نہیں آ رہا تھا کہ دو تین منٹ بعد اُس نے دیکھا کہ ایک صاحب نے اس کو کھولا۔ فرام کیپٹن اکرم پڑھ کر ایک دم سے الگ رکھ دیا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا کہ کھولنے والے کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ خیر اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اس کارڈ کو واپس ڈاک خانہ کے حوالے کر دیا۔ اور تاکید کی ہے وہ اپنی منزل مقصود کو روانہ ہو جائے۔ اس نے تو واپس اس خیال سے کر دیا کہ شاید بھٹک گیا اور کارڈ ناراض تھا کہ اس کو اپنے ساتھیوں سے جدا کر دیا گیا۔ خیر اچھا ہوا کہ انہوں نے اسے بھٹکے ہوئے راستہ سے ہٹا کر صحیح راستہ دکھا دیا۔ خیر عید کارڈ پہنچ تو گیا جبکہ میرے پہلے خط کا جواب ابھی تک.. کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ طالب علم بن کر پڑھائی کی فکر ہونی چاہیئے۔ عیش کر رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے جیسے ملازم آدمیوں کو امتحانوں کی تیاری کی فکر ہے۔ پڑھائی بھی کچھ نہ کچھ ہو رہی ہے۔

اکیلے ہونے کی وجہ سے نہ تو امتحان کے لئے کافی میٹریل مل سکا اور نہ ہی بحث وغیرہ کر
سکا جو کہ امتحان کی تیاری میں کافی مدد کا باعث ہو سکتا ہے دیکھیں اب کیا ہونا ہے
خدا کرے کامیابی ہو جائے۔ ورنہ اگلے سال تک بھی کامیابی ہو جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ فی الحال
پروموشن کی امید نہیں ہے۔ دیکھیں اللہ بہتری ہی کرے گا۔

میری طرف سے والدین کو سلام عرض کریں اور بھائی بہنوں کو پیار۔

والسلام
اکرم ملک

۷۸۶

نواب گنج

۲۲-۷-۶۹

ڈیر اصغر

السلام علیکم! بہت انتظار کروایا دوست۔ انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ
ہمت جواب دے گئی۔ شک ہوا کہ کہیں آپ چاند کے سفر پر تو نہیں چلے گئے۔ ورنہ خط میں
اتنی دیری۔ لیکن وہاں سے کم از کم ٹیلیفون کال تو کر سکتے تھے اور وہ بھی نہ آیا۔ اس وجہ سے
دل عجیب کشمکش و پیچ میں پڑا رہا کہ خدایا کیا ماجرا ہے اور اب تو کچھ دنوں سے امیدیں جواب
دے رہی تھیں کہ آپ کا خط زمین کا باشندہ بن کر حاضر ہو گیا۔ ہماری ہمت اور انتظار کا امتحان
لینے کا شکریہ۔

اچھا تو آج کل چھٹیاں منائی جا رہی ہیں۔ کیا مزہ ہے چھٹیوں میں بھلا ہم کیا جانیں
سالگرہ منائے عرصہ گزر گیا ہے لیکن اس دوران چھٹی نام کی کوئی چیز نہیں دیکھی۔ اور آپ
اس کے بغیر سالگرہ۔ کبھی جب ارادہ کر لیں اس وقت چھٹی پر روانہ ہو جاتے ہیں معلوم ہوتا
ہے کہ گھر میں مارشل لاء کافی نرم ہے ورنہ ۔۔۔۔ چھٹی لے کر یہاں آنے کا کب تک ارادہ

ہے۔ یا کہ لاہور کے نواحی علاقہ میں کچھ ایسی کشش ہے کہ آپ وہ خطہ چھوڑ کر آنے کیلئے ہر گز تیار نہیں ہیں۔ بات تو کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ مشرقی پاکستان کا حسن دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ان دنوں یہ حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے اور کل تک جو نالیاں نظر آتی تھیں۔ آج کل وہ عظیم دریاؤں کے روپ میں بہہ رہے ہیں۔ کیا سمجھے۔

آپ کی دی ہوئی پہیلی تو ہم نے بوجھ لی لیکن بتاؤں گا نہیں۔ نہ معلوم آپ انعام دیں گے یا ہندوستان کی طرح بعد میں ماننے سے ہی مکر جائیں۔ بہتر ہے کہ آپ انعام پیشگی ارسال کر دیں اور میں پہیلی کا جواب بھیج دوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ویسے آپ خط کو اگر پڑھیں تو شاید جواب آپ کو مل گیا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سالگرہ کے جلد ہی بعد مشرقی پاکستان کی سیاحت کا موقعہ مل رہا ہے۔ اُمید ہے کہ میں پرسوں مشرقی پاکستان کے دو ہفتے کے دورے پر یہاں سے روانہ ہوں گا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنی ہی جیپ پر سفر کروں گا۔ اسطرح مشرقی پاکستان دیکھنے میں جو لطف رہے گا۔ انشاء اللہ خوب ہو گا۔ ابھی تک پروگرام کی پوری تفصیل نہیں ملی۔ بہر حال میں پرسوں یہاں سے ڈھاکہ کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ ڈھاکہ تک ریل اور ہوائی جہاز کے سفر کا تجربہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب انشاء اللہ جیپ کا سفر کرنے کا امکان ہے۔ اللہ کرے سفر اچھا ہی رہے۔ ۔ ۔ ۔

لیا گھر اور جہلم میں مکان تیار ہو گئے ہیں۔ دونوں جگہوں پر مکان بہت ضروری تھے۔ خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں ہمت اور توفیق دی ہے کہ ہم اپنا سر چھپانے کے لئے جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں مکان کیسے بنے ہیں۔ بہر حال پہلے مکانوں سے اچھے ہی ہوں گے۔ ممکن ہے اکتوبر نومبر تک ایک ماہ کی رخصت پر مغربی پاکستان آجاؤں اس صورت میں آپ لوگوں سے ملاقات کے ساتھ ساتھ مکان وغیرہ دیکھنے کا موقعہ بھی مل جائے گا۔ نواب گنج میں سالگرہ منانے کے بعد ویسٹ جانے کی طبیعت ہو رہی ہے۔ بلاوجہ

آپ جیسے شہر میں (لاہور) ہوتے تو شاید ایک اور سالگرہ تک ایسا سوچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

میجر صاحب کا کیا حال ہے۔ کہیں مصروفیت زیادہ تو نہیں۔ آپ کی امی کیسی ہیں۔ صفیہ اور زیب کا کیا حال ہے۔ زیب کی ٹانگ اب کیسی ہے امید ہے کہ اب وہ بالکل تندرست ہو گی۔ ماموں کے دوست (آصف) کا کیا حال ہے۔ اب تو وہ ہم کو بھول بھی گیا۔ کتنا بے مروّت ہے۔ خیر نپٹ لوں گا۔

میری طرف سے والدین کو سلام عرض کر دیں۔ بھائیوں بہنوں کو پیار دعا۔ لاہور میں بھی اگر ملاقات ہو تو ان کو بھی ہمارا سلام عرض کریں۔ تقریباً ایک سال آگے دونوں گھروں کو خط لکھا تھا۔ لیکن جواب ندارد۔ اور پھر ہم نے بھی چپ سادھ لی کیا خیال ہے ٹھیک کیا کہ نہیں۔ خیر دونوں گھروں میں سلام عرض کر دیں۔۔۔۔ جب کبھی جانے کا اتفاق ہو ورنہ ٹھیک ہے۔

کبھی کبھی غلطی سے یاد کرنے میں جلدی کر لیا کریں۔ کیا خیال ہے۔ ایسی غلطی کا امکان ہے کہ نہیں۔

والسلام

اکرم ملک

۷۸۶

نواب گنج

۶۹-۱۱-۲۷

ڈیر اصغر

السلام علیکم!

امید ہے کہ آپ با خیریت ہوں گے۔ اور لاہور کی پُر رونق زندگی سے دل بہلا رہے ہوں گے۔ شاید یہی دل بہلانے والی جگہ ہے کہ آپ کا خط ہمارے لئے عید کا چاند بن گیا

ہے۔ صرف فرق یہ رہا کہ عید کے چاند کے ساتھ ہی ساتھ عید سے بھی حقیقت میں ملاقات ہو جاتی ہے لیکن آپ کا خط ملنے پر گو آپ سے کسی حد تک ملاقات ہو گئی۔ لیکن حقیقت میں ملاقات تو اس صورت میں ہوتی کہ خط سے دوسرے دن آپ بھی تشریف لے آتے ---کیا ہی اچھا ہوتا۔ --- دیکھئے نا۔ -- ہم بھی کتنے بیوقوف ہیں یہ سوچتے ہیں کہ کوئی آدمی لاہور کی رنگینیوں کو چھوڑ کر مشرقی پاکستان کے اس ریگستانی علاقہ میں جس کو یہاں نواب گنج کہتے ہیں آنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ آپ کو لاہور کی زندگی مبارک ہو اور ساتھ ہی تعلیم میں کامیابی لازم۔ جبکہ ہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نواب گنج میں ہی دن پورے کر رہے ہیں۔ خیال تھا کہ ایک سال کے بعد تبادلہ ہو جائے گا۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہی عرصہ پورا کرنے کے بعد واپس فوج میں جانا ہو گا۔ کیا اچھا ہوتا کہ پوسٹنگ خواہ چند ماہ کے لئے ہی سہی، چٹاگانگ یا سلہٹ کے علاقے میں ہوتی۔ کھلنا میں بھی رونق ہے لیکن نواب گنج اور راجشاہی تو بس بوریت کے اڈے ہیں۔ اور اب تو یہاں سے طبیعت بھر گئی ہے۔ اس جگہ سے چھٹی لینے کا خیال تھا۔ لیکن اب حکومت کہتی ہے کہ چھٹی بھی دو سال کے عرصہ میں نہیں مل سکتی۔ البتہ اتفاقی چھٹی مل سکتی ہے۔ لیکن چند دن کی سی لیو کے لئے ایک ہزار روپیہ قربان کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ٹھیک ہی تو ہے۔

خیال ہے کہ عید پر دس دن کی چھٹی لے کر کھلنا، ڈھاکہ اور چٹاگانگ کا چکر لگاؤں گا اور اس طرح یہ علاقہ دیکھنے کا موقعہ مل جائے گا۔ آپ تو عید پر سیالکوٹ تشریف لے جائیں گے۔ ---ہاں تو آپ کی تعلیم کیسی جا رہی ہے۔ مشکل پرچے ہیں تو اس صورت میں آپ کو خوب محنت اور دلچسپی سے کام کرنا ہوگا۔ ورنہ۔ --- ویسے آپ کے پچھلے ٹیسٹ کے نتیجے سے اندازہ ہوتا ہے۔ آپ خوب محنت اور جی لگا کر پڑھ رہے ہیں لہذا انشاء اللہ کامیابی یقینی ہے۔ میری طرف سے والدین کو سلام عرض کریں۔ اور بہن بھائیوں کو پیار۔

والسلام
اکرم ملک

خطوط پر تبصرہ

اتنے بہت سے خطوط سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اکرم کی دلچسپیاں کتنی وسیع تھیں۔ ان کا ذہن کتنا بیدار تھا۔ وہ دوسروں سے کتنے مختلف تھے۔ ان کا مشاہدہ کتنا گہرا تھا۔ اور کیوں تھا۔ ان خطوط سے یہ حقیقت پہلی بار آشکارا ہوتی ہے۔ کہ وہ محض زاہد خشک نہیں تھے۔ طبیعت میں شگفتگی تھی رومانی آب و رنگ بھی تھا اور ان کی حس مزاح و ظرافت بھی بہت بیدار تھی۔ اس کی تائید ای۔ پی۔ آر میں اکرم کے ساتھی اب لیفٹیننٹ کرنل سید غلام اکبر پنجاب رجمنٹ کے اس انٹرویو سے ہوتی ہے۔ جو ہم نے اکرم کی شخصیت کے کردار کے مطالعہ کے سلسلے میں باب دوم میں درج کیا ہے۔

مشرقی پاکستان کی سیاحت کا میجر اکرم کو اس قدر شوق تھا۔ اور وہاں کے قدرتی حسن سے وہ کس قدر متاثر تھے۔ اس کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ "اسی دوران ڈھاکہ کے علاوہ کومیلا، چٹاگانگ، کاکس بازار، کپتائی، رام گڑھ، سلہٹ اور اس کے نواحی علاقوں کی سیر کرنے کا موقعہ ملا، مشرقی پاکستان کس قدر حسین ہے یہ دیکھنے کا موقعہ تو پہلی دفعہ نصیب ہوا۔ ہمیشہ سے چٹاگانگ اور سلہٹ کے حسین نظاروں کے بارے میں سنتے آئے ہیں۔ لیکن اب دیکھ کر تصدیق بھی ہو گئی ہے۔ چٹاگانگ اور سلہٹ کے نواحی علاقوں کے دیکھے بغیر مشرقی پاکستان کا دیکھنا تو بس یہ سمجھئے کہ بیکار ہی رہا اور اس لحاظ سے ہمارا پچھلا ایک سال بے کار ثابت ہوا" مشرقی پاکستان کی سیاحت کے اس زمانے میں وہ چٹاگانگ ہل ٹریکٹس میں آباد چکمہ قبائل بھی گئے۔ جہاں اب بھی قدیم طرز زندگی کے آثار ملتے ہیں۔ باہر کے لوگوں کا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن اکرم شہید شوق سیاحت میں وہاں بھی پہنچ گئے۔ اور اپنے کیمرے سے جی بھر کر فوٹوگرافی بھی کی۔ اور چکمہ قبائل کے نہایت نادر تصاویر اتاریں۔ فوٹوگرافی اکرم کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایسٹ رائفلز میں دو

سال گزارنے کے بعد اکرم ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء کو مغربی پاکستان واپس آگئے۔

مغربی پاکستان میں ایک سال

ای۔پی۔آر سے اکرم اپنی پلٹن ۴ ایف ایف آر سیالکوٹ واپس پہنچے۔ ۴ ایف ایف آر کے موجودہ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل جولین پیٹر اس وقت پلٹن کے ایڈجوٹینٹ تھے ان سے ہماری یہ گفتگو ہوئی۔

سوال:۔ پیٹر صاحب۔ جب اکرم ای۔پی۔آر سے واپس آئے تو یونٹ میں ان کا خیر مقدم کس طرح ہوا؟

جواب:۔ ان دنوں میں ۴ ایف ایف آر کا ایڈجوٹینٹ اور لفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) ممتاز ملک اس کے سی۔او تھے۔ میجر اکرم کے ایسٹ پاکستان رائفلز سے واپس ۴ ایف ایف آر میں پوسٹ ہونے کی اطلاع ملی۔ اس پوسٹنگ آرڈر پر ساری پلٹن نے جس مسرت اور گرم جوشی کا اظہار کیا اس سے مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ اس افسر کی یونٹ میں خاص اہمیت ہے۔ کمان افسر کرنل ممتاز ملک صاحب نے جو سگنل میجر اکرم کو دلوایا وہ بھی ان کی خصوصی حیثیت کو ظاہر کرتا تھا۔

سوال:۔ وہ سگنل کیا تھا؟

جواب:۔ سگنل انگریزی میں تھا اس کا ترجمہ کچھ یوں ہو سکتا ہے کہ اپنے گھر واپس آنا مبارک ہو۔ یونٹ کا ایجوٹینٹ میں ہی تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے میرے دفتر میں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اکرم سے یہ میری ملاقات تھی۔ طویل القامت، چھریرا بدن، سنجیدہ پُرسکون چہرہ کم گو۔ یہ تھے اکرم جنہوں نے پہلی ملاقات میں مجھے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ لیکن جب کچھ دن گذرے اور میں نے انہیں کام کرتے دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص کی شہرت بے جا نہیں۔ اکرم سیب کی طرح تھے جس کا ظاہر بے رنگ ضرور

ہوتا ہے لیکن جس کے اندر شفاف موتی چھپا ہوتا ہے۔

سوال:۔ یونٹ میں کیا خاص خدمت ان کے سپرد تھی؟

جواب:۔ چارلی کمپنی کی کمان کے علاوہ وہ یونٹ کے خصوصی اسپورٹس آفیسر تھے۔ ۲ ایف ایف کی ہاکی ٹیم تمام آرمی میں مانی ہوئی تھی۔ اکرم ۲ ایف ایف کی ٹیم کے کیپٹن تھے ہمارے کمان افسر نے ان کے ذمے یہ خاص کام لگایا تھا کہ وہ یونٹ کے کھیلوں کے معیار کو خاص کر ہاکی ٹیم کو بہتر بنائیں اور اس کام کو انہوں نے پوری ذمہ داری اور لگن سے سرانجام دیا۔

اکرم کے کردار کی یہ خوبی بہت نمایاں تھی کہ وہ اپنے ذمے ہر کام کو جان لڑا کر کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی جونیئرز اور سینئرز میں بڑی عزت تھی۔

یونٹ میں اس وقت وہ سینئر موسٹ کیپٹن تھے۔ اور غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے میس ہی میں رہتے تھے۔ ان کا جونیئر افسروں پر بڑا اچھا اثر تھا۔ وہ اپنے مخصوص ہمدردانہ انداز سے ان کی راہنمائی کرتے تھے۔

انٹیلی جنس کورس

ستمبر ۱۹۷۰ء میں اکرم کی پلٹن کوئٹہ منتقل ہوئی۔ وہاں جانے سے پہلے اکرم نے جولائی اگست مری میں انٹیلی جنس کورس بھی کیا۔ اس زمانے کی روداد کالج نمبر ۲۲۱۴ لفٹیننٹ کرنل پرویز افضل سناتے ہیں۔ جس سے اکرم کی قدروں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جس طرح پیڑ ایک پتے سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح آدمی کی شخصیت کا بھید اس کی ایک بات، ایک کام سے کھل جاتا ہے کرنل افضل لکھتے ہیں۔

جولائی اگست ۱۹۷۰ء میں انٹیلی جنس کورس کے دوران مجھے اکرم شہید سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی کالج کے ہیں تو مل کر اور بھی خوشی ہوئی۔ لیکن اکرم سنجیدہ

قسم کے آدمی تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ اس لئے تعلقات بڑھتے نہیں۔ کورس ختم ہونے کے بعد تقریباً بیس افسروں کو فوٹو ترجمانی کے چار ہفتوں کے کورس کے لئے روک دیا۔ ان میں اکرم بھی تھے۔ اب چونکہ ایک چھوٹا گروپ تھا۔ اس لئے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اور ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس خاموش طبیعت افسر کا ظرف بہت وسیع ہے اور اسے کام اور ذات پر اتنا اعتماد ہے کہ سینئر اور جونیئر کے مسئلہ کو عزت کا مسئلہ نہیں بنانا چاہتا۔

قاعدہ یہ ہے کہ ہر کورس میں زیر تربیت افسروں میں سے سب سے سینئر افسر کو کورس کا سینئر بنا دیا جاتا ہے۔ اس کی بات ذرا بڑی ہوتی ہے۔ اب ہوا یوں کہ یوں تو اکرم اپنے کورس میں پی اے نمبر کے لحاظ سے سینئر تھے۔ لیکن کسی کلرک کی غلطی سے ان کا نام دوسرے نمبر پر ٹائپ ہو گیا۔ دوسری سنیارٹی کے افسر کیپٹن گل زمان ستی کا نام پہلے آگیا تو گل زمان ستی ہی کورس سینئر بنا دیئے گئے۔ جب یہ غلطی کھلی تو گل زمان نے کہا بھی "سر آپ سینئر ہیں آپ ہی یہ منصب سنبھالئے"۔ بعض انسٹرکٹرز نے بھی اصرار کیا تو اکرم کا ایک ہی جواب تھا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ گل زمان ہی یہ کام کرتے رہیں"۔ ایک دن میں نے ذکر چھیڑا تو کہنے لگے "پرویز اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب گل زمان ہٹے گا تو اس کی سبکی ہوگی۔ چند روز کی بات ہے چلنے دو"۔

سال ڈیڑھ سال بعد جب میں نے اکرم کی شہادت کی خبر سنی تو مجھے بے اختیار یہ واقعہ یاد آگیا۔ اکرم کا اپنا قد بڑا تھا۔ انہیں کسی اور ذریعے سے اپنے آپ کو اونچا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میجری پر ترقی اور کوئٹہ میں قیام

مری میں انٹیلی جنس کورس سے فارغ ہونے کے بعد اکرم کو میجری کے عہدے پر ترقی

ٹی۔ اور وہ اپنی پلٹن سے کوئٹہ میں جا ملے۔ کوئٹہ میں اکرم کی زندگی، مشاغل اور کارکردگی کے متعلق ہم کھوج لگانے میں مصروف تھے۔ کہ ہمیں کسی نے بتایا کہ اے۔ ای۔ سی کے ایک صوبیدار میجر محمد اعظم علوی ہیں جو کوئٹہ میں بھی میجر اکرم کو خوب جانتے تھے۔ اور آخر کار بوگرہ میں اکرم کی تدفین بھی ان ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ بہت اہم اطلاع تھی۔ ہم نے علوی صاحب کا سراغ لگانے کے لئے اے۔ای۔سی سنٹر اپر ٹوپہ مری ہلز کے کمانڈنٹ مکرم اور محترم کرنل آئی۔ آر صدیقی صاحب کو لکھا۔ انہوں نے از راہِ کرم علوی صاحب سے ملاقات کا اہتمام کرایا۔ علوی صاحب سے بہت دلچسپ اور خیال انگیز گفتگو ہوئی۔ اس بات چیت کی تفصیل یہ ہے۔

سوال:۔ اعظم صاحب پہلے تو یہ بتلایئے کہ آپ کی ملاقات اکرم شہید سے کب اور کہاں ہوئی اور آپ کے ان سے کیسے تعلقات تھے؟

جواب:۔ ہم ایف ایف آر غالباً ستمبر ۱۹۷۰ء میں سیالکوٹ سے کوئٹے تبدیل ہو کر آئی تھی میں کوئٹے میں اس پلٹن میں پوسٹ ہوا تھا۔ اس طرح کوئٹہ میں پہلی بار میں نے میجر اکرم کو دیکھا۔ ان سے ذرا قریبی تعلق کی صورت یہ نکلی کہ کچھ دنوں کے بعد فرسٹ اسٹینڈرڈ میپ ریڈنگ کا امتحان ہونا تھا۔ امتحانی بورڈ کے پریذیڈنٹ میجر صاحب تھے میں ان کا معاون مقرر ہوا تھا۔ مجھے انہوں نے اپنے دفتر میں بلایا اور کہا صوبیدار صاحب میرا اصول یہ ہے کہ میں پہلے ہمیشہ آدمی پر اعتبار کرتا ہوں اور آپ تو ماشاءاللہ ایجوکیشن کے تجربہ کار جی۔سی۔او ہیں آپ پرچہ بنایئے اور مجھے دکھا دیجئے۔ میں نے جواب دیا۔ بہت بہتر سر۔ اور چلا آیا۔ انہوں نے میرے تعاون سے امتحان لیا اور خوب لیا۔ اس امتحان کے دوران ہی میں میجر اکرم کی شخصیت سے متاثر ہوا۔ میرے دل نے کہا یہ میجر کوئی عام میجر نہیں ہے۔

سوال:۔ کیوں؟

جواب :۔ اس لیے کہ جس ذمہ داری اور انصاف پسندی سے انہوں نے یہ امتحان لیا۔ وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مجھے انہیں ذرا قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔

سوال: وہ کیسے ؟

جواب :۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میجر اکرم ہاکی کمال کی کھیلتے تھے۔ اور اپنی یونٹ کی ٹیم کے کیپٹن تھے ہاکی ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ ہاکی کے عاشق تھے۔ اپنی ہاکی ٹیم کو بہتر بنانے کی تگ و دو کرتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں غالباً ان کی یونٹ کو کسی ٹورنامنٹ میں حصہ لینا تھا اور وہ ٹیم کو کچھ پریکٹس دینا چاہتے تھے۔ گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی ٹیم اچھی تھی اس سے انہوں نے میچیں رکھیں۔ اس کالج کی ہاکی ٹیم میں میرا بیٹا آصف علوی بھی کھیلتا تھا انہیں اس کا کھیل پسند آیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ آصف میرا بیٹا ہے تو بہت خوش ہوئے اور اس کی ہمت افزائی کرنے لگے۔ اس کو اپنی یونٹ کی ٹیم کے ساتھ کھلاتے اور ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میجر اکرم اپنے ہلکے نیلے سکوٹر پر اسے لینے آتے اور پھر بکمال شفقت اسے مغرب کی اذان سے پہلے چھوڑ بھی جاتے کبھی کبھی اسے میس میں بھی لے جاتے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ فوجی زندگی سے مانوس ہو جائے۔ اور فوج میں جائے۔ میجر اکرم نے اسے ایک کتاب عرب اسرائیل جنگ پر دی تھی آصف بھی میجر اکرم سے بہت متاثر رہا ہے۔ وہ انہیں اپنا مُربی سمجھتا ہے اور اب کمیشن لے کر ان کے نقش قدم پر ہے۔ یونٹ کی ہاکی ٹیم کے لئے انہوں نے ایک بلوچی لڑکے کو بھی پلٹن میں بھرتی کرنے کو کوشش کی تھی۔ وہ لڑکا ہاکی بہت اچھی کھیلتا تھا۔ ایک روز کہنے لگے۔ کل اتوار ہے اس لڑکے کے گھر چلیں گے۔ اس کے باپ سے مل کر اس کی بھرتی کی بات پکی کرنا ہے۔ آپ صبح سویرے میس آجایئے گا۔ میں صبح سویرے میس پہنچا تو کمرہ بند تھا۔ اردلی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ صاحب سو رہے ہیں۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ ابھی یہ

بات ہو رہی تھی خود باہر آ گئے بولے معاف کیجئے تلاوت کے بعد ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ بہت معذرت کے بعد ناشتہ کرنے گئے میں کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔

سوال:۔ کمرہ کیسا تھا؟

جواب:۔ کمرہ میں قائد اعظم کی تصویر آویزاں تھی۔ کتابوں کی شیلف کے اوپر قرآن شریف تھا۔ اور شیلف میں کچھ کتابیں۔

سوال:۔ کس قسم کی کتابیں؟

جواب:۔ غالباً ملٹری ہسٹری کی تھیں۔

سوال:۔ قرآن شریف باترجمہ یا بے ترجمہ؟

جواب:۔ یہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اتنا مجھے معلوم ہے کہ وہ نماز کے بعد قرآن شریف کی تلاوت ضرور کرتے تھے۔ اور قرآن شریف کی ایک جیبی جلد ان کی وردی کی جیب میں ہمیشہ رہتی تھی۔

سوال:۔ کیا دفن کے وقت بھی قرآن مجید کی جلد ان کی جیب میں تھی۔

جواب:۔ نہیں مجھے یقین ہے کہ شہادت کے وقت ضرور ہوگی۔ کسی کے شہید ہونے کے بعد عموماً گھڑی اور انگوٹھی وغیرہ اتار لی جاتی ہے اور جیبوں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ اکرم شہید کی شہادت کی اطلاع تو ہمیں بوگرہ کے بریگیڈ ہیڈکوارٹر سے اسی روز یعنی ۵ر دسمبر کی دوپہر کو مل گئی تھی۔ یہ اطلاع کہ ان کی لاش دفنانے کے لئے لائی جا رہی ہے۔ ہمیں ۶ر دسمبر کی دوپہر کو دو ڈھائی بجے ملی تھی۔

سوال:۔ اعظم صاحب کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ آپ واقعات کا تسلسل باقی رکھیں۔ آپ کوئٹے کی بات کر رہے تھے۔ وہاں سے مشرقی پاکستان کب پہنچے؟

جواب:۔ کوئٹے سے ہماری پلٹن (۴ ایف ایف آر) کو بہت تھوڑے نوٹس پہ مشرقی پاکستان جانے کا حکم ملا۔ غالباً ۲۸ر مارچ کو پلٹن کوئٹے سے روانہ ہوئی۔ ۳۱ر مارچ ۷۱ء کو کراچی سے پرواز

کی ہیں پلٹن کا ساز و سامان سمیٹنے کے لئے پیچھے رہ گیا تھا۔ میجر اکرم کے کمرے میں ان کا ایک سوٹ کیس کھلا رہ گیا تھا۔ اس میں سونے کی ایک انگوٹھی بھی تھی کف بٹن تھے۔ ان کا دوسرا سامان تو میں نے ان کے دوستوں کیپٹن مشتاق وغیرہ کے حوالے کیا انگوٹھی اور بٹن میں نے لفافے میں ڈال کر رکھ لئے کہ مشرقی پاکستان جا کر ان کو دوں گا۔ کراچی سے ہم ایس ایس اینڈ یوفس سے روانہ ہوئے۔ ۲۸ اکتوبر ۱۷ء کو جہاز چالنا کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا (یہ آخری پاکستانی جہاز تھا جو چالنا کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا) چالنا سے جیسور اور جیسور سے ریل کے ذریعے ہم بوگرہ پہنچے۔ بوگرہ سے یکم نومبر ۷۱ء کو میں پلٹن کے ہیڈکوارٹر گیا۔ لیکن اکرم شہید سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ ھلی کے محاذ پر سب سے اگلے مورچوں میں تھے۔ ۱۶ نومبر ۷۱ء کو میری ملاقات ہوئی۔ جیب میں سے لفافہ نکالا اور ان کے حوالے کیا تو بہت حیران ہوئے بولے یہ کیا ہیں نے کہا کھول کر دیکھئے۔ جب کھول کر دیکھا تو سونے کی انگوٹھی اور کف لینکس تھے اور بھی حیران ہوئے کہنے لگے آپ نے بڑی تکلیف کی۔ آصف کو دے دینا تھا۔ وہ بھی میرا بھائی ہے مجھے ان چیزوں کا یہاں ہوش کہاں۔ میں اب ان کا کیا کروں گا؟ میں نے کہا سر یہ آپ کی امانت تھی۔ دوسری چیزیں آپ کے گھر بھجوا دی ہیں۔ اکرم صاحب بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔ آخر میں کہا ہاکی کھیلنا نہ چھوڑے اور جب کمیشن ملے تو ۴ ایف ایف آر کو یاد رکھے۔ یہ میری مشرقی پاکستان میں پہلی اور آخری ملاقات تھی پھر دیکھا تو تابوت کا تختہ ہٹا کر ان کا چہرہ ہی دیکھا۔

شہادت کی طرف پہلا قدم

۳۱ مارچ ۷۱ء کو میجر اکرم شہید مشرقی پاکستان پہنچے تھے اور ۵ دسمبر ۷۱ء کو صبح نو دس بجے کے درمیان وہ ھلی کے محاذ پر شہید ہوئے۔ اس عرصے کے واقعات و حادثات کی تفصیل کے لئے ہم نے میجر اکرم کی کمپنی کے سینئر جے۔ سی۔ او صوبیدار محمد دین سے ایک

طویل انٹرویو لیا۔ جس کو ان ہی کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے۔

صوبیدار محمد دین کی یادیں

۷۱ء کے شروع میں ۴ ایف ایف آر کوئٹہ تھی۔ وہاں سے ہمیں کوچ کا حکم ملا۔ ۲۰ مارچ کو ہم نے کراچی سے پرواز کی۔ اسی روز تقریباً گیارہ بجے شب ہم ڈھاکہ کے تیج گاؤں ایرپورٹ پر اترے۔ یہ ایک طرح سے پلٹن کا ہراول دستہ تھا جس کے کمانڈر میجر اکرم تھے۔ میں ان کی "سی" کمپنی کے سینئر جے۔ سی۔ او کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے ڈھاکہ کینٹ کے ایک اسکول میں اپنا ہیڈکوارٹر قائم کیا تھا۔

۳۱ مارچ ۷۱ء کو ہماری پلٹن کے سی او لفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) ممتاز ملک بھی باقی نفری کے ساتھ ہم سے آکر مل گئے۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ مشرقی پاکستان میں ہماری پلٹن کو دو سی او نے کمانڈ کیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہم وہاں پہنچے تو پلٹن کے سی او کرنل ممتاز ملک صاحب ہی تھے۔ ۱۹ اپریل ۷۱ء کو لفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر محمد تشلاق) عباسی صاحب نے پلٹن کی کمان سنبھالی۔ اور نومبر ۷۱ء کے آخر تک پلٹن نے جتنے ایکشن کیے عباسی صاحب ہی کی کمان میں کیے۔ ۵ دسمبر ۷۱ء سے چھ سات دن پہلے کرنل عباسی صاحب دشمن کی شیلنگ سے اپنے بنکر میں زخمی ہوگئے تھے۔ اور ہسپتال میں تھے۔ ان ہی دنوں ۵ دسمبر سے چند روز پہلے ۲۶ نومبر ہمارے پرانے سی او کرنل ممتاز ملک جنرل نیازی کے اسٹاف افسر کی حیثیت سے ہلی ایریا میں معائنے کیلئے آئے۔ پلٹن کو دیکھا جوانوں سے ملے۔ جب جانے کا وقت آیا۔ ہیلی کاپٹر سامنے کھڑا تھا۔ جنرل کا رُخ اس کی طرف تھا۔ اس وقت کرنل صاحب (ممتاز ملک) نے جنرل نیازی سے کہا۔ اس پلٹن کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ۴ ایف ایف آر میری اپنی پلٹن ہے۔ جنرل صاحب کی رضامندی سے کرنل (ممتاز ملک صاحب) ہمارے ساتھ ہی رہ گئے۔ اور پلٹن کی کمان سنبھال لی۔ یہ واقعہ لفٹیننٹ کرنل خالد بشیر کے سامنے کا ہے۔ اس کے چند روز بعد ہی

تل کا مشہور معرکہ پیش آیا۔

اب میں ۱۴ر مارچ ۱۹۷۱ء سے بعد کے واقعات بیان کرتا ہوں۔ ۲راپریل ۱۹۷۱ء کو ہم نے رنگ پور کے علاقے میں لال منیر ہٹ کے ہوائی اڈے پہ ایکشن کیا۔ اس ایکشن میں "سی" کمپنی کے ساتھ پلٹن کے کرنل ممتاز ملک بھی تھے۔ ۲راپریل سے ۱۹ راپریل تک ہم لال منیر ہٹ ہی میں رہے۔ ۳راپریل ۱۹۷۱ء کو باقی پلٹن بھی ہمارے ساتھ آکے مل گئی تھی۔ اس کے بعد میجر اکرم کی کمان میں سی کمپنی نے مغل ہٹ پر قبضہ کیا۔ مغل ہٹ ہندوستانی سرحد سے قریب ایک سرحدی چوکی ہے اس ایکشن کے بعد اسی کمپنی نے ہاتھی باندا گاؤں پر قبضہ کیا۔ ۱۹راپریل کو کرنل ممتاز ملک صاحب نے پلٹن کی کمان کرنل اخلاق عباسی صاحب کے سپرد کی۔ جو نومبر ۱۹۷۱ء کے آخر تک بڑے مشکل مرحلوں میں پلٹن کی راہنمائی کرتے رہے۔

۱۹راپریل کو یا ایک آدھ دن بعد ہماری سی کمپنی ریل سے کڑی گرام روانہ ہوئی۔ ٹروپس کے ساتھ ٹینک بھی تھے۔ ابھی سات میل ہی گئے تھے کہ ریلوے لائن اکھڑی ہوئی ملی۔ میجر صاحب نے اس کا انتظام کر رکھا تھا۔ چلتے وقت انہوں نے گاڑی میں چار پش ٹرالی بھی رکھوا لی تھیں اب ہمارے آگے بڑھنے کی صورت یہ تھی کہ جہاں ریلوے لائن مخدوش نظر آتی ٹرالی کو اٹھا کر لائن پر دوڑاتے۔ اور ایمونیشن اتار کر آگے لے جاتے۔ پھر دوبارہ پش ٹرالی میں لادتے۔ اس روز دن کے دو بجے فائر آیا ہم نے حملہ کر کے اس جگہ قبضہ کیا اور پیش قدمی جاری رکھی۔ ۷ بجے نیو کڑی گرام پر قبضہ کر لیا۔ صرف اسلحہ بارود ساتھ لے کر گئے تھے۔ باقی سامان راشن بستر وغیرہ پیچھے گاڑی میں ہی رہ گئے تھے۔ رات نیو گرام ہی میں رہے۔ شام کا کھانا کرنل عباسی صاحب اپنی جیپ میں لے کر آ رہے تھے۔ لیکن رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ملاپ نہ ہو سکا صبح سویرے وہ آملے۔ تو صبح سات بجے رات والا کھانا ملا۔ اور نعمت معلوم ہوا۔ کھانے کے بعد کرنل عباسی صاحب نے حکم دیا کہ پرانے کڑی گرام پر قبضہ کر لیں۔ وہاں تھری انچ مارٹر کا فائر بھی آیا تھا۔ اس وقت تک ہمارا ٹینک ٹروپ بھی ہمارے ساتھ آکے مل گیا تھا۔ دن کے کوئی

ایک بجے وہاں سے کڑی گرام سے سات میل دور علی پور کی طرف مارچ کیا۔ وہاں رات رہے وہاں سے چل ماڑی پہنچے (چل ماڑی دریائے برہم پترا پر ایک گھاٹ ہے) اسے مکتی باہنی سے صاف کیا۔ ۱۶ مئی ۱۹۷۱ء تک ہم کڑی گرام اور چل ماڑی کے علاقے میں رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ٹرالی کے ذریعہ پل ماڑی سے کیپٹن مشتاق (ابھی میجر) ہمارے لئے کھانا لاتے تھے۔ ۱۶ کو پنجاب گروپ کی ایک پلٹن کو یہاں کا چارج دے کر ہم بوگرہ واپس آگئے۔ تین دن ہم بوگرہ میں رہے اس عرصے میں ہماری پوری پلٹن وہاں آگئی تھی۔

۱۹ مئی ۱۹۷۱ء کو ہماری سی کمپنی نے ۲۶ ایف ایف کی ایک کمپنی سے ہلی کا چارج لیا۔ ۱۹ مئی سے ۲۳ اکتوبر تک ہم لوگ ہلی کے اسٹیشن اور اس کے آس پاس رہے۔ ہلی بالکل سرحد پر واقع ہے۔ ریلوے لائن ہلی کے قصبے کے بیچ سے گزرتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پاکستانی علاقے میں تھا۔ لائن کے اس پار ہندو اور مکتی باہنی والے تاک لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ اور جوں ہی کوئی گاڑی گزرتی وہ اس پر فائر کرتے۔ ہلی اسٹیشن اور ریلوے کی بڑی اہمیت تھی۔ یہی ہماری سپلائی لائن تھی۔ اسی کو وہ ناکارہ کرنا چاہتے تھے۔ سڑک بھی محفوظ نہیں تھی۔ پل پر اور سڑک پر بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی تھیں۔ ہم سڑک کو صاف کرنے کیلئے ریت سے بھری بیل گاڑی چلاتے تھے۔ مئی سے اکتوبر تک آس پاس کے علاقے کے کافی گاؤں ہم نے مکتی باہنی سے صاف کرائے۔ یہاں ایک اور بات پائی جس کا ذکر ضروری ہے۔ ہلی میں چاول کے اور دھان کے گودام تھے۔ میجر اکرم نے ان پر مہر لگوا دی تھی۔ گاہے گاہے وہ اپنی نگرانی میں یہ چاول ہلی کے علاقے کے غریبوں میں تقسیم کرواتے تھے۔

۲۴ اکتوبر کو ہماری سی کمپنی کی جگہ ہماری ہی پلٹن کی ڈی کمپنی تعنیات کر دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ ہمیں کچھ آرام ملے۔ مگر آرام اب کہاں۔ ۲۰ اکتوبر سے ہی انڈیا کی باقاعدہ فوج کا توپ خانے اور چھوٹے ہتھیاروں کا فائر آرہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ بڑے پیمانے پر لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء کو ہماری سی کمپنی کو حکم ملا کہ چورکئی سٹیشن پر جاؤ۔ ۲۶ ایف ایف سے جا کر چارج

لو۔ تم حکم بجا لائے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے ایکشن ہوتے رہے۔

۲۲-۲۳ نومبر ۱۹۷۱ء کی رات کو ہماری بٹالین کی ڈی کمپنی جو اب ھلی اسٹیشن پر متعین تھی اس پر دشمن نے زبردست حملہ کیا تھا۔ اس پوسٹ کو واپس لینا اشد ضروری تھا۔ الفا کمپنی اور سی کمپنی کو حکم ملا کہ ۲۵، ۲۶ نومبر رات کے دو بجے حملہ کرنا ہے۔ کئی وجوہ سے حملہ ہوتے ہوتے چھ بج گئے۔ بھرپور حملہ کیا گیا۔ میجر اکرم ہمارے ساتھ تھے۔ چار جوان شہید ہوئے۔ آٹھ دس زخمی ہوئے۔ چونکہ ٹینک اور آرٹلری سپورٹ بالکل نہیں تھی اور صبح بھی ہو گئی تھی۔ حملہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ حالانکہ اپنے جوان بے جگری سے صرف رائفلیں لے کر دشمن کے مورچوں میں گھس گئے تھے۔ لیکن انڈین ٹینکوں کے آگے وہ بے بس ہو گئے۔ اسی طرح حملے کی ناکامی کے بعد ہم بولدار گاؤں میں واپس آئے۔ وہاں حکم ملا کہ چرکئی کے علاقے میں اپنی پوزیشن پر واپس چلے جائیں۔

ھلی کے اسٹیشن پر ہماری بٹالین کی ڈی کمپنی تھی۔ اس کے قریب ایک پوسٹ پر انڈیا نے قبضہ کر لیا تھا۔ جس سے ہماری سپلائی لائن بالکل کٹ گئی تھی۔ اس پوسٹ کو ہر قیمت پر دشمن کے قبضے سے چھڑانا تھا۔ اس پوسٹ پر انڈیا کی پوری ایک بٹالین قابض تھی۔

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اعلان جنگ ہوا تھا۔ اسی دن میجر اکرم کی سی کمپنی کو حکم ملا کہ دشمن پر داہنی طرف سے دباؤ ڈالیں تاکہ دشمن مزید پیش قدمی نہ کر سکے۔ اس طرف سے دباؤ ڈالا گیا تو دشمن نے جس کے پاس نفری اور اسلحہ کی کمی نہیں تھی براہ راست تین چار حملے کئے۔ چار اور پانچ دسمبر کی رات تابڑ توڑ حملے آئے ٹینکوں کے ساتھ خاص طور پر میجر اکرم کی کمپنی کی اس پلاٹون پر جس کے وہ خود کمانڈر تھے۔ ۴ تاریخ کی شام ان کا پلاٹون کمانڈر صوبیدار ولی محمد زخمی ہو گیا۔ دوسرے جوان بھی کام آئے۔ پلاٹون کا خاصا نقصان ہوا۔ صورت حال یہ تھی کہ ہمارے پاس نہ ٹینک تھے نہ توپ خانے کا فائر۔ دشمن کے ٹینک ہمارا ناقابل تلافی نقصان کر رہے تھے۔ کچھ دیر میں پوری کمپنی تباہ ہو جاتی تھی اور ایک اہم پوزیشن ہاتھ سے جاتی رہی۔ ھلی کی

فوجی اہمیت اتنی تھی کہ میجر اکرم نے وہ غیر معمولی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ جس کو بروئے کار لانا عام انسانوں کا کام نہیں ہوتا۔ اور وہ فیصلہ تھا۔ دشمن کے ٹینکوں پر ڈائریکٹ ہٹ کرنا۔

۵ دسمبر ۱۷ء کی صبح کو نو دس بجے میجر اکرم نے ۴۰ ایم ایم ایل۔ اور ایک سپاہی کے ساتھ دشمن کے ٹینکوں کی طرف بڑھنے لگے۔ آرٹلری فائر کا کچھ دھواں بھی تھا۔ بہرحال وہ بے جگری سے ڈیڑھ دو سو گز آگے تک پہنچ گئے۔ اور اپنی ۴۰ ایم ایم سے ڈائریکٹ ہٹ کیا۔ اس طرح دشمن کے تین ٹینک تباہ کر دیئے۔ دشمن کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنے قریب سے فائر ہو گا۔ بہرحال جب دھواں اٹھا تو دشمن نے دیکھا کہ یہ شخص تو سر پر آکر فائر کر رہا ہے۔ یکایک دشمن کی مشین گنیں حرکت میں آگئیں۔ دھڑا دھڑ گولیاں برسنے لگیں۔ میجر اکرم اور وہ سپاہی دونوں ڈائریکٹ برسٹ سے شہید ہو گئے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ دونوں شہیدوں کی لاشیں کیسے لائی جائیں۔ دشمن کے ٹینک پوزیشن میں تھے اور فائر کر رہے تھے۔ میجر صاحب کی شہادت کے بعد لیفٹیننٹ ترمذی نے عارضی طور پر کمان سنبھالی۔ کوشش تھی کہ کسی طرح شہیدوں کو اٹھا کر لائیں۔ اتنے میں مورچے کے قریب ایک اور گولا آکے پھٹا جس سے لفٹیننٹ ترمذی اور میں (صوبیدار محمد دین) ایک حوالدار اور ایک نائیک سمیت سات آدمی شدید زخمی ہوئے۔ کمانڈ بنکر کا فون سیٹ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا صرف ایک سپاہی محمد مانک جو میجر اکرم کے ساتھ سگنل مین تھا۔ سلامت بچا۔ یہی سپاہی کمپنی ہیڈ کوارٹر سے ایک فون لایا۔ اور اس کے ذریعے سے پلٹن کے ساتھ دوبارہ ملاپ قائم ہو گیا۔ اسی سپاہی نے آرٹلری کے او۔ پی کا کام کیا۔ کچھ دیر بعد زخمی پیچھے بھیج دیئے گئے۔ پلٹن کے ایجوٹینٹ مظفر گل فوری طور پر لیفٹیننٹ ترمذی کی جگہ لینے آئے۔ دو بجے کے قریب پلٹن کے سیکنڈ ان کمانڈ میجر آصف نے کمپنی کی کمان سنبھالی۔ اس تمام عرصے میں شہیدوں کی لاشیں وہیں پڑی رہیں۔ اندھیرا ہو گیا تو میجر آصف ہارون اور لانس حوالدار امیر نواز شہیدوں کو

اٹھا کے لائے۔

جب میجر اکرم کی لاش میدان سے لائی گئی تو ان کا ایک ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا اور اتنے عرصے میں قدرے اکڑ گیا تھا۔ میں نے کوشش سے نیچے کر کے اسے پٹی سے باندھا دونوں لاشیں پلٹن کے ہیڈکوارٹر میں پہنچا دی گئیں۔ دوسرے روز پلٹن نے انہیں بوگرہ میں دفن کیا۔

۳۱ مارچ ۷۱ء سے ۵ دسمبر ۷۱ء کی صبح کے واقعات کا سرسری خاکہ صوبیدار میجر محمد دین صاحب کی زبانی ان کی یادداشتوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم معرکہ ہلی کا ایک مفصل اور مستند جائزہ اس معرکہ کے ایک شریک کارزار مبصر لیفٹیننٹ کرنل آصف ہارون کے قلم سے پیش کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان خطوط کو نقل کریں جو میجر اکرم نے ۱۵ جون ۱۹۷۱ء سے ۱۲ نومبر ۱۹۷۱ء تک اپنے عزیزوں کو لکھے۔ ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکرم ان کس طرح سوچ رہے تھے۔ ان کا ایمان و ایقان کس درجے کا تھا۔ اور کس طرح قدم بہ قدم وہ شہادت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

۷۸۶

مشرقی پاکستان

۱۵-۶-۷۱

ڈیر اصغر سلامت رہو

السلام علیکم!

یاد آوری کا شکریہ۔ کل آپ کا خیریت نامہ ملا۔ خیر پاکر خوشی ہوئی۔ تبدیلی اگر میٹھی نہیں تو کم از کم نمکین ضرور ہے۔ اب تو آپ اپنے شہر میں پھر سے قابض ہو چکے ہوں گے۔ میں آج کل ایسے شہر میں ہوں جو کہ آدھا پاکستان اور آدھا ہندوستان میں ہے۔ تفصیل شاید پھر لکھ سکوں۔

آپ نے شکایت کی ہے کہ میں بھول گیا ہوں یہ تو وہی بات ہوئی کہ الٹا چور کوتوال کو

ڈانٹئے آپ نما ... تو ہم کو ایک عرصے سے بھول گئے ہیں۔ اور میں بھی کچھ مصروفیت اور اپنی سستی کی وجہ سے آپ کو خیریت کی خبر نہ دے سکا۔ آپ کا خط ملتے ہی میں حاضر خدمت ہو گیا۔ ٹھیک ہے نا۔

آپ نے جن تین ساتھیوں کا نام لیا ہے تو وہ ابھی تک آپ ہی کی طرف ہیں ظہور شاید جلد ہم میں شامل ہو جائے۔ مشتاق کے لئے کوشش جاری ہے وہ واپس ہم سے آملے اور نیازی کے آنے کا امکان نہیں۔

باقی سب خیریت ہے۔ حالات اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پرسکون ہیں۔ سرحد پر البتہ معمولی گڑبڑ ہوتی رہتی ہے۔ ورنہ ملک میں روزمرہ کی زندگی معمول پہ آچکی ہے۔ لوگ ہندوستان سے واپس آنا شروع ہو گئے ہیں۔ البتہ ہندوستان کی طرف سے رکاوٹ کی وجہ سے ان لوگوں کو چھپ کر آنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے واپسی کی رفتار سست ہے البتہ جو آدمی واپس پہنچتا ہے وہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

کل میں ۱۱ جون کا جنگ اخبار دیکھ رہا تھا۔ ۵۰۰ اور ۱۰۰ روپے کے نوٹوں کی بے حرمتی ہوتے دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ کراچی کے لوگ اتنے بے مروت ہو گئے ہیں۔ اتنی پیاری اشیاء کو گندے پانی کے نالوں کی نذر کر رہے ہیں۔ اللہ ہی ان سے سمجھے۔ بہرحال حکومت نے یہ نوٹ منسوخ کر کے بہت ہی اچھا اور اہم قدم بڑھایا ہے۔ مشرقی پاکستان کے بنکوں سے کس قدر رقم لوٹی گئی ہے۔ سن اور دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ ایک ایک افسر نے کروڑوں روپے بٹور لئے۔ سرحدی شہروں میں شاید ہی کوئی بنک یا سرکاری خزانہ محفوظ رہا ہو اور پھر اناج اور پٹ سن کی جو مقدار ہندوستان لے جائی گئی ہے۔ اس کا اندازہ ہی ہو سکتا ہے حساب نہیں۔

بہر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہم لوگوں کو ہمت دی ہے کہ حالات اتنی جلدی قابو کرتے ہیں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ورنہ ہندوستان نے اس ملک کی تباہی کا پورا سامان

کیا تھا۔ اللہ ہمارا نگہبان ہے۔ میری طرف سے بھائی صاحب اور ہمشیرہ صاحبہ کو سلام و آداب چھوٹوں کو پیار۔

والسلام

اکرم ملک

۲۵ر جولائی ۷۱ء

بخدمت جناب والد صاحب خدا آپ کو سلامت رکھے

السلام علیکم!

گھر سے خط ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کافی گھبراہٹ میں لکھا گیا تھا۔ لکھنے والے نے اپنا نام تک لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ پڑھ کر کہ آپ لوگوں کو بہت زیادہ فکر اور تشویش ہے۔ دکھ ہوا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جلد از جلد آپ لوگوں کو اپنی خیریت سے مطلع کرتا رہا کروں لیکن کبھی کبھی تاخیر ہونا ضروری ہے۔ اور پھر جب ۲۴ر اپریل کا خط ملا ہے تو ۲۶۔ اپریل سے زیادہ فکر کس وجہ سے ہو گئی۔ اس سلسلہ میں، میں ایک بات لکھنے کی گستاخی کروں گا۔ امید ہے آپ معاف کریں گے۔

اسلام قوم اور ملک کی حفاظت کے سلسلہ میں کوئی جان قیمتی نہیں ہے۔ ہم سب کا فرض ہے کہ مذہب اور ملک کی حفاظت کے لئے اپنی جان قربانی کے لئے پیش کریں جو کہ اس سلسلہ میں پاکستان کی جانباز فوج کر رہی ہے۔ اب کس کی قربانی اللہ تعالیٰ کے حضور قبول ہوتی ہے وہ ہم میں سے کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ البتہ ہم میں سے جو جوان یا افسر ملک کی حفاظت میں اپنی جان قربان کرتا ہے۔ باقی اس پر فخر محسوس کرتے ہیں اور نئے جذبہ سے اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ لیکن جیسے کہ ہمارا ایمان ہے کہ موت کا وقت جگہ اور واقعات بھی پہلے سے مقرر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم میں سے کون مذہب اور وطن کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گا۔ لیکن

جس کی شہادت لکھی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ تو پھر فکر کس بات کی ہے۔ ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم اپنے ملک، مذہب اور اپنی افواج کی حفاظت اور فتح کے لئے دعا کرتے رہیں۔

جیسا کہ میں نے اس سے پہلے لکھا ہے مشرقی پاکستان کے حالات بہت حد تک معمول پر آچکے ہیں۔ ملک میں جنگ کی کیفیت نہیں ہے۔ سرحد پر دونوں قسم کے دشمن سے کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی ہے۔ جو کہ باعث تشویش نہیں ہے۔ فکر کرنے کی بات نہیں ہے ویسے جس کا وقت پورا ہے اسے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ آدمی گھر میں بیٹھے بیٹھے یا معمولی حادثہ میں بھی مر جاتا ہے۔ ہم سب کے لئے دعا کرتے رہا کریں۔ اور ہم عزم کئے ہوئے ہیں کہ پاکستان کے دشمنوں کو نیست و نابود کر کے دم لیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خط لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی فرصت نہیں ہوتی۔ تشویش اور فکر کی ضرورت نہیں۔ میری طرف سے نانی صاحبہ، والدہ صاحبہ اور پھوپھی صاحبہ کو سلام عرض کریں۔ باباجان ماموں ملنشی خان، اشفاق، اسلام اور برادری میں سب کو سلام عرض ہو۔ قیوم صاحب، تو لیئے لفافہ اور کاغذ بھیجنے کا شکریہ۔

زیادہ آداب

آپ کا بیٹا اکرم ملک

یہ خط ملک سخی محمد صاحب کے ایک خط کے جواب میں ہے۔

جس میں انہوں نے میجر اکرم کو اپنے تحفظ کے بارے میں ضروری احتیاط کرنے کے بارے میں تشویش ظاہر کی تھی۔ بات یہ تھی کہ مشرقی محاذ سے سرگودھا کے ایک صوبیدار میجر شدید زخمی ہو کر سی ایم ایچ منگلا میں علاج معالجے کیلئے آئے تھے۔ کسی طرح ان سے اکرم کے چھوٹے بھائی کی ملاقات ہو گئی۔ جب میجر اکرم شہید کا ذکر آیا تو ان صوبیدار صاحب نے کہا۔ یقینی

تمہارے بھائی میجر اکرم تو وہاں شیر بنے ہوئے ہیں۔ سخت گولہ باری میں بھی جان کی پرواہ کئے بغیر جوانوں کے مورچوں میں جاتے ہیں۔ اور ان کی ہمت بندھاتے ہیں۔ یہ خبر جب میجر اکرم کے والد کو پہنچی تو انہوں نے فکرمندی کا خط لکھا۔ ان کے بعد میجر اکرم کے بہنوئی ملک محمد حنیف نے بھی محتاط ہونے کی ضرورت کا ایک خط لکھا۔ اور اپنی دلیل کو مضبوط بنانے کے لئے انہوں نے اس حدیث کا ذکر بھی کیا جس میں رسول کریم نے ایک صحابی کو اونٹ کے دونوں گھٹنے باندھ کر اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کو کہا تھا۔ اس خط کے جواب میں میجر اکرم نے لکھا

۷۸۹

مشرقی پاکستان

۱۰-۷-۷۱

ڈیر اصغر

السلام علیکم!

آپ کا خیریت نامہ موصول ہوا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ دعا ہے کہ خداوند کریم جلد از جلد آپ کی ملازمت کا بندوبست کر دے تاکہ بے رونقی اور بوریت ختم ہو جائے ویسے لاہور جیسے شہر میں بوریت کا کیا سوال ..... ہمارے شہر میں ہوتے تو آپ ......

آج کل ہم ایسے شہر میں رہ رہے ہیں۔ جو کہ تقریباً ۵۰ فیصد ہمارا اور ۵۰ فیصد ہندوستان کا ہے۔ یہ بھی انگریزوں کا کمال ہے کہ کیسے کیسے انہوں نے تقسیم کی اور دونوں ملکوں کے لئے کئی ایک دردسر چھوڑ گئے ہیں۔

ملک کے حالات اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اچھے ہیں۔ ملک کے اندرونی حصے میں کوئی گڑبڑ نہیں۔ البتہ سرحدی علاقہ میں ہندوستان اور ان کے "غلام" اکثر فائرنگ کرتے رہتے ہیں۔ جن کے مقصد دو معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو پناہ گزینوں میں خوف و ہراس پیدا کرنا تاکہ وہ اپنے وطن واپس نہ جائیں اور دوسرا پاکستانی فوج کو ہراساں کرنا۔ پہلے مقصد میں

ان کو کسی حد تک کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ کیونکہ خوف کی وجہ سے وہ لوگ واپس اپنے گھروں میں آنے سے کتراتے ہیں۔ حالانکہ جو کوئی ہندوستان سے باخیریت واپس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ ہندوستانی اور ان کے چیلے البتہ دوسرے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے اور انشاء اللہ کبھی نہ ہوں گے۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ وہ مسلمان مجاہدوں سے کبھی جنگ نہیں جیت سکتے۔ کیونکہ مسلمان اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے جام شہادت پینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ اسلام کا بول بالا ہو اور پاکستان کی سالمیت برقرار رہے۔

ہندوستان میں گئے ہوئے پاکستانی پناہ گزین ذلت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ ان کی رہائش خوراک اور علاج کا کوئی انتظام نہیں ہے وبا کا بہت زور ہے اور سینکڑوں کی تعداد میں لوگ روز مر رہے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہندوستانی ان سے بدسلوکی سے پیش آتے ہیں۔ اور جب وہ واپس پاکستان آنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو ڈرا دھمکا کر روک دیا جاتا ہے۔ اور جو کوئی چھپ کر واپس آنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے پکڑے جانے پر یا تو قتل کر دیا جاتا ہے اور یا پھر اس کا سارا سامان ضبط کر کے اسے پاکستان میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ ان میں زیادہ تعداد بنادہ لوح غریبوں کی ہے۔ جن کا بنگلہ دیش سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اب چونکہ وہ بنگلہ دیش کی بجائے واپس پاکستان میں جانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کو تنگ کیا جاتا ہے۔

اللہ کافروں اور ان کے حامیوں کو نیست و نابود کرے۔ آمین۔ ظہور صاحب ہم میں شامل ہو چکے ہیں اور آج کل میری کمپنی میں ہیں اور اس وقت میرے ساتھ بیٹھے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں۔

میری طرف سے گھر کے سب افراد کو سلام عرض کرنا۔ شہر چلنے کا اتفاق ہو تو بھٹی صاحب اور ان کے اہل خانہ۔ بھائی صاحب عنایت اور ان کے اہل خانہ کو سلام عرض کریں۔

اسلام اور ملک کے لئے دعا کرتے رہا کریں۔

والسلام
اکرم ملک

۲۸۶

مشرقی پاکستان

۲۶-۷-۷۱

ڈیر اصغر صاحب

السلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ یادآوری کا شکریہ امید ہے کہ میرا خط آپ کو پہنچ چکا ہوگا۔ آج کل خط راستہ میں کچھ ضرورت سے زیادہ وقت لیتے ہیں۔ اس لئے آپ کو شک گزرا کہ شاید ہم کو آپ یاد نہیں۔ مصروفیت تو گو ہے لیکن کبھی کبھی خط لکھنے کا موڈ بن جاتا ہے۔

یہاں کی کیا گپ شپ ہے۔ اور جو ہے آپ ریڈیو سے سنتے رہتے ہیں۔ مہاجر کافی تعداد میں واپس آرہے ہیں اور ملک کے حالات دن بدن سدھر رہے ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے اور حالات ٹھیک ہوجائیں اور کافروں کا ستیاناس ہو۔

سامان کی خبر پڑھی۔ اگر آسان اور مناسب ہو تو سامان جہلم بھجوادیں۔ ورنہ وہاں ہی رہنے دیں۔ ایک ہی بات ہے۔ جس جگہ آپ کے لئے مناسب ہو ویسے ہی کر دیں۔

مشتاق ابھی تک کوئٹہ میں ہے۔ بلکہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ کیونکہ سامان تو اس نے بھجوایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ جلد ہی ہم میں شامل ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی ترقی بھی عمل میں آجائے گی۔ ظہور میاں اپنے ساتھ ہیں اور میری کمپنی میں ہیں۔ خیریت سے ہیں۔ اور سلام عرض کرتے ہیں۔

باقی سب خیریت ہے۔ ہم سب کے لئے دعا کرتے رہا کریں۔

گھر میں سب کو سلام عرض کریں۔

والسلام

اکرم ملک

نوٹ:۔ آپ کا خط کل موصول ہوا۔ اور آج جواب لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ شکایت نہ ہو گی۔

۷۸۶

مشرقی پاکستان

۲-۸-۷۱

ڈیر اصغر سلامت رہو

السلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ خیریت کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ گھر اور منگلا سے برابر خیریت کی خبر ملتی رہتی ہے۔ حفیظ کے خط ملتے رہتے ہیں۔ کوشش کے باوجود ابھی تک اس سے بات چیت نہیں ہو سکی۔ افضل ابھی تک یہاں نہیں پہنچا ہے۔ اس کی تبدیلی میں دکھ کی کوئی بات نہیں ہے۔ حالات اللہ تعالیٰ کے کرم سے اچھے ہیں۔ اور پھر حالات خراب ہوں بھی تو کیا ہے۔ ہمارا کام ہی قوم اور ملک کی حفاظت کرنا ہے۔

ملک کے حالات دن بدن اچھے ہو رہے ہیں۔ بیرون ملک بھی لوگوں کی رائے بدل رہی ہے اور اب غیر ممالک پہلے کی طرح ہندوستان کی حمایت نہیں کر رہے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ انشاء اللہ فتح ہمیشہ اسلام کی ہو گی۔ کیونکہ ہم حق اور سچائی کی حفاظت کر رہے ہیں۔

برادرم عبدالقیوم کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ اس نے (شارٹ کورس) کے لئے درخواست دی ہے۔ اور سنٹر لاہور ہے۔ لاہور میں ہمارے پرانے کرنل اب (کرنل ایڈمن ۴ کور) کی ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔ کرنل صاحب کا نام عبدالقادر ہے ان سے ملاقات کرنا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارے یونٹ کے ایک میجر صاحب رحیم شاہ لاہور میں (جی۔ ٹو) کی ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔ کافی اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ ممکن ہے مددگار ثابت ہو۔ ان دونوں افسران کو میں

خط لکھ رہا ہوں۔ اللہ مدد کرے گا اور قیوم صاحب کو کامیابی نصیب ہو۔

صدر مملکت کا انٹرویو ریڈیو پر سنا ہے بس لطف آگیا۔

باقی سب خیریت ہے۔

میری طرف سے سب کو سلام عرض کریں۔

والسلام

اکرم ملک

۷۸۶

مشرقی پاکستان

۹-۹-۷۱

بخدمت جناب بھائی صاحب

السلام علیکم!

آپ کا تحریر کردہ خط ملا۔ خیریت کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے باخیریت ہیں۔ یہاں کے حالات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی قسم کا اندیشہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث مبارکہ ارسال کرنے کا شکریہ۔ فوج کی تربیت بھی اسی حدیث کے مطابق ہوتی ہے۔ ہمیں جو سکھلائی دی جاتی ہے۔ اس میں اپنی حفاظت کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ لاپرواہی غفلت وغیرہ میں اپنی اور اپنے جوانوں کی جان کو خطرے میں ڈالنا نالائقی ہے۔ ہم لوگ اس وقت ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جبکہ ہم اپنی حفاظت کرتے ہوئے دشمن کو ختم کر سکیں۔ اگر ہم خود ہی لاپرواہی کی وجہ سے دشمن کی گولی کا نشانہ بن جائیں تو یہ بہادری نہ ہوگی۔ البتہ ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ آدمی کو اپنی جان کی بازی لگا کر بھی ملک اور قوم کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے آپ میرے بارے میں کسی قسم کا فکر اندیشہ نہ کریں۔

اللہ ہمارا حامی و ناصر ہے۔ البتہ آپ ہم سب کے لئے دعا کرتے رہیں۔ ابھی تک برادرم حفیظ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ خیال ہے کہ جلد ہی اس سے ملاقات کروں گا۔ انشاء اللہ برادرم افضل کی ابھی تک خبر نہیں ہے۔ امید ہے چٹا گانگ پہنچ گیا ہو گا۔ امید ہے اس سے بھی ملاقات کر سکوں گا۔

میری طرف سے آپا جان کو سلام اور آداب بچوں کو پیار۔

والسلام
اکرم ملک

نوٹ:۔ مسرت پروین کی کامیابی کا سن کر بہت خوشی ہوئی۔ میری طرف سے مسرت اور آپ سب کو مبارکباد ہو۔

میجر اکرم کس طرح جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ اس کی ایک جھلک دیکھئے۔ لکھتے ہیں۔

اسلام اور وطن کی خاطر قربان ہونا ہمارا فرض ہے۔ شہادت کس کے حصے میں آتی ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

"ہمارے جوان خوش ہیں کہ وہ وطن کا دفاع کرنے آئے ہوئے ہیں۔ سبھی کے چہروں پر رونق ہے۔ آخر کیوں نہ ہو، ہمارا تو ایمان ہی یہ ہے کفار سے جہاد تو ہماری زندگی کا اولین شیوہ ہے۔"

پنڈی میں اپنے ایک دوست کو لکھا۔

"ہم اسلام اور وطن کی حدود کا دفاع کرتے کیلئے تیار ہیں۔ میری یونٹ اسلام کے جذبے اور روشنی سے معمور ہے اور ہم اس مقدس مقصد کے لئے جانیں قربان کر دینے کیلئے تیار ہیں۔"

اسی سلسلہ میں والدہ کو لکھا۔

"آپ کے تین بیٹے فوج میں شامل ہو کر قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کو اس بات پر فخر کرنا چاہیئے۔ آپ فکر نہ کریں اور خدا سے دعا کریں کہ ہمارے دل میں وطن پاک کی محبت سلامت

رکھے۔"

اسلام اور پاکستان یہ دو محبتیں اکرم کی زندگی میں جاری و ساری تھیں۔ پاکستان کی محبت میں ڈوبا ہوا یہ خط دیکھئے جو انہوں نے ۱۵ اگست ۷۱ء کو اپنے بھتیجے محمد اصغر کو لکھا۔

۱۵-۸-۷۱

ڈیر اصغر سلامت رہو

السلام علیکم!

آپ کا خط ملا خیریت کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور آپ لوگوں کی دعاؤں کی بدولت بخیریت ہیں۔ کل یوم آزادی تھا ہم لوگوں نے ہندوستانی آبادی سے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس خوشی کے موقعہ پر ضرورت سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ اور ہماری کوششوں سے یہ تقریب بہت پراثر اور کامیاب رہی۔

جیسے کہ آپ کو معلوم ہے ہم ایک ایسے شہر میں بستے ہیں جو کہ آدھا ہندوستان میں ہے اور آدھا پاکستان ہیں۔ سرحد کے ایک دم قریب ہونے کی وجہ سے اور ہندوستان سے کشیدگی کے باعث اس شہر میں ان دنوں آبادی نہیں ہے۔ البتہ کل کا دن ٹھیک طرح سے منانے اور ہندوستانیوں کو یہ واضح کرنے کے لئے کہ سرحد کے اس پار مسلمان بستے ہیں اور یہ کہ وہ پاکستان سے محبت کرتے ہیں ہم لوگوں نے ایک بہت بڑے جلسے اور جلوس کا اہتمام کیا۔ جلسہ اور جلوس دونوں بہت کامیاب رہے۔ اس تقریب سے جہاں عوام میں خود اعتمادی اور اپنی افواج پر بھروسہ پیدا ہوا۔ وہاں ہندو، عوام کا جوش و خروش دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے۔ دہشت زدہ کیوں نہ ہوتے۔ ان سے بیس گز کے فاصلے پر ہزاروں افراد پر مشتمل ہجوم جوش و خروش سے اسلام اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتا گزر رہا تھا۔ پورا شہر نعرہ تکبیر کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ اور عوام میں ایسا جوش و خروش تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب کے وہ ہندو کی ذہنیت کو پہچان گئے ہیں۔ اور اب وہ مکمل طور پر اس سے انتقام لینے کیلئے تیار ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ اس تقریب کی وجہ سے عوام کو ہمیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ فوجی جوانوں کے جوش و خروش سے بے حد متاثر ہوتے۔ عوام میں اپنے آپ، پاک فوج اور اسلام پر اعتماد ہوتا معلوم ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی سرحد کے پار کھڑے ہندوؤں پر خوف اور دہشت طاری ہوگئی اور ان کو معلوم ہوگیا کہ مشرقی پاکستان کے عوام پاکستان چاہتے ہیں یا "بنگلہ دیش" چاہتے ہیں اور یہ کہ پاکستان ہمیشہ قائم رہے گا اور انشاءاللہ دن بدن ترقی کی منازل طے کرے گا۔

باقی سب خیریت ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہم کو ثابت قدم رکھے اور اسلام اور پاکستان کی حفاظت کرے۔

ظہور میرے ساتھ ہے اور آپ کو سلام عرض کرتا ہے۔ میری طرف سے سب کو سلام عرض کریں۔

والسلام

اکرم ملک

میجر اکرم ۱۱ اکتوبر ۷۱ء کے خط میں اپنے بڑے بھائی صوبیدار عبدالرشید کو لکھتے ہیں۔

"اسلام اور ملک کی بہتری کیلئے دعا کرتے رہا کریں۔ پاک فوج کے سب جوانوں کی سلامتی کے لئے دعا کرتے رہیں"

۱۱ نومبر ۷۱ء کے خط میں پھر اپنے اس یقین کا اعادہ کیا۔

سرحد کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فوجوں کی کارروائیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے ہر دفعہ دشمن کو منہ کی کھانی پڑ رہی ہے۔ ہم سب اپنے فرض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کو تیار کھڑے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے اللہ تعالیٰ اسلام کی حفاظت کرے گا۔ اور کفر اسلام کے مقابلہ میں کبھی بھی کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ آئندہ بھی اگر دشمن نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو اسے عبرتناک شکست ہوگی۔ انشاء اللہ۔

۱۳ نومبر ۷۱ء میجر اکرم نے اپنے بھتیجے اصغر ملک کو بھی یہی لکھا۔

"سرحد کے ساتھ ساتھ بھارتی فوج کی کارروائیوں کی وجہ سے جنگ کی سی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ دشمن کی ہر کارروائی ناکام ہوئی ہے۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اسلام اور پاکستان کی حفاظت کے لئے ہر وقت چاک و چوبند تیار بیٹھے ہیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ کفر کبھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فتح انشاء اللہ مجاہدین اسلام کی ہوگی آمین۔

میجر اکرم جس جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف تھے اس کی صداقت پر انہیں پورا پورا یقین تھا۔ اصغر ملک ہی کو ایک اور خط میں لکھا۔

"(ہمارے دشمنوں) کو یہ معلوم ہے کہ وہ مسلمان مجاہدین سے کبھی جنگ نہیں جیت سکتے کیونکہ مسلمان اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے جام شہادت پینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ اسلام کا بول بالا ہو اور پاکستان کی سالمیت برقرار رہے۔"

ان خطوں سے اکرم کے حیرت انگیز اعتماد کی غمازی ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ انہیں حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں تھا۔ لیکن جو اعتماد انہیں مشن پر اور اپنے ایمان پر تھا۔ اس نے انہیں پرجوش اور پُرامید بنا دیا تھا۔ اس آخری خط کے یہ فقرے قابل غور ہیں۔

ہم سب اپنے فرض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کو تیار کھڑے ہیں۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کی حفاظت کرے گا۔ اور کفر اسلام کے مقابلہ میں کبھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ آئندہ بھی اگر دشمن نے ہم پر حملہ کرنے کی غلطی کی تو اسے عبرتناک شکست ہوگی۔ انشاء اللہ

کوئی ہے جو شیر بنے؟

یہ اسی سچے جذبے اور پکے ایمان کا نتیجہ تھا کہ میجر اکرم نے ۴ دسمبر کی شب کو اپنے سگنل

محمد مانک سے کہا۔

کوئی ہے جو کل شیر بنے؟

اور پھر خود ہی شیر بننے کا تاریخ ساز فیصلہ کیا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل ہم نے آگے چل کر محمد مانک کے انٹرویو میں دی ہے۔

معرکہ ہلی کا ایک ماہرانہ جائزہ

نومبر ۱۷۱ء میں ہلی کے مقام پر جو تاریخی لڑائی اور میجر اکرم شہید نشان حیدر جس کے ہیرو بن کے ابھرے تھے وہ اس طویل اور کھلی جنگ کا ایک حصہ تھی جو پورے مشرقی پاکستان میں لڑی جا رہی تھی۔ اور خود یہ ہلی کا معرکہ بھی ان معرکوں سے مربوط تھا۔ جس میں باونجا یعنی ۴ ایف ایف آر کی پوری پلٹن بر سر پیکار تھی۔ اس لئے مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ہلی کے معرکے کے پورے پس منظر اور پیش منظر کا جائزہ لیا جائے تاکہ سارے حقائق سامنے آجائیں۔ اور اکرم شہید کے ساتھ ساتھ ان کی پلٹن کے تمام ان غازیوں اور شہیدوں کو بھی خراج تحسین ادا کیا جا سکے جو اس اجتماعی تگ و تاز میں برابر کے شریک تھے۔

یہ جائزہ ۴ ایف ایف کے ایک ممتاز افسر لفٹیننٹ کرنل آصف ہارون کے ایک تحقیقی مضمون پر مبنی ہے۔ کرنل ہارون کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ہی میجر اکرم کے شہید ہونے کے بعد ان کی سی "کمپنی" کی کمان سنبھالی۔ اور دشمن کی شدید گولہ باری کے دوران انتہائی پُرخطر حالات میں حوالدار امیر نواز کے ساتھ شہید کی لاش دشمن کے نرغے سے نکالی۔ اور اسے تدفین کے لئے بحفاظت بریگیڈ ہیڈکوارٹر بوگرہ میں پہنچوایا۔

معرکہ ہلی کا پس منظر

ہلی کے علاقے کی حیثیت ایک شہ رگ کی سی تھی۔ مشرقی پاکستان کے شمال میں جتنی

فوج تھی۔ اس کی سپلائی لائن یہیں سے گزرتی تھی۔ دشمن کا واضح منصوبہ تھا کہ ھلی پر قبضہ کر کے شمال میں تمام پاکستانی فوجوں کی دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی سپلائی لائن کی شہ رگ کاٹ کر ان کو علیحدہ علیحدہ آسانی سے تباہ کر دیا جائے۔ مشرقی پاکستان میں دشمن کے سیاسی و فوجی منصوبوں کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر تھا کہ جلد از جلد ھلی گھوڑا گھاٹ، گائبندا محاذ پر کامیابی حاصل کی جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دشمن نے جو اہتمام کیا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

نمبر۲۰ پہاڑی ڈویژن

نمبر۳۴۰ بریگیڈ گروپ

نمبر ۶۵ کیولری جس میں پٹین ۷۶ ٹینک شامل تھے۔

نمبر ۶۹ بکتر بند رجمنٹ۔ جس میں ٹی ۵۵ ٹینک تھے۔

ایک ڈویژن کا توپ خانہ

ضروری ہوائی جہازوں کی کمک۔

اس نفری اور ساز و سامان کے ساتھ دشمن اس محاذ پر جلد کامیابی کیلئے اپنے پنجے تیز کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہماری نفری اور ہتھیاروں کی تفصیل یہ ہے۔

صرف ایک بٹالین ۴ ایف ایف آر

ایک کمپنی ریکی اینڈ سپورٹ

ایک فیلڈ رجمنٹ کی بیٹری کا توپ خانہ

ھلی پر متوقع حملے کے پیش نظر ۴ ایف ایف آر کو جو بہیش پور کے علاقے میں متعین تھی ۲۱ نومبر ۷۲ء کو حکم دیا گیا کہ وہ لڑائی کے لئے آگے بڑھے۔

اس محاذ پر پلٹن کی مورچہ بندی اس طرح ہوئی۔

ڈی کمپنی ھلی کا علاقہ

سی کمپنی ہجور کئی کا علاقہ

سی اور ڈی کمپنی کو چھوڑ کر باقی بٹالین۔ مہیش پور کا علاقہ

۴ ایف ایف آر کی ذمہ داری کا دائرہ کار اس طرح متعین کیا گیا۔

ا پنی ذمہ داری کے علاقے کیلئے سرحد سے قریب سے قریب دفاعی مورچہ بندی کی جائے۔

حکم ملتے ہی ایک کمپنی کو اضافی ذمہ داری کیلئے علیحدہ کرنے کیلئے تیار رکھنا۔

پہلا ٹکراؤ

۲۲ نومبر کی شام کو سورج ڈھلتے ہی دشمن کے ڈویژن کی قوت کے توپ خانے نے بھاری گولہ باری شروع کر دی۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تمام رات یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ اس علاقے میں دشمن کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ طاقتور جارحانہ حملے کی بڑی خوفناک تمہید تھی۔ چنانچہ ۲۲ اور ۲۳ نومبر ۷۱ء کی رات کو قریب ایک بجے دشمن نے وہ بڑا حملہ شروع کر دیا جس کی وہ ایک عرصے سے تیاری کر رہا تھا۔ اور جس کی ابتداء توپ خانے کی گولہ باری سے شام ہی سے ہو چکی تھی۔ دشمن کو نفری، ہتھیار، اور موقع محل سب امور کی برتری حاصل تھی۔ اس حملے کا رخ ہلی کے محاذ پر اس مقام کی طرف تھا جہاں میجر (اب لیفٹننٹ کرنل) جولین پیٹر کی ڈی کمپنی مورچہ بند تھی۔ اور حملے کا براہِ راست نشانہ ڈی کمپنی کی دائیں طرف سے سب سے اگلی پلاٹون تھی جو سیکنڈ لیفٹننٹ (اب میجر) محمد سلیم خان ستارۂ جرأت کے زیر کمان تھی۔ لیفٹیننٹ سلیم کی پلاٹون نے اس پوری بٹالین سے کئے گئے حملے بڑے حوصلے اور عزم سے پسپا کر دیئے۔ کچھ دیر کے بعد قریب ڈیڑھ بجے دشمن نے ایک اور حملہ ایک بٹالین اور دوسری امدادی قوتوں سے شروع کیا یہ حملہ شدید تر تھا اور بڑے جوش سے کیا گیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں آگ اور خون کے اس کھیل کی تندی میں ہر لمحے اضافہ ہو رہا تھا۔ ڈی کمپنی کی یہ پلاٹون گویا آگ کے بھنور میں پھنسی ہوئی تھی اس کے باوجود ان جوان مردوں نے اوسان نہیں کھوتے حوصلہ نہیں ہارا۔

اور مزاحمت جاری رکھی یہ وہ نازک لمحہ تھا جب وہ بہادروں کا بہادر حوالدار عیسف خان شہید (تمغہ جرأت) اپنی سیکشن کو لیکر دشمن پر بجلی بن کر گرا جو اس وقت تک پلاٹون پوزیشن کو گھیرے میں لینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس شیر نے دشمن کے چھکے چھڑا دیئے اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن دست بدست لڑائی میں دشمن پر سنگین سے حملہ کرتے ہوئے وہ خود شہید ہو گیا۔ زندہ باد حوالدار عیسف خان۔ اس جانباز کی جرأت اور ڈی کمپنی کی اس پلاٹون کے حوصلے سے دشمن کے حملے کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ان جوانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ان کے نعرے گولہ باری کے دھماکوں میں بھی تقریباً ایک ہزار گز سے سنے جا سکتے تھے۔ بٹالین کی قوت کا دشمن نے اپنا تیسرا حملہ صبح ساڑھے چھ بجے شروع کیا۔ لیکن اس پرعزم پلاٹون نے اس بار بھی دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے اور وہ اپنا مقصد بر لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ۲۲ نومبر کو صبح سویرے ڈی کمپنی کے ایک پلاٹون کمانڈر (اب میجر) مشتاق احمد کو ۲ جوانوں کے ساتھ سیکنڈ لیفٹیننٹ سلیم کی پلاٹون کی تقویت اور امداد کے لئے بھیجا گیا۔ جب مشتاق اس پلاٹون کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ دشمن کی تقریباً ایک کمپنی سلیم کی پلاٹون کے قریب ہی مورچے کھودنے میں مصروف ہے۔ یہ دیکھتے ہی کیپٹن مشتاق نے پورے جوش و خروش حملہ داغ دیا۔ اور اپنے ۲۰ جوانوں کی مدد سے انہوں نے دشمن کو بری طرح پسپا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ دشمن کے ۴۰ آدمی کھیت رہے لیکن اس تگ و تاز میں مشتاق خود بھی سخت زخمی ہوئے اور پلاٹون کمانڈر سلیم بھی زخمی ہو گئے۔ اس ٹکراؤ میں فریقین کے نقصان کا گوشوارہ یہ ہے۔

دشمن کے زخمی و ہلاک ۳۰۰ آدمی جن میں ۳ کمپنی کمانڈرز ۲ کمپنی آفیسرز اور ۵ جے۔ سی۔ او شامل تھے۔

ٹی ٹینک تباہ ۵۵ ناکارہ ۲۰

نوٹ: دشمن کے ہلاک شدگان کی لاشوں کے انبار اور تباہ شدہ ٹینک یو۔ این۔ او کے ممبروں کو ۲۷ نومبر کو دکھلائے گئے تھے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہندوستان جارحیت کا ارتکاب

کر رہا ہے۔ اس ٹکراؤ میں اپنا یہ نقصان ہوا۔

شہید جوان :- ۱۱

زخمی :- ۱۲ جن میں دو افسر بھی شامل تھے۔

دشمن کا جوابی حملہ

حسن کے مقام پر پیش رفت میں ناکامی پر دشمن نے ناؤ پارا گاؤں پر قبضہ کر لیا مقصد یہ تھا کہ اس گاؤں کو بنیاد بنا کے ڈی کمپنی پر دائیں بازو سے حملہ کیا جائے۔

۲۵۔ نومبر کو دشمن نے بڑا چنگرام دیہات کی طرف پیش قدمی شروع کی اور شام تک ان دیہات پر قبضہ جما لیا۔ اس طرح ڈی کمپنی کی ایک پلاٹون خطرے میں پڑ گئی۔ اور دشمن کے اس ارادے کا اظہار بھی ہوا کہ وہ ھلی۔ بولدار، گھوڑا گھاٹ کی پوری پٹی کے ساتھ ساتھ حملہ کرنا چاہتا ہے دشمن کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگر دشمن کو اپنے ارادے میں کامیاب ہونے دیا جاتا تو اس کے نتائج یہ ہوتے۔

دشمن ھلی پر ڈی کمپنی کو بٹالین سے کاٹ دیتا۔ یا اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا۔

دشمن مبشن پور میں متعین بٹالین کو بھی چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا اور اس طرح بریگیڈ کمانڈر کو وقت سے پہلے مزید دستے میدان میں جھونکنے پڑتے۔

دوسے زیادہ محاذ کھول کر کمزور محاذ کی طرف سے اپنی زیادہ نفری کی بنا پر گانی ہندا کی طرف تیزی سے بڑھ جاتا۔ ان حالات کے پیش نظر بریگیڈ کمانڈر نے ۲۰ر نومبر کو نارو بارا اور اسکے ملحقہ دیہات پر فوری حملے کا حکم دیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ۴ ایف ایف کی اے اور سی کمپنی کو نامزد کیا گیا۔ سی کمپنی چرکوئی کے مقام پر پندرہ میل کے فاصلہ پر تھی۔ اسے وہاں سے لانا تھا۔ ۲۵ر نومبر کی شام کو ساڑھے چار بجے تک سی کمپنی کی طرف دو پلاٹون بولدار پہنچ سکیں حملے کا نقشہ یہ تھا۔

حملے کا نقشہ یہ تھا۔

کمانڈر۔ میجر اب لفٹیننٹ کرنل محمد اقبال

حملہ آور دستہ اے کمپنی۔ سی کمپنی ایک پلاٹون کے ساتھ

تحفظ کا دستہ، سی کمپنی کی دوسری پلاٹون

حملے کا مقصود

جوابی حملہ کرنا اور بڑا چنگرام اور ناؤپارا کے آس پاس کے دیہات پر دوبارہ قبضہ کرنا

جوابی حملہ شروع ہوتا ہے

اگرچہ صبح ہو چکی تھی۔ دن چڑھ آیا تھا۔ ایسے میں جوابی حملہ کرنا خودکشی کے مترادف تھا اس کے باوجود حملہ داغ دیا گیا۔ حملہ کی جگہ کے قریب ہی پلٹن کے کمانڈنگ افسر لفٹیننٹ کرنل اب (بریگیڈیر) محمد اخلاق عباسی، بیٹری کمانڈر میجر انوار کے ساتھ اپنے بنکر میں موجود تھے۔ حملہ منصوبے کے مطابق بروئے کار لایا گیا اور اے کمپنی نے بڑی ہوشیاری اور جرأت سے بڑا جنگرام کے اردگرد کے دیہات پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ لیکن منصوبے کے مطابق ناؤپارا پر قبضہ کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ایسا نہ ہو سکنے کی وجوہ یہ تھیں۔

ناؤپارا پر دشمن بڑی مضبوطی سے مورچہ بند تھا۔ اور اس کے دفاع کے لئے ایک ٹینک اسکواڈرن موجود تھا۔

ناؤپارا کی طرف اس وقت پیش قدمی کی گئی جب دن بڑھ چکا تھا۔ اور اس طرح دشمن کو ہمارے حملہ آور دستوں کو اپنے توپ خانے، ٹینکوں اور مشین گنوں سے تاک تاک کے نشانہ بنانے کا موقعہ مل گیا۔

دشمن کو نفری اور ہتھیار دونوں کی غیر معمولی برتری حاصل تھی۔

توپ خانے کی مدد ناکافی اور ہوائی تحفظ بالکل میسر نہیں تھا۔ اور کوئی بکتر بند دستہ بھی

مدد کے لئے موجود نہیں تھا۔

ناؤ پارا پر اے کمپنی کے حملے کو پسپا کرنے کے بعد دشمن اپنی کثیر انفنٹری اور بکتر بند دستوں کے بل پر اے کمپنی کو ناؤ پارا کے دیہات کی پوزیشن سے بھی خارج کرنے میں کامیاب ہو گیا اس کشمکش میں اے کمپنی نے کافی نقصان اٹھایا۔ دس جوان شہید ہوتے اور بیس زخمی ہوئے زخمیوں میں کمپنی کمانڈر بھی شامل تھے۔ اور بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر اور بیٹری کمانڈر بھی دشمن کی گولہ باری سے زخمی ہونے سے نہ بچ سکے۔

اس ناکامی کے بعد اے کمپنی کو واپس بلا کے تاسی مائز کے علاقے میں دفاعی مورچے سنبھالنے کو کہا گیا۔ جبکہ سی کمپنی کو اپنی پرانی جگہ چورگئی جانے کا حکم ملا۔ تاکہ دشمن چورگئی نواب گنج کے علاقے کی طرف پیش قدمی کا سدباب کیا جاسکے۔

کمان کی تبدیلی

۱۶ اپریل ۷۱ء تک ۴ ایف ایف کی کمان لفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) محمد ممتاز ملک ایس جے کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہ لفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) محمد اخلاق عباسی ایس جے کو چارج دے کر اسٹیشن کمانڈر کے ہیڈ کوارٹرز ڈھاکہ میں جی ایس او ون آئی کی حیثیت سے چلے گئے۔ اب جو انہیں پلٹن کے کمانڈنگ افسر کے زخمی ہونے اور ہسپتال میں داخل ہونے کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ پلٹن کی کمان اپنے ہاتھ میں لیں۔ چنانچہ ۲۷ نومبر ۷۱ء کو انہوں نے پلٹن کی کمان سنبھالی اور ۷ دسمبر تک پلٹن کو کمان کرتے رہے جب تک کہ کرنل عباسی نے دوبارہ اپنی جگہ نہیں لے لی۔ پلٹن کے ان دو کمانڈروں نے بہت نازک لمحات میں پلٹن کی کمان کی وہ ہر مرحلے میں اپنے دستوں کے ساتھ نہیں ان کے آگے آگے ہوتے تھے۔ اور اپنی جرأت اور بے خوفی سے سب کے حوصلے بڑھاتے تھے۔ توپ خانے کی شدید گولہ باری اور ہوائی حملوں کی مار کے دوران بھی انہوں نے کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہایت

سکون کے ساتھ ضروری فیصلے کرتے رہے اور پلٹن کی راہنمائی کرتے رہے اب دو توں ستارۂ جرأت کے حامل ہیں۔

بڑا چنگرام پر جوابی حملہ

ایف ایف آر کی بی کمپنی جو کیپٹن (اب میجر) حلیم کی زیر کمان تھی بولدار میں تھی۔ اس کو بڑا چنگرام پر دوبارہ قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ حملہ ۲۹ اور ۳۰ نومبر کی درمیانی شب کو کیا گیا۔ اور بڑا کامیاب رہا۔ بی کمپنی نے اس علاقے پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء اور یکم دسمبر ۷۱ء کی درمیانی رات کو بوئی گرام اور عید گاہ کی پوسٹیں بھی دشمن سے لے لی گئیں۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ دشمن کا بہت سا اسلحہ بارود بھی مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگا۔ اس طرح ۴ ایف ایف آر کے زیر دفاع علاقے کی وہ تمام پوسٹیں جو دشمن کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ اس سے چھین لی گئیں۔ ماسوائے اس پلاٹون پوزیشن کے جو ڈی کمپنی کے دائیں رُخ پر ریلوے لائن کے اس طرف ھلی کے مقام پر تھی۔

پلٹن کی نئی تنظیم (ری ڈیپلائے منٹ)

۳۰ نومبر کو دشمن ایک بٹالین اور ایک ٹینک اسکواڈرن کے ساتھ دنگا پارا ریلوے اسٹیشن کی طرف آگے بڑھا۔ اور راتے باغ کے مقام پر مورچہ بند ہو گیا۔ دشمن کی اس جنگی چال کا مقصد یہ تھا کہ ہماری ھلی کی پوزیشن کو دائیں طرف سے خطرے میں ڈالا جائے اور چورکئی گھوڑا گھاٹ تک پہنچنے کا راستہ صاف کیا جائے۔

اس نئی صورت حال اور خطرے کے پیش نظر ۴ ایف ایف کو لڑائی کیلئے نئے سرے سے منظم کیا گیا۔ اور اس کو مندرجہ ذیل مقاصد دیئے گئے۔

میجر آصف ہارون کی قیادت میں اے کمپنی تلسی ماٹر کے ساتھ دفاعی مورچہ بندی کرے۔

اور ناڈ پارا پر حملہ کرنے کیلئے تیار رہے - اور بی اور سی کمپنیوں کی پوزیشنوں پر جوابی حملہ کرنے کیلئے بھی تیار رہے اگر دشمن ان علاقوں میں کچھ پیش قدمی کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

بڑا چنگرام دیہات کے علاقے میں بی کمپنی دفاعی مورچہ بندی کرے۔

میجر محمد اکرم شہید (نشان حیدر) کی سی کمپنی کو چرکوئی کے علاقے سے آگے بڑھ کر راتے باغ تک کا علاقہ دشمن سے پاک کر کے دشمن کو اس کے علاقے میں دھکیلنا تھا۔

میجر محمد اکرم شہید کی کمپنی کے مہم کے مقاصد یہ تھے۔

بی اور ڈی کمپنی کے سامنے ریلوے لائن پر دشمن کی جو پوسٹ تھی اسے تباہ کیا جائے اور اس پر قبضہ کیا جائے۔

ھلی کے مقام پر دشمن کو اس کے علاقے میں دھکیلنا

ھلی گاؤں کے وسط سے جو نالہ گزرتا ہے وہ ایک طرح کی قدرتی رکاوٹ تھا۔ میجر اکرم شہید نشان حیدر کی کمپنی کے ذمے ایک ٹاسک یہ بھی تھا کہ اس نالے کے ساتھ دفاعی مورچہ بندی کریں۔ تاکہ بٹالین کی دفاعی پوزیشن بحیثیت مجموعی بہتر ہو جائے۔

میجر اکرم کی سی کمپنی کے سپرد یہ اہم چیلنج بھی تھا کہ دشمن پر بازو سے اور عقب سے دباؤ ڈالیں۔ اور اس طرح اس کو تین طرف سے گھیر کر ھلی کے بالمقابل اس کے دفاعی مورچوں کو تباہ کریں۔

میجر (اب لفٹیننٹ کرنل) جیولین پیٹر کے زیر کمان ڈی کمپنی کو ھلی کے محاذ پر اپنی ذمہ داری کے علاقے کا دفاع کرتے رہنا تھا۔

میجر اکرم شہید نشان حیدر کی کمپنی کے کارہائے نمایاں

ایف ایف آر کی سی کمپنی نے میجر اکرم کی ولولہ انگیز قیادت میں میدان جنگ کا پانسہ

ہی پلٹ دیا۔

نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

"سی" کمپنی بپھرے ہوئے شیروں کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑی اور دوسری دسمبر کی رات کو رائے باغ تک علاقہ دشمن سے خالی کرالیا۔ اس کے بعد بھی دشمن پر حملہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء تک سی کمپنی دشمن کو اسکے علاقے میں اندر دھکیلنے میں کامیاب ہوگئی۔ دشمن پر اس طرح بازو اور عقب سے رننگ رینگ کر لیپ فراگنگ کے طریقے سے گھیرا ڈالنے میں جرأت کے علاوہ بے حد ذہانت کی ضرورت بھی تھی اور یہ چیلنج میجر اکرم نے کمال کامیابی سے پورا کیا۔ میجر اکرم کی اس کلاسیکی تک دناز کے نتیجے میں ان کی کمپنی کی تین پلاٹونوں نے رائے باغ اور ہلی نالے کے درمیان تقریباً چار ہزار گز دفاعی مورچہ بندی کرلی۔ اس طرح کہ ہلی کا نالہ ان کے مغرب میں تھا۔ یہی مقصود و مطلوب تھا۔ جس کے لئے اتنی جدوجہد کی گئی تھی۔ اور جس پر بٹالین کی سلامتی اور کارکردگی کا بڑی حد تک انحصار تھا۔

دشمن کا ردِعمل

میجر اکرم کی "سی" کمپنی کی کامیاب جنگی چال سے ہلی میں دشمن کی پوزیشن کو بائیں طرف سے اور عقب سے شدید خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ یہ چوٹ کھا کر دشمن نے تلملا کر بھرپور حملہ کیا دشمن کو ہتھیاروں اور آدمیوں کی برتری شروع سے حاصل تھی۔ اب اس نے زخمی سانپ کی طرح پلٹ کر پوری قوت سے اور تمام ذرائع سے اس کمپنی پر بھرپور حملے شروع کردیئے حملے آگ کی طوفانی موجوں کی شکل میں آرہے تھے۔ یکے بعد دیگرے اور ہر بار حملے کی شدت بڑھتی جارہی تھی۔ ان سب حملوں کا خاص طور پر نشانہ بائیں طرف کی اگلی پلاٹون تھی جو صوبیدار گل محمد شہید کے زیر کمان تھی اور اسی پلاٹون کے ساتھ کمپنی کمانڈر میجر اکرم بھی تھے دشمن نے اس پلاٹون کی پوزیشن پر ۴ اور ۵ دسمبر کی رات ۵ دسمبر کی صبح کو چار بار حملہ کیا۔ لیکن

بے سود پلاٹون سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی تھی۔ دشمن کی ہر طرح کی برتری کے باوجود اس پلاٹون کے جوانوں اور افسروں کا حوصلہ بلند ہی نہیں بہت بلند تھا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے دشمن کو پاس نہ آنے دیا۔ بلکہ اس کے کئی ٹینکوں کو تباہ کر ڈالا۔ اور اس کو سخت جانی نقصان پہنچایا۔ پلاٹون کمانڈر صوبیدار گل محمد شہید اور کمپنی آفیسر سیکنڈ لفٹیننٹ (اب کیپٹن) ترمذی دونوں نے خوب خوب داد شجاعت دی۔ جوانوں کی دلیری اور ہمت کا بھی جواب نہیں تھا۔ لیکن اس تگ وتاز عزم وثبات کا پیکر میجر محمد اکرم تھے جو اپنی مخصوص پُر وقار آواز میں احکام جاری کر رہے تھے۔ ان کی آواز میں جو اعتماد اور جو ولولہ تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ یہ شخص میدان کارزار کا دھنی ہے۔ اور اس کا قلب ایمانی ایقان سے روشن ہے۔ میجر اکرم کو دیکھ کر ان کے انداز سے ان کے تیور سے سارے مجاہدوں کے حوصلے بھی بلند تھے۔

دشمن کا صبح سویرے کا حملہ پسپا تو ہو گیا تھا۔ لیکن دشمن کا توپ خانہ اور ٹینک برابر آگ اگل رہے تھے۔ صورت حال تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان ٹینکوں ان آگ کے اژدھوں سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔

اس موقعہ پر ہر قسم کی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کے اور لڑنے کے ہر کتابی اصول کو نظر انداز کر کے میجر اکرم نے وہ کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جو ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ جان پر کھیل کر نہیں بلکہ جان کو نثار کر کے مورچے سے باہر نکلے ایک سپاہی کو ساتھ لیا ایک ۴۰ ایم ایم چائنا راکٹ لانچر لے کر دشمن کی طرف چلے۔ گولوں کے گرد وغبار کے کور میں وہ خاصے آگے چلے گئے اور دشمن کے ٹینکوں کے عین سامنے سو گز کے فاصلے پر سے لانچر سے پوزیشن لی اور یکے بعد دیگرے تین ٹینکوں کو ڈھیر کر دیا۔ دشمن نے ایسا دشمن کاہے کو دیکھا ہو گا۔ جو سامنے آ کر فائر کرے۔ بہر حال جو ہونا تھا وہی ہوا۔ دشمن کے ایک ٹینک کی براؤننگ کا براہ راست فائر ہوا۔ اکرم کی دائیں آنکھ سے خون کا ایک فوارہ نکلا۔ وہ سر کے بل گرے اور پھر کبھی نہ اٹھے۔

صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

اس معرکے میں کمپنی کمانڈر میجر اکرم شہید ہوئے۔ اور کمپنی افسر لفٹیننٹ ترمذی اور سنیئر جے۔ سی اور صوبیدار محمد دین بھی زخمی ہو چکے تھے۔ ۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کی دوپہر کو سی کمپنی کی کمان میجر، (اب لفٹیننٹ کرنل) آصف ہارون نے سنبھالی۔ ہلی کی اس پوسٹ پر ناکام ہو کر ۴ دسمبر کو دشمن چرکوئی کی طرف پھر گیا تھا۔ چرکوئی پر قبضہ کر کے دشمن نے جنوب کی طرف بوتی پور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پیش قدمی شروع کی اور ۵ دسمبر کی رات دس بجے تک سی کمپنی کو پیچھے سے آلیا سہ پہر سے رات تک آصف ہارون نے مقابلہ جاری رکھا تھا۔ اب صورت حال قابو سے باہر ہو چکی تھی اور سی کمپنی کی پوزیشن ناقابل دفاع ہو چکی تھی ایک بجے رات انہیں پیچھے ہٹنے کا حکم ملا۔ پوزیشن چھوڑنے سے پہلے وہ بمشکل اکرم شہید کی لاش کو میدان کارزار سے واپس لاسکے۔

شہید کی لاش کی بازیابی

میجر اکرم اور ان کا سپاہی لعل محمد اپنے انتہائی اگلے مورچوں سے کوئی بیس تیس گز کے فاصلے پر شہید ہوئے تھے۔ ان دونوں جانبازوں کی لاشوں کو تین مرحلوں میں انتہائی خطرناک اور مشکل حالات میں واگزار کیا گیا۔ پہلا مرحلہ جائے شہادت سے کمپنی کے ٹیک ہیڈ کوارٹر تک لانے کا تھا۔ دوسرے مرحلے میں لاشوں کو کمپنی ٹیک ہیڈ کوارٹر سے چنگ گرام گاؤں بی کمپنی کی دائیں اور آگے والی پلاٹون تک لایا گیا۔ یہاں سے دونوں لاشوں کو بٹالین ہیڈ کوارٹر بلدار میں بھیجا گیا۔ وہاں سے دوسرے روز سہ پہر بوگرہ میں دفن کے لئے منتقل کیا گیا واگزاری سے تدفین تک کے مرحلوں میں جن لوگوں نے براہ راست حصہ لیا ۴ ایف ایف آر اور ۲۱ ایف ایف آر کے تعاون سے ہم ان لوگوں سے براہ راست گفتگو لے سکے۔ انکے بیانات کو ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل آصف ہارون نے کہا۔

میجر اکرم ۵ دسمبر کی صبح نو دس بجے شہید ہوتے تھے۔ مجھے دن کے بارہ ایک بجے حکم ملا کہ میں جا کر میجر شہید کی کمپنی کی کمان سنبھالوں۔ کمپنی کی کمان سنبھالنے کے بعد میرے سامنے ایک اہم جذباتی مسئلہ یہ تھا کہ ھلی کے شہید ہیرو کی لاش کس طرح دشمن کے نرغے سے واگزار کی جائے عجیب حسرت ناک صورت تھی۔ کہ شہید کی لاش ہماری اگلی خندقوں سے صرف بیس گز کے فاصلے پر ہماری آنکھوں کے سامنے پڑی تھی۔ اس طرح کہ ۴۰ ایم ایم کا راکٹ لانچر ابھی شہید کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن دشمن جو ٹھیک سامنے تقریباً ایک سو پچاس گز کے فاصلے پر صف آرا تھا۔ اور اس کے ٹینک اور مشین گنیں برابر آگ اگل رہی تھیں شدید ترین گولہ باری جاری تھی۔ ہر طرف دھماکے دھواں اور آگ، یہ منظر تھا۔ خندقوں سے سر بھی نکالنا محال تھا۔ کوئی ذرا بھی نظر آتا دشمن اس پر چھوٹے ہتھیاروں کا براہِ راست فائر کھول دیتا تھا۔ اسی طرح دن گزر گیا۔ شام ہوئی رات آ گئی۔ لیکن صورت حال نہیں بدلی دشمن کی گولہ باری میں کوئی کمی نہیں آئی۔

۵ دسمبر کی وہ رات بھی اندھیری رات نہیں تھی۔ اچھی خاصی تیز چاندنی تھی کہ چلتا پھرتا آدمی صاف نظر آ جاتا۔ اس رات تقریباً ایک بجے مجھے پیچھے آ جانے کا حکم ملا۔ اب میری مشکل یہ تھی کہ احکام کی بجا آوری بھی ضروری تھی اور شہید کی لاش کو دشمن کے رحم و کرم پر بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اور دشمن کے حملے اسی طرح جاری تھے۔ بہر حال مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اور جلد کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ شہید کے جسد خاکی کو ہر قیمت پر واپس لانا ہے۔ شہید قوم اور یونٹ کی عزت کا سوال تھا۔

میں نے لانس حوالدار امیر نواز اور سپاہی یار دل کو ہر قیمت پر شہید کی لاش کی بازیابی کا حکم دیا۔ دونوں نے رینگ رینگ کے آگے بڑھنا شروع کیا۔ حوالدار امیر نواز یار دل سے ذرا آگے تھا۔ دونوں ایک نالے کی آڑ میں آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن نالہ اتنا اتھلا تھا کہ وہ اس

میں حرکت کرتے ہوئے نظر آ سکتے تھے۔ جونہی وہ جائے مقصود کے قریب پہنچے ایک عجیب بات ہوئی کہ دشمن کا فائر معجزاتی طور پر یکایک بند ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے فضا میں مکمل سناٹا چھا گیا۔ چاند بھی قدرے دھندلا گیا۔ یہ عمل اس طرح ہوا جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو چاندنی رات تھی۔ دشمن ہم کو دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لاش کے قریب پہنچ کر حوالدار امیر نواز سر و قد سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی دلیری سے شہید کی لاش کو اٹھایا اور اپنی پیٹھ پر ڈال لیا۔ یہ عمل دشمن کے ٹھیک سامنے ہوا۔ لیکن تنکا بھی نہیں ہلا۔ ہر طرف مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہوا کی سرسراہٹ بھی بند سی ہو گئی تھی۔ اس دوران میں یاردل بھی امیر نواز کے پاس پہنچ گیا اور یکے بعد دیگرے شہیدوں کی لاشیں ٹیک ہیڈ کوارٹر تک لائے شہید کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا لیکن خاصا بھاری تھا۔ جوں ہی ہم شدید خطرے کی لکیر سے ادھر آئے۔ دشمن کی گولہ باری پھر اسی تندی سے شروع ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جو طلسم باندھا گیا تھا ٹوٹ گیا اور پھر وہی خوفناک دھماکے، آگ کے گولے پھٹنے شروع ہو گئے۔

اس معمے کو میں آج تک حل نہیں کر سکا۔ اگر گولہ باری بر وقت بند نہ ہو جاتی۔ بلکہ مکمل طور پر معطل نہ ہو جاتی اور دشمن یوں اندھا نہ ہو جاتا تو اکرم شہید کی لاش کو واپس لانا۔ بہت ہی دشوار بلکہ ناممکن ہوتا۔

اس طرح کے حیرت انگیز معجزاتی واقعات کتابوں میں پڑھے تھے۔ لیکن یہ کرامت میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ شدید خطرہ کی لکیر کے بعد لاش کو دو آدمیوں نے چنگ گرام میں بی کمپنی تک پہنچایا۔ وہاں سے ۶ دسمبر کی صبح سورج نکلنے سے پہلے لاش کو بولدار کے مقام پر پہنچایا گیا۔ یہاں سے پکی سڑک مل گئی اور لاش کو جیپ میں ڈال کر دفن کے لئے بوگرہ بھیج دیا گیا۔

نائیک یاردل اس ڈرامے کے مرکزی کردار تھے۔ چنانچہ ہم نے نائیک موصوف سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ جس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایف ایف آر میں بھی ایک سے

ایک شیر پڑا تھا۔

نائیک یاردل کا انٹرویو

سوال :۔ یاردل آپ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ شدید خطرات کے باوجود اکرم شہید نشان حیدر کی لاش میدان جنگ سے پیٹھ پر اٹھا کر لائے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم آپ سے اس کی تفصیلات پوچھیں یہ بتایئے کہ آپ ۵ ر دسمبر ۷۱ء کی صبح کو جب اکرم شہید ہوئے کہاں تھے؟ اور کیا کر رہے تھے؟

جواب :۔ میں اس وقت سپاہی تھا اور میجر اکرم صاحب کی سی کمپنی کی ایک ٹینک شکن ۱۰۶ آر آر گن کا کمانڈر تھا۔ اور میری گن اسی پلاٹون کے دفاع میں تھی جہاں میجر صاحب کا ٹیک ہیڈ کوارٹر تھا۔ اسی پلاٹون کے اگلے موروچوں کے سامنے وہ شہید ہوئے۔

سوال :۔ شہادت کا وقت کیا تھا؟

جواب :۔ صبح نو دس بجے کا وقت تھا۔

سوال :۔ پھر کیا ہوا؟

جواب :۔ میجر اکرم کی شہادت کے بعد ان کے کمپنی افسر لفٹیننٹ (اب میجر) ترمذی نے کمان سنبھالی۔ گھنٹے آدھ گھنٹے بعد وہ اور ان کے جے۔ سی او صوبیدار محمد دین بھی زخمی ہو گئے۔ اور انہیں بھی پیچھے بھیج دیا گیا۔ تو ان کی جگہ ہماری سی کمپنی کے کمانڈر میجر (اب لفٹیننٹ کرنل) آصف ہارون مقرر کئے گئے۔ وہ اس وقت گھرے دفاع میں لگی الفا کمپنی کو کمان کر رہے تھے۔ آصف ہارون صاحب تقریباً چار بجے شام ہماری پوزیشن پر آئے اس وقت میں اسی پلاٹون کے ہیڈ کوارٹر میں تھا۔ جس کے آگے اکرم شہید ہوئے تھے صبح سے اب تک یہ سارا علاقہ دشمن کے شدید حملے کی زد میں تھا۔ سر اٹھانا مشکل تھا۔ ہم سب چاہتے تھے کہ ہم اپنے عظیم کمپنی کمانڈر کی لاش تو کسی نہ کسی طرح دشمن کے

جنگل سے نکال کے لائیں۔ اکرم صاحب اتنے بڑے اور اتنے محبوب کمانڈر تھے کہ ان کے لئے کمپنی کا ہر ایک سپاہی جان پر کھیلنے کو تیار تھا۔ رات تقریباً سات بجے کے قریب آصف ہارون صاحب نے مجھے اور امیر نواز کو حکم دیا۔ تم لوگ جاؤ۔ اور میجر اکرم کی لاش کو اٹھا لاؤ۔ گو رات کا وقت تھا۔ پھر بھی ہم بہت آہستہ آہستہ اور بہت احتیاط سے آگے بڑھے دشمن بہت قریب تھا اور ذرا سی بے احتیاطی سے ہمارا کام بگڑ سکتا تھا۔ بہر حال ہم خاموشی سے اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں شہید کی لاش پڑی تھی۔

سوال:۔ لاش اگلے مورچے سے کتنے فاصلے پر تھی؟

جواب:۔ کوئی سو قدم۔

سوال:۔ لاش کس حالت میں تھی؟

جواب:۔ میجر صاحب کی توپ کی ٹوپی پرے پڑی تھی سر ننگا تھا۔ قریب ہی لانچر پڑا تھا ان کے ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ سر کا رخ دشمن کی طرف تھا۔ ہاتھ گھنٹوں ٹھنڈ میں پھیلے پھیلے ذرا سخت ہو گئے تھے۔ یہ بہت عجیب لمحہ تھا۔ اپنے شیر دل مجاہد کو یوں پڑے دیکھ کر میرے دل کی عجیب حالت ہوئی۔ بہر حال یہ وقت سوچنے یا رونے کا نہیں تھا۔ ہم دونوں آگے بڑھے نائیک امیر نواز نے میری مدد کی اور میں نے لاش کو پیٹھ پر اٹھا لیا۔ ان کی اسٹین گن اور ٹوپی امیر نواز نے اٹھا لی میں نے اپنی اسٹین بھی اسی کے حوالے کی جس طرح ہم گئے تھے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں میجر آصف ہارون بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے میجر اکرم صاحب کی لاش کو اتار کر وہیں رکھا اور پھر وہیں واپس چلے۔

سوال:۔ کیوں؟

جواب:۔ کیونکہ جب ہم وہاں پہنچے تھے تو میجر اکرم صاحب کے قریب ہی سپاہی لعل محمد کی لاش پڑی تھی وہ بھی ان کے ساتھ ہی شہید ہوا تھا کہ اس کی لاش کو واپس لانا بھی ہمارا

فرض تھا۔ اس بار امیر نواز نے لاش کو کندھے پر اٹھایا۔ اور میں نے اسے کندھوں پر اٹھانے میں مدد دی اور اس کی اسٹین میں نے پکڑ لی اس طرح ہم نے لعل محمد شہید کی لاش کو بھی وہاں لاکر رکھ دیا۔ جس جگہ میجر صاحب کی لاش رکھی تھی۔

میجر اکرم شہید اور سپاہی لعل محمد کی بازیابی کے دوسرے مرحلے میں نائیک نواب خان نے (جواب ۲۱ ایف ایف میں ہیں) اہم کردار ادا کیا ان کی یادداشتوں کے چند اوراق نقل کئے جاتے ہیں۔

یہ واقع پانچ دسمبر کا ہے۔ آپ صبح ساڑھے نو بجے کے قریب اپنی کمپنی کی بائیں اور آگے والی پلاٹون میں سب سے آگے والے مورچے میں شہید ہوئے اس وقت آپ کو وہاں سے نکالنا بہت دشوار تھا۔ کیونکہ یہ مورچہ دشمن کے بالکل قریب اور ایک اندازے کے مطابق کوئی چالیس پچاس گز دور تھا۔ یہ فاصلہ اس لئے کم نہ تھا کہ اس علاقے میں گھنا جنگل اور بانس کے درخت تھے اور دن کے وقت بھی اس سے زیادہ فاصلے پر کچھ نظر نہ آتا تھا اور دشمن اس بات سے واقف تھا کہ میجر محمد اکرم (نشان حیدر) شہید ہو چکے ہیں۔ اور ان کو نکالنے کے لئے ہماری فوج کچھ نہ کچھ ضرور کوشش کرے گی اور ایسا کیا بھی گیا۔ لیکن دشمن چوکنا تھا اس نے لاش کو روشنی کے سبب نہ اٹھانے دیا۔ آخر جب رات کو اندھیرا ہو گیا اور اس اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میجر آصف ہارون صاحب جو گرائی والی الفا کمپنی سے میجر محمد اکرم شہید کی جگہ آئے تھے۔ نائیک یار دل اور نائیک امیر نواز کو لاش اٹھا کر لانے کا حکم دیا۔ کیونکہ ان دونوں نے وہ مورچہ دیکھا ہوا تھا اور وہ ہی اٹھا کر لا سکتے تھے خاصی رات گئے یہ دونوں گئے قریب یہ دونوں گئے اور لاش کو اٹھا کر لے آئے۔ آپ چونکہ ہماری پوزیشن کا عقبی حصہ اپنی یونٹ سے کٹ چکا تھا۔ اور بھارتی ٹینک ہمارے عقب سے کراس کر چکے تھے ہماری کمپنی کا وہاں رہنا فضول ہو چکا تھا۔ لیکن دشمن کی بزدلی بیان کرتا میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری فوج کی اتنی کم تعداد کے باوجود وہ

میجر اکرم کی سی کمپنی کی دفاعی پوزیشن میں آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ بلکہ ہمارے بالکل سامنے دشمن خاموش ہو چکا تھا۔ ایک دفعہ اس خاموشی کی وجہ سے میں نے میجر آصف ہارون صاحب کو مشورہ بھی دیا کم از کم ہمیں کچھ فری برسٹ فائر کرنے چاہئیں۔ تاکہ دشمن کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ہماری پوزیشن خالی ہے۔ اور میجر آصف ہارون صاحب نے یہ درخواست بڑے غور سے سنی اور مجھے حکم دیا کہ تم بائیں جانب تھوڑا آگے اور میں بائیں تھوڑا آگے جا کر دونوں فائر کرتے ہیں۔ اس طرح ہم وقفوں میں فائر کرتے رہے۔ لیکن ہمیں بٹالین ہیڈ کوارٹر سے پوزیشن چھوڑنے کا کوئی حکم نہ ملا تھا۔ اور نہ ہی میجر آصف ہارون صاحب حکم کے بغیر پوزیشن چھوڑنا چاہتے تھے۔ آخر رات تقریباً ساڑھے بارہ پونے ایک بجے کے قریب میجر آصف ہارون صاحب کو لفٹیننٹ کرنل محمد اخلاق عباسی صاحب کی طرف سے سگنل موصول ہوا کہ آپ میجر محمد اکرم (نشان حیدر) شہید کی لاش ساتھ لاؤ اور پوزیشن سے تقریباً ایک کلومیٹر بائیں جانب چنگ گرام میں بی کمپنی کی ایک آگے والی پلاٹون جس کی کمانڈ نائب صوبیدار اللہ دتہ صاحب کر رہے تھے کے پاس جاؤ اور اس علاقہ میں گاؤں بوٹی گرام میں کمپنی کو دفاعی پوزیشن میں لگاؤ۔ اب میجر آصف ہارون صاحب نے صوبیدار محمد دین جو سی کمپنی کے ایس جے سی اور تھے سے مشورہ کیا کہ کیا طریقہ کار کیا جائے اور اس بات پر متفق ہوئے کہ سب سے پہلے وہ فالتو ہتھیار نکالے جائیں جو جوان شہید ہو چکے ہیں کیونکہ ہتھیاروں کی کمی یہاں پورا ہونا مشکل تھی۔ کیونکہ ہماری (لائن آف کمیونیکیشن ختم ہو چکی تھی) اور دوسری مرتبہ اسی پوزیشن میں آکر میجر صاحب کی لاش اٹھائی جائے۔ اس لاش کے ساتھ۔ سپاہی لعل محمد سگنل پلاٹون کے سپاہی کی لاش بھی پڑی تھی جو اسی پوزیشن پر شہید ہوا تھا۔ اٹھائی جائے چنانچہ ہم نے سب فالتو ہتھیار جن میں کچھ دو انچ دھانے کی مارٹر اور میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کی سٹین گن شامل تھی اٹھا لئے اور تقریباً اڑھائی بجے کے قریب نائب صوبیدار اللہ دتہ صاحب کی پلاٹون سے جا ملے اب میجر آصف ہارون صاحب باقی ماندہ کمپنی کو

اکٹھی کرنے میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے مجھے اور سپاہی محمد مانک اور سپاہی محمد انور کو حکم دیا کہ جاؤ اور میجر صاحب کی لاش اٹھا لاؤ۔ اور ساتھ ہی صوبیدار دین خان کی پلاٹون بھی وہاں موجود ہو گی کو گائیڈ کر کے لاؤ۔ میری درخواست پر ہمیں سٹریچر بھی دیا گیا۔ اور ساتھ ہی تین بنگالی بھی ہمارے ساتھ رضاکارانہ طور پر تیار ہو گئے۔ ان تین بنگالیوں میں ایک تقریباً بارہ سال کا لڑکا ایک تقریباً تیس سال کا نوجوان اور ایک کوئی ساٹھ برس کا سفید داڑھی والا بوڑھا تھا۔ ہم تقریباً پونے تین بجے رات جنگ گرام سے ڈنگہ پاڑہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اب راستے میں میری بات چیت اس بوڑھے بنگالی سے ہوتی رہی اور میں نے دل میں یہ محسوس کیا اس بات کا نچوڑ یہ تھا کہ وہ بوڑھا شخص کسی بھی صورت میں مشرقی پاکستان کو دشمن کے نرغے میں نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جنگ کی صورت حال سے مشرقی پاکستان کی سلامتی کو خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اور ایک دو مرتبہ تو وہ بزرگ بنگالی جو کٹر قسم کا مسلمان تھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور مجھے کچھ اس طرح سے مخاطب ہوا کہ شاب ہم جو کچھ بھی پاکستان کی خاطر آپ کی مدد کر سکے ضرور کریں گے۔ یہاں تک کہ ہمیں اگر جان کی بھی بازی لگانی پڑی تو لگا دیں گے اور ساتھ ہی اس نوجوان بنگالی اور بچے نے بھی اسی عزم کا اعادہ کیا۔ اس بات سے یہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے خالص بنگالی مسلمان کسی بھی صورت میں پاکستان سے علیحدگی نہ چاہتے تھے۔ اس کی ایک اور مثال میں یہاں دینے سے گریز نہیں کروں گا۔ جب مورخہ ۱۱ دسمبر کو ہماری بٹالین کو ہلی کے محاذ سے ہٹ کر بوگرا شہر کا دفاع کرنے کا حکم ملا۔ جو کوئی ساٹھ میل کے لگ بھگ دور تھا۔ ہم اپنے یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کے حکم پر رات سات بجے کے قریب بل دارا گاؤں سے بوگرا کی جانب پیدل روانہ ہو گئے۔ یہ سفر رات کی تاریکی اور ان دیکھا راستہ تھا اور نہایت کٹھن تھا اور جوان جو کئی دنوں سے دشمن کے خلاف بے جگری سے لڑ رہے تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے۔ بلا جھجک اپنے کمانڈروں کے ہمراہ چل پڑے۔ لیکن ان کے چہروں پر تھکاوٹ یا خوف کے کوئی اثرات

محسوس تک نہ ہو رہے تھے ان کے حوصلے بلند اور بالکل تازہ دم محسوس ہو رہے تھے۔ یہ پچیس تیس میل کا کٹھن سفر کرنے کے بعد ہم لال کھیت کے قریب واقع ایک گاؤں کدوا میں صبح سات بجے کے قریب پہنچے۔ اب میجر آصف ہارون نے محسوس کیا کہ کچھ آرام کیا جائے اور تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ جوان بھوکے بھی تھے۔ کیونکہ رات کا کھانا بھی جوانوں نے نہ کھایا تھا اور اگر کچھ کھایا تو وہ بھی اپنے طور پر۔ کیونکہ راشن کی سپلائی بند ہو چکی تھی لہٰذا انہوں نے اسی گاؤں کے قریب درختوں میں کمپنی کو آرام کے لئے حکم دیا جونہی کدوا گاؤں کے لوگوں نے پاک فوج کو دیکھا وہ بے حد خوش ہوئے انہوں نے بڑے پرتپاک طریقے سے ہماری آؤ بھگت کی جو غالباً مغربی پاکستان کے لوگوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ ہم تقریباً دو گھنٹے اس گاؤں میں ٹھہرے رہے۔ اس دوران میں میجر آصف ہارون کے قریب تھا اسی گاؤں کا ایک تقریباً ساٹھ ستر سالہ بوڑھا بنگالی ہمارے نزدیک آیا وہ نہایت کٹر قسم کا مسلمان تھا اور سفید لمبی لمبی داڑھی تھی، اس نے ہمیں بتایا کہ اس گاؤں میں سب مسلمان ہیں اور سب پاکستان کے حامی ہیں۔ اس لئے ہمیں مکتی باہنی اور انڈین آرمی کی طرف سے پیغام موصول ہوا ہے کہ ہم اس گاؤں پر بمباری کریں گے۔ میجر صاحب نے بڑے اچھے طریقے سے اس کی حوصلہ افزائی کی اور پوری پوری مدد کا یقین دلایا۔ اسی دوران گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے، نوجوان، اور بوڑھے سب اپنے اپنے گھروں سے جو بھی اس وقت ان کے پاس تھا۔ ہمارے جوانوں کے لئے لے آئے یہاں تک کہ گڑ چاول کی پھولیاں وغیرہ بھی تھیں اور چاول اور ترکاری بھی۔ سچ پوچھیں تو میں اس وقت ان سے اتنا متاثر ہوا کہ میں ان چھوٹے پیارے پیارے بچوں کو پیسے دینے پر رضامند ہو گیا۔ جو میرا اخلاقی فرض تھا۔ جیسے ہم اپنے بچوں کو خوش کرنے کیلئے کرتے ہیں لیکن افسوس اس وقت میرے پاس صرف ڈیڑھ روپیہ تھا میں دل کھول کر بچوں کو کچھ نہ دے سکتا تھا۔ صرف میں نے پچاس پیسے جو ریزگاری کی شکل میں تھے بچوں میں تقسیم کر دیئے اس اثنا میں گاؤں کے معزز لوگ بھی آ گئے اور انہوں نے ہمیں سب جوانوں

کے لئے کھانا تیار کرنے کی پیش کش کی اور ایک بیل ذبح کرنے کیلئے درخواست کی۔لیکن ہم اس وقت زیادہ عرصہ رُکنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ہمیں اپنی یونٹ سے ملنے اور مزید نئے احکامات حاصل کرنے کی خواہش تھی۔تاکہ ہمارا قومی مشن پورا ہوسکے۔ہم لوگوں نے معذرت چاہی اور بڑی مشکل سے کدوا گاؤں کے لوگوں سے جانے کی اجازت لی۔اور آخر میں وہ سفید داڑھی والا بوڑھا بنگالی جو پاکستان اور اسلام کی خاطر ہماری مدد کو تیار تھا۔ہمیں راستہ دکھانے کی غرض سے کوئی دو میل ہمارے ساتھ پیدل چلا۔اور بڑی مشکل سے ہم نے اسے اپنے گاؤں بھیجا۔اس قصہ کو ہوئے اب کوئی آٹھ برس گزر چکے ہیں۔لیکن وہ منظر میرے دل سے نہیں جاتا۔جو کدوا گاؤں کے لوگوں نے ہماری عزت اور حوصلہ افزائی کی۔میری دلی دعا ہے کہ اس گاؤں کے لوگوں پر اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم کی بارش برسائے۔بہر حال بات کہیں دور نکل گئی۔جس کا ذکر کئے بغیر میرا قلم نہ رہ سکا۔اب میں چلتا ہوں اصل مقصد کی طرف ہماری یہ چھوٹی سی جماعت جب ڈنگہ باڑہ کے قریب ریلوے لائن کے نزدیک پہنچی تو رات بڑی تاریک تھی۔دشمن کا خطرہ سر پہ منڈلا رہا تھا۔لیکن ہمارے عزائم کسی بھی صورت میں فرض سے کوتاہی نہیں کرنے دے رہے تھے ہم اس مقام پر پہنچے جہاں میجر محمد اکرم نشان حیدر اور سپاہی لعل محمد زمین پر پڑے تھے۔وہ بنگالی مسلمان ہمارے کہنے پر بڑھے۔اور سپاہی لعل محمد شہید کو اٹھا لیا ان کا اٹھانے کا انداز کچھ اس طرح سے تھا۔جیسے مغربی پاکستان میں عام طور پر وزنی گندم یا آٹے وغیرہ کی بوری بازوؤں اور کندھوں پر دو آدمی اٹھاتے ہیں۔وہ بنگالی تو تازہ دم تھے فوراً اٹھایا اور تیز تیز واپس چنگرام چل دیئے۔سپاہی انور بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔لیکن میں اور سپاہی محمد مالک بمعہ سٹریچر کے رہ گئے۔ہم نے آگے بڑھ کر میجر محمد اکرم شہید (نشان حیدر) کو سٹریچر پر ڈالا اور اٹھا لیا۔ہمارے اٹھانے کا انداز کچھ اس طرح سے تھا کہ دونوں نے سٹریچر ہاتھوں میں پکڑا ہوا آگے پیچھے کی شکل میں تھے۔ہم نے کافی کوشش کی کہ کندھوں پر اٹھا لیا جائے۔لیکن بناوٹ کے لحاظ سے سٹریچر ایسا اٹھانا ممکن نہ تھا۔سٹریچر ہاتھ ہی میں تھامنا پڑا۔یہ طریقہ ہمارے لئے بڑا مشکل تھا۔

میں بھی تھکا ہوا تھا لیکن سپاہی محمد مانک کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی وہ پچھلے کئی دنوں سے اسی پوزیشن پر بے آرامی کی حالت میں تھا اور اس کو نیند کافی تنگ کر رہی تھی بہرحال ایسے وقت میں آرام کہاں نصیب ہوتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے ڈنگر باڑہ سے چنگ گرام کی طرف بڑھتے رہے۔ آخر ہم کوئی پونے چار بجے کے قریب اپنی منزل مقصود پر پہنچے وہاں نائب صوبیدار اللہ دتہ ہمارے انتظار میں تھے۔ انہوں نے تازہ دم جوان ہمارے ساتھ روانہ کئے اور ہم سیدھے بلدار گاؤں پہنچے جہاں ہماری بی کمپنی کا ہیڈ کوارٹر تھا اور ہماری سی کمپنی کو بھی اکٹھا ہونے کے لئے یہ ہی آر۔ وی مقرر تھی۔ اس کے بعد میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کی لاش کو بوگرا کے لئے روانہ کیا گیا۔ اور ہم اپنی کمپنی کی دفاعی پوزیشن پر چلے گئے اور نئے عزم کے ساتھ محو جنگ ہو گئے۔

تجہیز و تدفین

میجر اکرم کی تدفین کی کارروائی میں ایف ایف آر کے صوبیدار ہیڈ کلرک محمد صدیق اور اے ای سی کے صوبیدار میجر محمد اعظم علوی نے بہ نفس نفیس حصہ لیا۔ ان دونوں کے بیانات اور تاثرات پیش کئے جاتے ہیں۔

صوبیدار محمد صدیق لکھتے ہیں۔

میں ان دنوں بٹالین کے ہیڈ کوارٹر بوگرہ میں تھا۔ ایجوکیشن جے سی او اعظم علوی صاحب بھی ہمارے ساتھ ہی تھے کہ ہمیں اطلاع ملی کہ میجر اکرم شہید کو دفنانے کے لئے بوگرہ لایا جا رہا ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سہ پہر کے وقت ان کی میت تابوت میں بند ریئر ہیڈ کوارٹر میں لائی گئی۔ شہید کی نماز جنازہ یونٹ کے نائب خطیب نے پڑھائی۔ مجھے یاد ہے کہ شہید کا تابوت ریلوے سلیپرز سے بنایا گیا تھا۔

بٹالین ہیڈ کوارٹر کی گارڈ جس میں چند جوان ۴ ایف ایف کے تھے اور ریئر ہیڈ کوارٹر

کے تمام افرادِ آپ کی زیارت کیلئے بے تاب تھے۔ لہذا تابوت کھول کر انہیں زیارت کرائی گئی۔ زخم آپ کی ایک آنکھ پر تھا۔ لیکن گولی چونکہ آنکھ پر لگ کر سر میں سے پار ہوئی تھی۔ لہذا زخم آنکھ پر کم سر پر زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بعد قبر کی کھدائی کا کام شروع ہوا۔ قبر بوگرہ ڈھاکہ روڈ پر بوگرہ شہر کے فائر بریگیڈ کے بالمقابل والے قبرستان میں کھودی گئی۔ اس عظیم کام کی سعادت درج ذیل لوگوں کو نصیب ہوئی۔

لانس حوالدار مہدی خان ۴ ایف ایف۔ لانس نائیک محمد امین ۴ ایف ایف، لانس نائیک فضل احمد ۴ ایف ایف، سپاہی دھمن خان ۴ ایف ایف، سپاہی شوکت علی ۴ ایف ایف ۲۰۷ انفنٹری ورکشاپ کمپنی اور ای ایم ای کے کچھ جوان۔ لاش مبارک کو قبر میں اتارنے کی سعادت درج ذیل کو نصیب ہوئی۔ صوبیدار محمد اعظم۔ اے۔ ای۔ سی۔ حوالدار (اب نائب صوبیدار) کلرک محمد صدیق۔ لانس نائیک محمد امین اور چند دوسرے افراد قبر میں تابوت رکھنے کے بعد اوپر بانس کے لمبے لمبے ڈنڈے جوڑ کر چکنی مٹی سے لیپ دیا گیا۔

تدفین کے سلسلے میں صوبیدار محمد اعظم علوی صاحب لکھتے ہیں

ہمارا بریگیڈ ہیڈکوارٹر بوگرہ میں تھا۔ ان دنوں اکا دکا جوان شہید تو ہوتے ہی رہتے تھے ہم نے بوگرہ کے وسیع قبرستان میں جو بوگرہ فائر بریگیڈ اسٹیشن کے بالکل سامنے تھا ایک قطعہ اراضی شہیدوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ قبرستان کے ساتھ ہی ایک ٹیکنیکل کالج کی عمارت میں، ایک ہسپتال قائم کر دیا تھا۔ دسمبر ۷۱ء کی شروع تاریخوں میں وہاں تین افسر زیر علاج تھے ۴ ایف ایف آر کے کمانڈنگ افسر لفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) محمد اخلاق عباسی اور میجر جولین پیٹر ایف ایف آر اور کیپٹن ساجد اسماعیل۔

۷؍ دسمبر کی دوپہر دو ڈھائی بجے ہمیں اطلاع ملی کہ میجر اکرم اور ایک سپاہی کو تدفین کے لئے لایا جا رہا ہے۔ میں عباسی صاحب کے پاس گیا انہیں اطلاع دی کہ یہ فون آیا ہے۔ انہوں

نے کہا دفن کا انتظام کریں۔ ایک روز پہلے میں نے ۴ ایف ایف کے ایک اور انتہائی دلیر سردار صوبیدار گل محمد شہید تمغۂ جرأت کی تدفین کا انتظام بھی کیا تھا۔ بوگرہ کا قبرستان ذرا پست جگہ تھا۔ جہاں سیلابی پانی آجاتا تھا۔ میجر اکرم کی شخصیت کے پیش نظر ہم نے قبرستان میں ایک اونچی ٹیکری منتخب کی تاکہ قبر سیلاب کی زد سے محفوظ رہے۔ قبر کھودنے کیلئے ہم نے پانچ بہاریوں کی خدمات حاصل کیں۔ جو فاقہ زدہ اور پریشان حال وہاں گھوم رہے تھے۔ کوئی چار بجے نائیک حق نواز ٹرک میں میجر اکرم کا تابوت لے کر پہنچ گئے۔ قبریں تیار ہو چکی تھیں۔ میں دفن کی اطلاع دینے کیلئے کرنل عباسی صاحب کے پاس گیا۔ ان کو تکلیف تھی سیڑھیاں اتر کر آنا ان کے لئے مشکل تھا۔ ان کی اجازت سے میں نے تدفین شروع کی۔ تدفین کے انتظام واہتمام میں میرے ساتھ ۴ ایف ایف آر کے حوالدار کلرک محمد صدیق بھی شریک تھے۔ ہم دونوں کی بڑی خواہش تھی کہ میجر اکرم شہید کا منہ دیکھیں۔ چنانچہ ہم نے تابوت کا ایک تختہ کھلوایا۔ چہرہ اور سینہ بالکل سلامت تھا۔ صرف بائیں آنکھ میں گولی کا ایک زخم تھا۔ گولی دماغ کو چیر کے نکل گئی تھی۔ بائیں طرف گردن اور کندھے پر خون جما ہوا تھا۔

ہم نے شہید کے چہرے کو قبلہ رو کیا اور تابوت بند کر کے قبر میں اتار دیا۔ تابوت پر ٹین کی دو چادریں ڈالیں۔ چادروں پر پیڑوں کی ٹہنیاں پھیلائیں اور پھر اوپر سے مٹی ڈال دی جب ہم نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا اور ہو کا عالم میرے دل نے کہا اے ارض وطن تو سلامت رہے ہم نے کیسے کیسے چاند سورج تیرے اوپر نچھاور کئے ہیں۔

نشانِ حیدر کا فرمان

پی اے ۶۸۳۱ میجر محمد اکرم ۵؍ دسمبر کو ۴ ایف ایف آر کمپنی کی کمانڈ کر رہے تھے جو ھلی کی پوزیشن کا دفاع کر رہی تھی۔ اس جگہ کو ہندوستان کی جارحانہ منصوبہ بندی میں ایک کلیدی مقام حاصل تھا۔ اس پر قبضہ کر کے دشمن مشرقی پاکستان میں آگے بڑھنا چاہتا تھا ھلی کے عین سامنے بالر گیٹ میں متعین دشمن کے بیسویں پہاڑی ڈویژن کا پورا دباؤ اس پوزیشن پر تھا۔ جو روزانہ برابر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ دشمن نے بکتر بند دستوں اور توپ خانے کی مدد سے اس پوزیشن پر پے در پے حملے کئے۔ اس کے علاوہ دشمن نے تمام دن اس کو شدید حملوں کا نشانہ بھی بنائے رکھا۔ میجر محمد اکرم کے زیر کمان دستوں نے بڑی جرأت سے دشمن کے موج در موج حملوں کو پسپا کیا۔ اپنی پوزیشن پر مضبوطی سے جمے رہنے کیلئے میجر اکرم نے نہ صرف مثالی قائدانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا بلکہ انتہائی ناساز گار حالات میں دشمن کے شدید حملے کی زد میں ہوتے ہی انہوں نے اپنے ہتھیاروں کو بے مثال جرأت سے کام لیتے ہوئے انتہائی موثر طریقے سے استعمال کیا۔ آخر کار وہ دشمن کے ایک ٹینک کا راکٹ لانچر سے مقابلہ کرتے ہوئے ٹینک کی گولی سے شہید ہو گئے۔ ان کو شہادت کے بعد نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا۔

باب دوئم

شخصیّت و کردار

شخصیت و کردار

ایک مصور ہزار آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا ہے۔ ان لکیروں سے ایک خاکہ ابھرتا ہے پھر وہ ان میں موزوں رنگ بھرتا ہے۔ تب کہیں ایک تصویر بنتی ہے۔ کبھی وہ اصل کے مطابق ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ ہم نے اکرم شہید کی شخصیت کی تصویر بنانے اور کردار کا تجزیہ کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ خود کچھ نہیں کہا۔ کچھ وہ لوگ اور وہ افراد جو اکرم کو جانتے تھے اور خوب جانتے تھے ہم نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ ان سے باتیں کیں انٹرویو لئے اور جو کچھ انہوں نے کہا اور آنکھوں دیکھے واقعات سنائے۔ ان سے ہم نے یہ باب مرتب کیا ہے پھر ہم نے ان سے بھی کہا کہ ہمیں تاثرات کی نہیں واقعات کی ضرورت ہے۔ جس سے انہوں نے اپنے تاثرات اخذ کئے اس طرح اوراق میں اکرم کی جو تصویر ابھرتی ہے۔ وہ بہت زندہ اور تابندہ ہے۔

اکرم فرشتہ نہیں تھے۔ اگر وہ فرشتہ ہوتے تو پھر یہ کارنامے، یہ نشان حیدر کوئی کمال نہ تھا۔ ۷۰ ۔ ۱۹۶۸ء کے درمیان اصغر ملک کے نام لکھے ہوئے خطوط سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک نوجوان غیر شادی شدہ افسر کے خطوط ہیں جو جوانی کی ترنگ سے مدہوش تو نہیں لیکن واقف ضرور ہے۔ جو آواز اور صورت کے جادو سے آگاہ ہے۔ جو ہنستا بولتا ہے۔ ہنسی مذاق کرتا ہے۔ مزاح کی حس رکھتا ہے۔ وہ عام انسانی جذبات سے عاری نہیں لیکن ان سے بلند ہے۔ وہ فرشتہ نہیں انسان ہے۔ اچھا انسان ہے اس کا قلب روشن ہے اس کا ضمیر بیدار ہے۔ یہی اس کی جیت ہے۔ وہ آدمی سے انسان بنا ہے۔ اور بڑی کاوش سے بنا ہے۔ اس نے آپ کو تپھر سے ہیرا بنایا ہے اور کندن کیا ہے۔

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اکرم کی شخصیت کا تانا بانا اسلامی اور انسانی قدروں سے بنا تھا۔ اقبال کے الفاظ میں ان کے ضمیر لالہ میں چراغ آرزو روشن تھا۔ ان کی ذات کا ذرہ ذرہ شہید جستجو تھا۔ اس تمہید کے بعد ہم ان لوگوں کے انٹرویو اور تاثرات نقل کرتے ہیں جو اکرم کے ہمدم و دمساز رہے تھے یا جنہوں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا یا برتا تھا۔

۱۷ء کے معرکے کے دوران جو تین افراد تقریباً ہر وقت ان کے ساتھ رہے اور ان کی خلوت و جلوت کے رفیق تھے۔ ان میں سے ان کے بیٹ مین سجید خان کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے بعد ان کے سگنل مین محمد مانک کا نمبر آتا ہے جو ہمزاد کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس زمانے میں ان کے تیسرے ہر وقت کے ساتھی ان کی کمپنی کے سینئر جے سی او صوبیدار محمد دین تھے ان اصحاب کے انٹرویو اور تاثرات سب سے پہلے پیش کئے جاتے ہیں۔

میجر اکرم شہید کے اردلی سجید خان سے انٹرویو

آدمی کے برے بھلے کی پرکھ جتنی قریب کے آدمی کو ہوتی ہے اتنی دور کے آدمی کو نہیں۔ اس لئے بڑے آدمی کی پہچان ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اسے قریب کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ ایک فوجی افسر کو جتنا اس کا اردلی جانتا ہے اتنا کوئی اور باہر کا آدمی نہیں جانتا۔ اس لئے ہم نے میجر اکرم شہید کے اردلی کی تلاش شروع کی۔ بمشکل پتہ چلا کہ ان کے اردلی کا نام سجید خان ہے۔ اور وہ ان دنوں ۱۷ ایف ایف آر کے کمانڈنگ افسر لیفٹننٹ کرنل محمد اقبال کی اردلی میں ہے۔ چنانچہ ہم نے اقبال صاحب سے رحیم یار خان رابطہ قائم کیا۔ اور درخواست کی کہ ہمارے سوالنامے کی روشنی میں سجید خان سے انٹرویو لے کر ہمیں بھیج دیں جو کرنل اقبال کے شکریئے کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

سوال: آپ کا پورا نام کیا ہے؟

جواب:۔ سجید خان۔

سوال:۔ والد کا نام؟

جواب :۔ اردل خان۔

سوال :۔ رینک ؟

جواب :۔ جی سپاہی ہوں۔

سوال :۔ آپ کی عمر کیا ہوگی ؟

جواب :۔ کوئی ۳۴ سال۔

سوال :۔ آپ میجر محمد اکرم شہید کی اردل میں کب سے کب تک رہے ؟

جواب :۔ پہلی بار ۱۹۶۸ء سے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ایک سال۔ اس کے بعد صاحب کی پوسٹنگ ایسٹ پاکستان ہوگئی۔ ۷۰ء میں صاحب واپس یونٹ میں پوسٹ ہوئے تو مجھے دوبارہ ان کی خدمت کا موقعہ ملا۔ ۵ دسمبر ۷۱ء کو صاحب کی شہادت تک میں ان کے ساتھ تھا۔

سوال :۔ آپ کے صاحب کے روزے نماز کا کیا حال تھا؟ تہجد وغیرہ!

جواب :۔ رات کو تہجد کی نماز تو کم پڑھتے تھے۔ لیکن فجر کی نماز کیلئے بہت صبح سویرے اٹھ جایا کرتے تھے۔

سوال :۔ قرآن شریف کب پڑھتے تھے ؟

جواب :۔ قرآن شریف کی تلاوت صبح نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ باقاعدگی سے کرتے تھے۔

سوال :۔ ترجمہ سے یا بغیر ترجمے سے ؟

جواب :۔ باترجمہ۔

سوال :۔ کیا تسبیح پڑھنے کی عادت تھی ؟

جواب :۔ نہیں۔

سوال :۔ کچھ کتابیں پڑھنے کا شوق بھی تھا ؟

جواب :۔ رات کو بہت دیر سے سوتے تھے عشا کی نماز کے بعد کافی دیر تک پڑھتے رہتے تھے۔

سوال:۔ کس قسم کی کتابیں پڑھتے تھے؟

جواب:۔ میں پڑھ تو نہیں سکتا ویسے میرا خیال ہے کہ فوجی کتابیں پڑھتے تھے۔

سوال:۔ پسندیدہ لباس کیا تھا؟

جواب:۔ بنگال میں تو کبھی وردی اتاری ہی نہیں تھی۔ یہاں ڈیوٹی کے بعد شلوار قمیض پہنتے تھے

سوال:۔ کھانے پینے میں کوئی خاص پسند یا ناپسند؟

جواب:۔ صاحب، بہت کم کھاتے تھے۔ جو سامنے آجاتا کھا لیتے۔ کسی خاص کھانے کی فرمائش کبھی نہیں کی پھلوں میں البتہ مالٹے کا شوق تھا۔ سردیوں میں مالٹے بہت کھاتے تھے۔

سوال:۔ کبھی غصہ کرتے یا ناراض ہوتے ہوں گے؟

جواب:۔ میجر صاحب کو میں نے کبھی اونچی آواز سے غصہ کرتے نہیں سنا۔ مجھ پر کبھی کوئی خاص غصہ نہیں کیا۔ بندہ بشر سے غلطی ہوتی رہتی ہے ایسے موقعوں پر اکثر خاموش ہو جاتے یا پھر نرمی سے سمجھاتے تھے۔ البتہ اگر یونٹ میں کوئی غلط کام ہو تو ضرور ناراض ہوتے تھے۔

سوال:۔ ڈیوٹی کے بعد عام طور پر کس قسم کی باتیں کرتے تھے؟

جواب:۔ جنگ کے دنوں میں تو ہمت و حوصلے کی باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق بھی کرتے۔ خصوصاً جب کوئی اداس ہوتا تو ہنسانے والی باتیں کرتے تھے۔

سوال:۔ کبھی شہید ہو جانے کی بات بھی کی؟

جواب:۔ جی ہاں۔ کہا کرتے تھے ہم مسلمان ہیں ہمیں دلیر ہونا چاہیئے۔ اگر ہم شہید ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر خوش قسمتی اور کیا ہو گی۔

سوال:۔ کمپنی کے جوانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

جواب:۔ میجر صاحب، جوانوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے کھانے پینے، ہر بات کا، میرے ساتھ تو صاحب بہت اچھے تھے۔ مجھ سے بھائیوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ میرے صاحب جیسے بہادر لوگ کم ہوں گے۔ مرنا تو ہر کسی نے ہے۔ خدا ہمیں بھی شہادت کی موت دے

مجھے اپنے صاحب پر فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ اللہ لوگ تھے۔

سوال:۔ میجر اکرم شہید کو کہاں دفن کیا گیا؟

جواب:۔ بوگرہ میں۔

سوال:۔ دفن کرنے کے وقت آپ موجود تھے؟

جواب:۔ نہیں۔ میں زخمی تھا اور ہسپتال میں تھا۔

سوال:۔ اکرم شہید کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی تھی؟ کچھ علم ہے؟

جواب:۔ یونٹ کے نائب خطیب نے۔

سوال:۔ کس تاریخ کو؟

جواب:۔ ۶ر دسمبر ۷۱ء کو۔

سوال:۔ شہید کی لاش میدان جنگ سے کب برآمد ہوسکی؟

جواب:۔ ۵ر دسمبر کی صبح شہادت ہوئی تھی۔ دشمن کی فائرنگ کی وجہ سے لاش کو لانا بہت مشکل تھا۔ پورے دن اور رات لاش وہیں پڑی رہی۔ دوسرے دن صبح سویرے دن کی روشنی ہونے سے پہلے لاش لائی جاسکی۔

سوال:۔ کیا دفناتے وقت کوئی رسمی سلامی ہوئی۔

جواب:۔ نہیں۔ اس وقت ھلی میں لڑائی عروج پر تھی پوری یونٹ تو لڑ رہی تھی۔ اس لئے جوانوں کو سلامی کے لئے پچاس میل پیچھے بھیجنا ممکن نہ تھا۔

سوال:۔ شہید کو کس طرح دفن کیا گیا تھا؟

جواب:۔ وردی میں اوپر سے کمبل ڈال دیا گیا تھا۔

سوال:۔ شہادت سے پہلے کوئی خاص فقرہ یا جملہ بار بار زبان سے ادا کرتے تھے۔

جواب:۔ شہادت سے پہلے میجر صاحب کہا کرتے تھے جہاں باونجا یعنی ۴ ایف ایف ہو وہاں دشمن کا داؤ نہیں چل سکتا۔

سوال :۔ یونٹ میں وہ کس حیثیت سے مشہور تھے ؛

جواب :۔ بہت زیادہ قانونی آدمی تھے۔ ان سے جونیئر افسر انہیں عزت سے افتخار ٹی سر کہا کرتے تھے ۔

سوال :۔ کوئی اور واقعہ جو آپ کو اب تک یاد ہو ؟

جواب :۔ ہاں۔ ایک واقعہ ایسا ہے مشرقی پاکستان ہی میں لڑائی کے دنوں کی بات ہے کہ میں صاحب سے آگے جا رہا تھا۔ مجھے صاحب کی جان بہت عزیز تھی۔ بکایک وہ رُکے اور مجھ سے کہا سعید! تنخواہ میں زیادہ لیتا ہوں یا تم ؟ میں نے کہا صاحب آپ زیادہ لیتا ہے۔ کہنے لگے کہ ہم حکومت سے زیادہ پیسہ لیتا ہے۔ اس لئے مرنے کا حق بھی ہم کو پہلے ہے "

میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کے رفیق کار نائیک محمد مانک لکھتے ہیں۔

یہ کوئی فروری ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ میری پوسٹنگ ہیڈ کوارٹر کمپنی سے سی کمپنی میں ہوئی ملکی حالات کے پیش نظر مارچ ۱۹۷۱ء کو ہمیں بنگال جانے کا حکم ملا۔ میجر محمد اکرم شہید صاحب ہماری کمپنی کمانڈ کر رہے تھے۔ ڈھاکہ پہنچتے ہی مجھے اور لانس نائیک محمد پرویز کو میجر صاحب کے ساتھ سگنل مین کے طور پر بھیج دیا گیا۔ آپریشن کے دوران جہاں جہاں میجر صاحب جاتے تھے۔ ہم دونوں ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ہماری بٹالین نے میجر صاحب کو مشکل سے مشکل ٹاسک دیئے تھے۔ جانے سے پہلے موصوف نے سب جوانوں کو اکٹھا کیا اور ان کو زندہ دلی، بہادری اور ملی جذبہ سے سرشار کرنے کی باتیں بتائیں۔ تاکہ جوان گھبرا نہ جائیں۔ آپ خود ہمیشہ مسکراتے رہتے۔ اور ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ پاک فوج مکتی باہنی سے لڑ رہی تھی۔ ان دنوں عام شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ جوان لوٹ مار کرتے ہیں۔ ہر آپریشن یا چھاپہ مارنے کے بعد لوگ واپس پہنچتے تو آپ خود ان کی تلاشی لیتے تاکہ اگر کسی جوان نے کوئی چیز لوٹ لی ہو تو وہ اس سے واپس کرائی جائے اور ہر وقت خدا کے رسول کے فرمان کی روشنی میں

ایسی نصیحت کرتے کہ مسلمان کا کام لوٹ مار یا قتل و غارت گری کرنا نہیں۔ بلکہ خدا اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کے لئے دشمن کو ہمیشہ کیلئے کچل دینا ہے۔ جب کہیں نماز کا وقت آتا۔ آپ فوراً تمام کام رکوا لیتے اور لوگوں کو نماز پڑھنے کیلئے کہتے کہ "جاؤ جنہوں نے نماز پڑھنی ہے وہ نماز پڑھیں"۔ ملکی سیاست بہت خراب ہو رہی تھی۔ جولائی ۱۹۷۱ء کو ہم ھلی محاذ پر چلے گئے۔ وہاں پر ہمیں حالات کی زیادہ سنگینی کی وجہ سے دن رات بے آرام رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ مکتی باہنی نے باقاعدہ گوریلا جنگ کی صورت اختیار کی ہوئی تھی۔ وہ کبھی انڈیا کے پار جا کر خوب مسلح ہو کر رات کو ہم پر حملہ آور ہوتے کبھی پل توڑتے۔ اور کبھی اندھا دھند فائر شروع کر دیتے۔ جہاں جہاں میجر محمد اکرم صاحب ضرورت محسوس کرتے وہ خود تشریف لے جاتے۔ اور دشمن کو برباد کر کے آجاتے۔ وہ ہمارے ساتھ پوری پوری رات جاگتے رہتے اور پوسٹوں سے ٹیلی فون پر ملاپ رکھتے اور سب کو تسلی دیتے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا تھا۔ اور نومبر ۱۹۷۱ء کو ہندوستان نے اپنا بزدلانہ رویہ برقرار رکھتے ہوئے چپکے سے مکتی باہنی کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ اسی طرح پاکستان و ہندوستان کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ میجر صاحب ۸ پلاٹون کے ساتھ تھے۔ سامنے ایک گاؤں تھا۔ جس پر بڑی تعداد میں ہندوستانی فوج نے قبضہ جمایا تھا۔ ہمارے دائیں نمبر ۷ پلاٹون تھی۔ میجر صاحب کو حکم ملا کہ یہ گاؤں فوراً خالی کرائیں۔ میجر صاحب نمبر ۸ پلاٹون کو لے کر وہاں پہنچ گئے شام کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میجر صاحب نے دشمن پر حملہ بول دیا اور کامیابی حاصل کی۔ پوری رات ہم ڈیفینس کھودتے رہے۔ میجر صاحب خود ہر مورچے پر جاتے اور بریف کرتے۔ اسی طرح پوری رات گزر گئی۔ صبح صادق سے پہلے ہم نے اپنا ڈیفینس تیار کیا تھا۔ اور ہم نے پوزیشن لی ہوئی تھی۔ لیکن دشمن وہاں سے راتوں رات بھاگ گیا تھا دوپہر کے وقت میجر صاحب ۷ پلاٹون چلے گئے۔ وہ جیپ لے کر چلے گئے تھے تو کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ہم نے دشمن کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ یہ بہت بھاری حملہ تھا۔ میں نے ۱۳ ٹینک خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور پیدل فوج کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ باقی ہر طرف گرد و غبار تھا

جس سے دشمن کے بارے میں صحیح معلومات نہیں ہو سکی۔ ہم نے میجر صاحب کو فون پر دشمن کی آمد کی اطلاع دی۔ انہوں نے کہا یہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں خود پہنچ رہا ہوں۔ اور جب دشمن نزدیک سے نزدیک تر آجائے تو فائر کھول دیں۔ لیکن اندھا دھند فائر نہ کرنا۔ اتنے میں میجر صاحب خود پہنچ چکے تھے۔ اور انہوں نے سٹین گن سنبھالی اور دشمن پر برابر فائر کرتے رہے۔ اس طرح دشمن کو ۱۰۰ گز کے فاصلے پر رکنا پڑا۔ میجر صاحب پوری رات مورچوں میں پھرتے رہے اور جوانوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ پوری رات میں کئی حملے ہوتے اسی طرح میجر صاحب رات بھر نہ سو نہ سکے۔ دوسری صبح کا حملہ بہت ہی شدید تھا۔ میجر صاحب کی حالت قابل دید تھی جب بھی ٹینک فائر کرتے تھے۔ پورا علاقہ گرد و غبار سے چھپ جاتا اسی گرد میں میجر صاحب ہر مورچے پر جاتے اور اگر کوئی جوان زخمی یا شہید ہوا۔ ان کو اپنے کاندھوں پر اٹھا اٹھا کر پیچھے لاتے رہے۔

اس حملے میں ہمارا کافی نقصان ہوا۔ بہت سے جوان زخمی یا شہید ہو گئے۔ ہماری نفری بہت کم رہ گئی تھی۔ مگر پھر بھی میجر صاحب کا حوصلہ بہت بلند تھا۔ ان کے چہرے پر پریشانی نام کو بھی نہیں تھی۔ یہ غم کی تیسری رات تھی جبکہ دشمن کی طرف سے زبردست دباؤ تھا۔ اور حملے پر حملے کرتا رہا۔ شام کا وقت تھا۔ میں اور میجر صاحب دونوں بیٹھے ہوئے تھے وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ آخر کار خود ہی بول اُٹھے "مانک! ایک شیر چاہیئے جو دشمن کے نزدیک جا کر ٹینک ہٹ کرے پھر کچھ سوچ کر کہا کہ صبح مجھے خود ہی شیر بننا پڑے گا۔ دوسرے روز صبح خدا کا نام لے کر اٹھے ۴۰ ایم ایم بلنڈا سائیڈ اٹھایا۔ اور کرال کر کے مورچے کی طرف بڑھے آپ فرسٹ مورچے میں چلے گئے۔ آپ نے پہلی ہی دفعہ تین ٹینک ہٹ کئے۔ ابھی چوتھے ٹینک پر فائر کرنے ہی والے تھے کہ دشمن کے ٹینک نے ۳۰ براؤننگ کا برسٹ چلایا۔ گولیاں آپ کی دائیں آنکھ سے ہوتے ہوتے کچھ سر کے پار نکل گئیں۔ میجر صاحب اس کاری زخم کی تاب نہ لا سکے اور جام شہادت نوش کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ہم نے کرنل صاحب کو اس سانحہ کی رپورٹ دی۔ انہوں نے گن پوزیشن ڈائریکٹ کی اور ہدایت کی کہ جتنی ضرورت ہو فائر دیتے رہیں اور جوانوں کو بھی تاکید کی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں امداد پہنچ جائے گی۔ میں آدھے دن تک دشمن کے خلاف فائر دیتا رہا۔ اور برابر مقابلہ جاری رکھا۔ حالانکہ دشمن کی طرف سے زبردست گولہ باری ہو رہی تھی۔ دشمن کا خیال تھا کہ ہم میجر صاحب کی لاش اٹھا کر لائیں گے۔ اس لئے ان کے حملے جاری تھے کہ صوبیدار محمد دین ہماری کمپنی کے سینئر جے سی او صاحب تھے۔ ان کو حکم ملا کہ کمپنی کمانڈ کریں۔ آپ نے کافی دیر تک جوانمردی کا مظاہرہ جاری رکھا اور مورچوں میں جا کر جوانوں کے حوصلے بڑھاتے رہے اور ہمیں ایمونیشن کی سپلائی جاری رکھی۔ آپ کے بعد لفٹیننٹ ترمذی صاحب کمپنی کمانڈ کرنے آ گئے۔ صوبیدار محمد دین صاحب ترمذی صاحب کو نقشے اور آن گراؤنڈ سمجھا رہے تھے کہ گن کا فائر آ گیا وہاں ہم پانچ آدمی اکٹھے تھے کہ گولے کے پھٹنے سے صوبیدار محمد دین دو جگہ سے زخمی ہو گئے کافی خون نکلا۔ ترمذی صاحب زخمی ہوا اور مارٹر او پی سگنل سپاہی لال محمد نے وہیں جام شہادت نوش کیا۔ ہم ابھی ٹیلیفون پر رپورٹ دے رہے تھے کہ فائر سے ٹیلیفون کا ملاپ ٹوٹ گیا۔ اور ترمذی صاحب نے محمد دین صاحب کو کہا کہ آپ پیچھے جا کر کرنل صاحب سے بات کریں۔ لیکن صوبیدار محمد دین صاحب نے کہا کہ میں پیچھے نہیں جاتا جب تک یہ جوان ادھر ہیں۔ میں یہیں رہوں گا آپ بے شک چلے جائیں۔ میں یہیں رہوں گا آپ بے شک چلے جائیں۔ پیچھے جانے سے دونوں انکاری تھے میں نے دونوں کو فرسٹ ایڈ دیا۔ مجھے حکم ملا کہ جاؤ کرنل صاحب سے بات کرآؤ۔ اور ٹیلیفون لے آؤ۔ میں نے کرنل صاحب سے بات کی میں نے ان کو صوبیدار محمد دین صاحب ترمذی صاحب کے زخمی ہونے اور سپاہی لال محمد کی شہادت کی اطلاع دی۔ کرنل صاحب نے مجھے بتایا کہ کیپٹن مظفر گل صاحب آ رہے ہیں۔ ان کو ساتھ لے کر آپ چلے جائیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ترمذی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ کیونکہ ان کو زیادہ تکلیف ہو رہی تھی پر صوبیدار محمد دین صاحب کمانڈ کرتے رہے اور دشمن کے حملے پسپا کرتے رہے۔ میں ٹیلیفون اور کیپٹن صاحب کو ساتھ لے کر چلا گیا

جب ہم پہنچے تو صوبیدار صاحب نے ان کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد علم ملا کہ میجر آصف ہارون صاحب آ رہے ہیں۔ اور کیپٹن صاحب واپس آجائیں گے

میجر صاحب نے کمانڈ سنبھال لی اتنے میں رات ہو گئی۔ ہمارے پاس نفری بہت کم تھی میجر صاحب نے بتایا کہ سٹین گنوں کو ایم جی رول پر استعمال کر کے لمبے لمبے برسٹ چلاؤ تاکہ دشمن کو پتہ چلے کہ نفری بہت ہے۔ رات بھر حملے ہوتے رہے اور ہم ڈٹے ہوئے تھے۔

شام کو میجر آصف ہارون اور نائیک امیر نواز بڑی جدوجہد کے بعد لاشیں پیچھے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ رات کو مجھے آرڈر ملا کہ دشمن نے گھیرا ڈال دیا ہے۔ بی کمپنی تک جانے کے لئے ۲۰۰ گز کا وقفہ ہے۔ وہاں سے نکل کر بی کمپنی تک پہنچ جاؤ۔ ہم سات آدمی تھے۔ میں اور تین اور آدمیوں نے مل کر دونوں لاشیں اٹھائیں اور راتوں رات بی کمپنی کی پوزیشن میں پہنچ گئے وہاں سے جیپ میں دونوں لاشیں رکھیں اور پیچھے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں پہنچا دیں۔ لاشیں ان کے حوالے کیں اور میں واپس اپنی کمپنی میں آگیا۔

صوبیدار میجر محمد دین کا انٹرویو

صوبیدار میجر محمد دین صاحب میجر اکرم شہید کی پلٹن کی سی کمپنی کے سینئر جے سی او رہے ہیں۔ ۳۱ مارچ ۷۱ء سے ۵ دسمبر ۷۱ء کو میجر اکرم کی شہادت کے دن تک رات دن ان کے ساتھ رہے۔ انہیں ڈیوٹی پر اور ڈیوٹی سے باہر دفتر میں کام کرتے اور میدان جنگ میں لڑتے غرض ہر حال میں دیکھا۔

صوبیدار محمد دین صاحب سے ہماری یہ گفتگو ہوئی۔

سوال:۔ صوبیدار صاحب آپ کا میجر محمد اکرم شہید سے بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ پہلے یہ فرمایئے کہ آپ کے ان کے بارے میں کیا تاثرات ہیں۔

جواب:۔ میرا پہلا تاثر تو یہ ہے کہ میجر صاحب ایسے بہت کم افسر ہوتے ہیں۔ بہترین افسر ہی نہیں

بہترین آدمی بھی تھے۔ بے حد سادہ طبیعت، سادہ لباس اور سادہ خوراک۔ ان سے ان کے ماتحت بچتے نہیں تھے۔ اگر آتے جاتے نظر آجاتے تو بٹالین کے سپاہی اپنی سواوز کہتے میجر صاحب آرہے ہیں، چلو ان سے جاکر ملتے ہیں۔ ہم لوگ ان کے عہدے کی وجہ سے ہی نہیں ان کی شخصیت کی وجہ سے دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ صاحب کیا بتاؤں بڑے بہترین افسر تھے۔

سوال:۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے کیا آپ اس کی مثالیں دینا پسند کریں گے؟

جواب:۔ مثلاً ان کی دیانت داری اور خدا ترسی کو دیکھئے۔ اپریل ۷۱ء میں ملٹری ایکشن کے بعد ہمارے قبضے میں یا نگرانی میں بہت سی چیزیں آتی رہتی تھیں لیکن میجر صاحب خود تو کسی چیز کی پروا نہیں کیا کرتے تھے اور ہمیں بھی مال غنیمت کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے اپنے آدمیوں کی تلاشی تک لیتے تھے۔ بھلی کے علاقے میں چاول اور دھان کے گودام تھے انہیں سیل کروا دیا تھا۔ خود اپنی نگرانی میں غریبوں کو چاول تقسیم کرواتے تھے۔

سوال:۔ لیڈر شپ کی کوئی مثال؟

جواب:۔ یہی تو ان کا کمال تھا۔ ہر ایکشن میں سب سے آگے چلتے تھے۔ مکتی باہنی سے گوریلا لڑائی لڑنی پڑی تھی۔ ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ لیکن اکرم صاحب پروا نہیں کرتے تھے۔ ہم کہتے تھے میجر صاحب ذرا احتیاط کیا کریں۔ آپ کمانڈر ہیں۔ کمانڈر کے سہارے کمپنی چلتی ہے ہمیں آگے چلنے دیں۔ اس طرح کے موقعوں پر ایک جملہ اکثر دھرایا کرتے تھے۔

سوال:۔ کیا؟

جواب:۔ جو گولی میرے لئے بنی ہے وہ کسی اور کو نہیں لگے گی۔ دراصل وہ بہت بڑے پکے مسلمان تھے۔ موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔

سوال:۔ پکے مسلمان ہونے کی کوئی دلیل؟

جواب:۔ نماز تو خیر وہ باقاعدگی سے پڑھتے ہی تھے۔ تسبیح بھی بہت پڑھتے تھے۔ بلکہ تسبیح عادتاً

ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ رحمدل اور انصاف پسند بھی بہت تھے۔ کئی لوگ پکڑ کر لاتے جاتے تھے جن پر مکتی باہنی کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ ان کو کوئی اذیت نہیں دیتے تھے۔ مکتی باہنی اپنے ظلم و تشدد کے لئے مشہور تھی۔ لیکن میجر صاحب ملزموں کے بارے میں بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ان کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی تھی کہتے تھے کسی بے گناہ کے ساتھ زیادتی نہ ہو جائے۔

سوال:۔ کوئی اور خاص بات ان کے بارے میں؟

جواب:۔ ایک خاص بات یہ کہ بہت کم سوتے تھے بلکہ سوتے میں بھی جاگتے رہتے تھے وہ اس طرح کہ رات جس وقت بھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی وہ پہلی رنگ پر ریسور ہاتھ میں اٹھا لیتے تھے۔ صبح سویرے اٹھتے تھے۔ اردلی کو انہیں اٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

سوال:۔ کوئی خاص عادت؟

جواب:۔ کوئی بُری عادت تو تھی ہی نہیں سگریٹ تو کیا چائے تک بہت کم پیتے تھے میں کہہ چکا ہوں درویش صفت آدمی تھے۔ جو کھانا بھی سامنے آتا ذوق شوق سے کھا لیتے

سوال:۔ جنگ کے علاوہ کیا باتیں کرتے تھے اپنے بارے میں کوئی کہانی قصہ یا گھر والوں کی باتیں؟

جواب:۔ بہت کم گو تھے۔ اپنے بارے میں یا گھر والوں کے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ غالباً ایک بھائی ای پی سی ایف میں تھا اس سے فون پر کبھی کبھی بات کر لیا کرتے تھے۔ فوجی ماتحتوں پر بہت شفقت کرتے تھے۔ لیکن ڈیوٹی لینے میں بہت سخت ذرا ذرا سی غلطی کا سخت نوٹس لیتے تھے۔ غرض کہ بہترین افسر تھے۔

ایک رفیق کار کی گواہی

میجر (اب لیفٹننٹ کرنل) آصف ہارون نے ۵ دسمبر ۱۷ء کی سہ پہر کو اکرم شہید کی

کمپنی کی کمان سنبھالی اور ان کی لاش کو واگذار کرایا۔ ہم نے ان کو بھی زحمت دی اور

ان سے انٹرویو لیا۔

سوال:۔ آصف صاحب! آپ برسوں ۴ ایف ایف آر سے متعلق رہے ہیں۔ اکرم شہید سے

آپ کی ملاقات کب ہوئی؟

جواب:۔ میں کمیشن لے کر ۴ ایف ایف آر سے وابستہ ہوا تھا۔ اس وقت یعنی اپریل ۶۶ء میں یہ

یونٹ ظفر وال میں متعین تھی۔ وہیں ان سے رسم و راہ شروع ہوئی۔

سوال:۔ جب آپ ۴ ایف ایف آر میں آئے۔ اپریل ۶۶ء میں تو اس وقت ستمبر ۶۵ء کی یادیں

لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہوں گی۔ ۴ ایف ایف کے جن افسروں نے ستمبر ۶۵ء میں جنگ

میں اس سیکٹر میں حصہ لیا تھا ان کی باتیں سنی ہوں گی۔ اکرم شہید کے بارے میں بھی آپ

نے کوئی خاص بات سنی تھی؟

جواب:۔ جی ہاں۔ اکرم کی کمپنی میں ان کی جرأت اور ہمت کا چرچا تھا۔ جو واقعہ میں نے بار بار

سنا وہ یہ ہے کہ ۶۵ء کی جنگ کے دوران ظفر وال سیکٹر میں اکرم کو دشمن کے علاقے میں

خاصی گہرائی میں بہت ہی اہم ریکی کے لئے بھیجا گیا تھا انہیں دشمن کی فارورڈ لائن سے

پیچھے جا کر یہ معلوم کرنا تھا کہ دشمن کی تعداد کتنی ہے اور اس کے پاس بکتر بند دستے ہیں یا نہیں

یہ ایک نہایت اہم اور مشکل مشن تھا۔ اکرم صحیح مقام پر پہنچے اور ضروری معلومات حاصل

کیں۔ لیکن جب مشن کو پورا کر کے واپس آ رہے تھے تو دشمن کو ان کے پٹرول کی موجودگی

کا پتہ چل گیا۔ اور اس نے ان پر فائر کھول دیا۔ اس نازک لمحے میں اکرم نے اپنے پٹرول کے

باقی آدمیوں کو آگے بھیج دیا۔ اور ان کے لئے کورنگ فائر کرتے رہے اور خود سب سے آخر

میں رینگ رینگ کر دشمن کے علاقے سے باہر آئے۔ اس موقعہ پر انہوں نے اپنی جان اپنے

پٹرول کے لئے سخت خطرے میں ڈال لی تھی۔ اس کے بعد بھی انہیں کئی مشکل پہ وہاں پہنچیں

گیا۔

سوال :۔ آصف صاحب اب کچھ ان کی شخصیت و کردار کے بارے میں بتایئے؟

جواب :۔ جب میں یونٹ سے وابستہ ہوا تو اکرم کیپٹن تھے اور اپنے جونیرز سے بہت کم بات کرتے تھے کہا جاسکتا ہے کہ طبعاً کم گو تھے اور مجلسی نہیں تھے۔ اپنے جونیرز کے ساتھ ان کا رویہ ایک حد تک سخت تھا۔ کیونکہ وہ کام کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ فرصت کا وقت میس میں گپ شپ میں نہیں اپنے کمرے میں پڑھنے میں گزارتے تھے۔ یونٹ کی ہاکی ٹیم کے اہم رکن تھے۔

۱۹۶۷ء میں وہ کوارٹر ماسٹر بن گئے تھے اس کام میں بھی انہوں نے خصوصی فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ پلٹن میں جو مشکل سے مشکل کام انہیں دیا جاتا وہ اسے بڑی خوشی اور انہماک سے انجام دیتے تھے۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کام یا مطالعے ہی میں مگن رہتے ہیں جوانی کی کوئی ترنگ ان میں نہیں تھی۔ پلٹن کے سینئر افسروں کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔

سوال :۔ ہارون صاحب۔ اب کچھ ھلی کے محاذ کی بات بھی ہو جائے۔

جواب :۔ میں نے شہید کی لاش کس طرح واگذار کرائی اس کی تفصیلات تو میں آپ کو بتا چکا ہوں ھلی کے معرکے کی تفصیلات کے لئے میں اپنا مقالہ بھی آپ کو دے چکا ہوں۔

سوال :۔ جی شکریہ۔ ہم جاننا یہ چاہتے ہیں کہ جب انکی کمپنی کی کمان آپ نے سنبھالی تو ان حالات سے آپ نے اکرم کی کارکردگی کے بارے میں کیا تاثر لیا؟

جواب :۔ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ شخص بڑے دل گردے کا تھا۔ اس کو جان کی ذرا پرواہ نہیں تھی

سوال :۔ تاثر کی وجہ؟

جواب :۔ میجر اکرم کو کتابی قاعدے سے کمپنی کے ہیڈ کوارٹر میں ہونا چاہیئے تھا۔ جو خاصی محفوظ جگہ ہوتی ہے۔ وہ درمیانی پلاٹون کے ساتھ بھی ہو سکتے تھے جو نسبتاً محفوظ ہوتی ہے لیکن سب سے خطرہ کی جگہ لیفٹ فارورڈ پلاٹون کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ چونکہ اسی پلاٹون پر حملہ آنے کا سب سے زیادہ امکان تھا اور یہی ہوا۔ تمام حملے اسی پلاٹون پر ہوئے۔

ہیں نے خود ان کی وہ جگہ دیکھی ہے جسے فوجی زبان ہیں ٹیکٹیکل ہیڈ کوارٹر کہتے ہیں۔
چونکہ اس کمپنی کو کوئی وقت نہیں ملا تھا۔ اس لئے ان کا اپنا کوئی بنکر نہیں تھا۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کمپنی کمانڈر سب سے پہلے اپنا بنکر بنواتا ہے۔ مگر اکرم نے کمپنی کے دفاع کو زیادہ ترجیح دی اور خود ایک نالے میں جو دشمن کی نگاہ سے محفوظ تھا قیام کیا۔ اس جگہ کو اوپر سے کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا کھلی جگہ تھی۔ اس جگہ ایک چٹائی پڑی تھی۔ اس پر ایک نقشہ پھیلا تھا۔ پاس ایک ٹرانسسٹر پڑا تھا۔ یہ تھا ان کا ٹیکٹیکل ہیڈ کوارٹر جہاں سے وہ لڑائی لڑ رہے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات کو جب اکرم شہید کو یہ خبر سنائی گئی کہ غربی محاذ پر ہماری فوجوں نے اکھنور پر قبضہ کر لیا ہے اور چھمب کی طرف پیش قدمی کی ہے تو مسرت و فخر سے اور وہ اکرم جو بہت کم اپنے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے بڑے جوش سے بولے

اب اگر میں مر بھی جاؤں تو پروا نہیں

ھلی محاذ کی منصوبہ بندی اور تیاری جہاں ڈی کمپنی متعین تھی ۔ اور جہاں دشمن کا پہلا حملہ آیا۔ اکرم شہید نے کی تھی۔ انہوں نے اس مورچہ کو بہت مضبوط دفاعی پوزیشن میں تبدیل کر لیا تھا۔ لیکن رائے باغ پر جو لڑائی انہوں نے لڑی وہاں تیار کئے ہوئے مورچے نہیں تھے۔ اوپر سر پر کوئی بچانے والی چیز نہیں تھی۔ ٹینک اور توپ خانے کی مدد بھی حاصل نہیں تھی۔ ان انتہائی ناساز گار حالات میں دشمن کے پے در پے حملوں کا روکنا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

ھلی کے معرکے میں اپنی جرأت اور قیادت کے جوہر دکھانے سے پہلے اکرم اپنی کمپنی کے ساتھ باقی بٹالین سے سات میل دور چرکئی میں نبرد آزما تھے۔ یہ جگہ مکتی باہنی کی تخریبی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھی۔ وہ گوریلا لڑائی لڑ رہی تھی۔ چرکئی میں اکرم کی کمپنی تمام خطرات کا تنہا مقابلہ کر رہی تھی جب تک اکرم وہاں رہے کمانڈنگ پوزیشن میں رہے۔ ۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو اکرم کی شہادت کے دن میں بدو دریا کے مقام پر دو بہاری نوجوانوں سے ملا۔ جو چرکئی سے رائے باغ تک۔

تبر اکرم کے ساتھ لڑتے رہے تھے۔ وہ اکرم کے لیے بری طرح رو رہے تھے۔ یہ رونا اس کمانڈر کے لئے بھی تھا جو میدان جنگ میں کام آگیا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ ان کا بے اختیار رونا اس جلیل و جمیل کے لئے تھا۔ جس کی جھلک انہیں اکرم میں نظر آئی تھی۔

بریگیڈیر ممتاز ملک ستارہ جرأت کا انٹرویو

سوال:۔ ممتاز صاحب۔ آپ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ ان تاریخ ساز لمحوں میں جب اکرم نے نشان حیدر حاصل کیا وہ آپ کے زیر کمان تھے۔ آپ ہی نے ان کے نشان حیدر کیلئے بنیادی تحریری کارروائی شروع کی ہوگی۔ اس لئے آپ سے بڑھ کر کون اکرم کی کارکردگی اور شخصیت پر تبصرہ کر سکتا ہے۔

جواب:۔ اصل میں اس زمانے میں ۴ ایف ایف آر لفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) محمد اخلاق عباسی کے زیر کمان تھی۔ اور میں ایسٹرن کمانڈ کے ساتھ جی ون تھا۔ ۲۵ نومبر ۱۷ء کو کرنل عباسی زخمی ہو کر ہسپتال جا چکے تھے۔ ۲۶ نومبر ۱۷ء کو جب میں کمانڈر کے ساتھ ھلّی کے اہم محاذ پر پہنچا تو صورت حال کا علم ہوا۔ چنانچہ میں نے کمانڈر صاحب سے درخواست کی یہ میری پرانی یونٹ ہے۔ اپریل ۱۷ء تک میں ہی اسے کمانڈ کرتا رہا ہوں۔ اس کا سی او زخمی ہو چکا ہے۔ اس لئے مجھے عارضی طور پر اس کی کمان سنبھالنے کا موقعہ دیا جائے۔ ھلّی کا محاذ ایک زبردست فوجی اہمیت کا محاذ تھا۔ دشمن نے اپنا بڑا حملہ شروع کر دیا تھا۔ اور اس کی انتہائی کوشش تھی کہ ہمارے دفاع کو توڑ کر وہ بوگرہ کی طرف بڑھ سکے۔ ان حالات میں، میں نے اس بٹالین کی کمان سنبھالی۔ جواب تک کرنل عباسی کی کمان میں ھلّی کا کامیاب دفاع کر رہی تھی۔ ھلّی کے اصل محاذ پر میجر (اب لیفٹننٹ کرنل) جولین پیٹر کی ڈی کمپنی اور میجر اکرم کی سی کمپنی دشمن کی یلغار کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہی تھی۔

سوال:۔ کیا آپ اکرم کے اس تاریخی کارنامے پر کچھ تبصرہ کرنا پسند کریں گے۔ جس کے لئے انہیں

نشان حیدر سے نوازا گیا؟

جواب:۔ ظاہر ہے کہ وہ کارنامہ غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ نشان حیدر کے فرمان میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اس میں میں اتنا اضافہ کروں گا کہ اکرم نے جس تاریخی اور مثالی شجاعت اور جاں نثاری کا ثبوت دیا وہ کوئی اتفاقی امر یا کسی فوری جوش کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس تاریخی لمحے کے لئے وہ برسوں سے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔ ۴ ایف ایف آر میں شروع دن سے ان کی امیج ایسی تھی کہ ان کی شہادت پر بٹالین کو افسوس تو شدید ہوا لیکن تعجب ذرا نہ ہوا۔ جب مشرقی پاکستان میں یونٹ کے جانے کے وقت سے وہ جس ذوق و شوق اور جرأت سے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مصروف تھے اور ان کی شخصیت و کردار کے جو نقوش افسروں اور، اور رینک کے ذہن میں تھے ۔ اس کے پیش نظر سب کا لاشعوری اتفاق اس امر پر تھا کہ بقول اقبال یہ جوان قبیلہ کی آنکھ کا تارا بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اکرم نے ۵، دسمبر کی صبح کو دکھا دیا۔ کہ جو توقعات ان سے وابستہ کی گئی تھیں وہ غلط نہیں تھیں۔ اکرم کی شجاعت کی داد اپنوں ہی نے نہیں دشمنوں نے بھی دی ہے۔

بریگیڈیر محمد اخلاق عباسی کے تاثرات

میجر محمد اکرم شہید کو اکتوبر ۱۹۶۳ء میں میری پلٹن میں کمیشن ملا۔ وہ بڑے ہی تھوڑے عرصہ میں پلٹن کے بلند معیار پر پہنچ گئے۔ اور اپنے لئے پلٹن میں ایک نمایاں مقام پیدا کر لیا۔ میدان پریڈ کا ہو یا کھیل کا اکرم مرد میدان ہو کر ابھرتے اور اپنی مقبولیت میں اضافہ کرتے رہے ان کی خوش بختی نے انہیں دو ہی سال میں کارزار کا بھی تجربہ عطا کر دیا۔ یہاں بھی اکرم کی کارکردگی قابل فخر رہی۔ قدرت انہیں تیار کر رہی تھی۔ اس عظیم قربانی کے لئے جس نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا۔

اکرم اکثر مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ میجر اکرم نے کیا کارنامہ انجام دیا۔ ظاہر ہے کہ اکرم نے

اللہ کے راہ میں جان کی قربانی پیش کر کے حیات جاوداں پائی۔ ملک کے دفاع میں خوشی سے جان دے دینا کتنا عظیم کارنامہ ہے یہ صرف وہی لوگ جانتے ہیں۔ جنہوں نے انہی حالات میں اللہ سے زندگی کی بھیک مانگی ہو یا جو لوگ باوجود خواہش کے اس سعادت سے محروم رہے ہوں۔ قربانی کا جذبہ عظیم ہے لیکن قربانی کی مقبولیت عظیم تر ہے۔ میری پلٹن کا ہر شخص قربانی کے جذبے سے سرشار تھا لیکن اللہ نے ہمارے مقبول ترین دوستوں ہی کو جام شہادت بخشا ان میں اکرم کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم انہیں اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔ اور اپنے اندر انہی کی سی خوبیاں پیدا کرنے کی سعی کریں۔ صرف خطابت یا کتابت پر بھی اکتفا کر لینا شہیدوں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ اکرم شہید کی چند خوبیاں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ جو میرے خیال میں ہمارے لئے سنگ میل بن سکتی ہیں۔

ایمان

اکرم ایک سچے مسلمان کی طرح خالق حقیقی پر غیر متزلزل ایمان رکھتے تھے اور اس کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن ہونے کی سعی میں لگے رہتے تھے۔ اللہ پر جو تکیہ وہ کرتے تھے اس کے صدقے میں انہیں ہمیشہ کامرانیاں نصیب ہوئیں وہ مشکل ترین اوقات میں بھی "اللہ خیر کرے گا" کہہ کر مصروف عمل ہو جاتے تھے۔ دوستوں کو ان کی اس ادا پر اکثر رشک آتا تھا۔ حلی کے میدان کارزار میں بھی جہاں وہ اپنے سے کئی گنا زیادہ تعداد میں دشمن سے برسر پیکار تھے۔ یہی قوت ایمانی ان کے آڑے آئی اور دشمن کی یلغار کو اس کی پسپائی میں تبدیل کر دینے میں کامیاب ہوئے۔ اکرم مندرجہ ذیل باتوں میں یقین رکھتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی ان کا قائل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

(۱) زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔

(۲) موت کا دن وقت اور جگہ متعین ہے۔

(۳) شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

(۴) اللہ اپنے وعدے کے مطابق ثابت قدم مجاہدوں کی ضرور مدد کرتا ہے۔

یقین محکم

اکرم اپنے قومی مقاصد فوجی عظمت اور ذاتی تربیت ماتحتوں پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ اور اپنی صلاحیت پر اعتماد رکھتے تھے۔ انہیں ہمیشہ یہ یقین رہتا تھا کہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہوں گے اس کی بنیادی وجہ اللہ تعالی پر انمٹ بھروسہ تھا۔ یقین ہمیشہ ان کی شخصیت میں اعتماد کے عنصر کو زیادہ اجاگر کر دیتا تھا۔ اور دیکھنے والوں کو بھی ان کی کامیابی کا یقین ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی کمپنی دشمن کے مقابلے میں بنیان مرصوص کا نمونہ ثابت ہوئی اور پلٹن کا نام ہمیشہ کے لئے روشن ہو گیا۔

عمل پیہم

کمرے میں اینٹیں رکھ کر ہاکی کی پریکٹس کرنا پمفلٹوں میں کھو جانا۔ نقشے پر مختلف تجویزیں وضع کرتے رہنا اور مورچوں کی مسلسل دیکھ بھال کرنا اکرم کے ایسے مشاغل تھے۔ جن کے بغیر ان کی شخصیت کا احاطہ مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں خاموشی دیکھی۔ چنگاری کا کام کیا۔ مسلسل کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت نے دشمن کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ عمل پیہم کے طفیل وہ ایسا مشاق سپاہی بن چکے تھے کہ اپنے دوستوں میں "اتھارٹی" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

جذبہ ایثار

اکرم کو جاننے والے احباب مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اکرم نے اپنی ساری زندگی اس جذبہ میں

بسر کی اور آخر کار جان قربان بھی کر دی۔ اپنے گھر والوں اپنے جوانوں اور دوستوں کو خوش رکھنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ جہاں کسی کو پریشان دیکھتے اس کی دل جوئی میں لگ جاتے۔ خود تکلیف اٹھاکر دوسروں کو راحت پہنچانے کی کوشش کرتے۔ خواہ دوسروں کا طرز کیا ہی ہو۔

خوش خلقی

میں نے اکرم کو مختلف اوقات حالات اور مراتب میں دیکھا ہے۔ وہ ہر حال میں خوش رہتے تھے۔ ایک پُر اعتماد مسکراہٹ ہمیشہ ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہ کرنے والے اکرم بے حد ہر دل عزیز تھے۔ اجنبی بھی ان کی خندہ پیشانی سے متاثر ہوتے بغیر نہ رہتے۔ مقابل کی تلخی یا ناراضگی ان کی مسکراہٹ اور خوش مزاجی پر اثر انداز ہونے سے قاصر رہتی۔ اس عادت نے ان کے دوستوں اور جوانوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

اکرم شہید کی شخصیت کا مکمل طور پر الفاظ میں احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے ان کی چند دل پسند صفات کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ ہم بھی کوشش کریں کہ ان میں سے کچھ خوبیاں اپنے اندر پیدا کر سکیں۔ اکرم کی جرأت کے شایان شان نذرانہ عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔

لفٹیننٹ کرنل جولین پیٹر سے انٹرویو

سوال:۔ پیٹر صاحب۔ پہلے مختصر تعارف ہو جائے۔

جواب:۔ میرا نام جولین پیٹر ہے۔ شروع سے ۴ ایف ایف سے متعلق رہا ہوں۔ اب اسی بٹالین کو کمان کر رہا ہوں۔ ۶۹ء میں اس پلٹن کا ایڈجوٹینٹ اور لفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) ممتاز ملک کمان افسر تھے ۷۱ء کے اوائل میں یونٹ کو مشرقی پاکستان جانا پڑا۔ غالباً مارچ کی آخری تاریخوں میں ہم لوگ ڈھاکہ پہنچے تھے۔

سوال:۔ پیٹر صاحب! براہ کرم اب ذرا تفصیل سے کام لیجئے۔ تاکہ ان دنوں کے واقعات کی ایک

تصویر کھینچ سکیں؟

جواب:۔ ڈھاکہ میں ہم ائرپورٹ کے قریب ایک پبلک اسکول میں ٹھہرے۔ اپریل کے شروع میں ہم ایک جگہ لال منیر ہٹ پہنچے۔ ان دنوں ہمارے ذمے ایک کام یہ بھی تھا کہ ہم امن و امان بحال کریں۔ اکرم چونکہ بنگلہ زبان جانتے تھے اور ایسٹ پاکستان رائفلز میں دو سال رہنے کی وجہ سے وہ وہاں کے عوام کے رسم و رواج و عادات سے بھی واقف تھے۔ اس لئے وہ امن اور اعتماد کی بحالی کے کام میں بہت کامیاب رہے۔ لال منیر ہٹ کے بعد کچھ دنوں کے لئے ہم بوگرہ رہے پھر ہم مئی جون میں سرحد پر ھلی کے علاقے میں چلے گئے۔ میری ڈی کمپنی ایک جگہ پنچ بی بی پہ تھی۔ ھلی کے بائیں جانب اکرم کی سی کمپنی خاص ھلی ریلوے اسٹیشن پر متعین تھی۔ ھلی ایک سرحدی قصبہ تھا۔ دشمن عناصر بھارت کی سرحد کو استعمال کر کے تخریبی کارروائیاں کرتے تھے۔ اکرم نے اس علاقے میں اس حد تک امن و امان بحال کر دیا اور ریلوے لائن اور اسٹیشن اتنا محفوظ بنا دیا کہ اس زمانے میں اس لائن پر ایک تیز رفتار راکٹ ٹرین بھی چلائی گئی تھی۔ یہاں مجھے ایک دلچسپ بات یاد آ گئی۔

سوال:۔ کیا فرمایئے؟

جواب:۔ میں بتا چکا ہوں کہ میری ڈی کمپنی ھلی کے بائیں جانب پنچ بی بی کے مقام پر مورچے سنبھالے ہوئے تھی۔ کبھی کبھی میں یا دوسری کمپنیوں کے افسر میجر اکرم کی کمپنی ہیڈ کوارٹر جاتے رہتے تھے۔ اکرم کو مقامی مٹھائی کا جو مشٹی کہلاتی تھی بہت شوق تھا۔ جب کبھی ہم جاتے تو وہ ہماری تواضع مشٹی سے ضرور کرتے تھے۔ اگر ذرا دیر ہوتی تو ہم خود کہتے لاؤ بھئی مشٹی کہاں ہے؟ تھوڑی دیر ہنسی مذاق بھی رہتا۔ لڑائی کے کھنچاؤ کے زمانے میں مشٹی اور دو چار ہنسی کی باتیں ایک نعمت سے کم نہیں تھیں۔

اب میں پھر وہی داستان شروع کرتا ہوں۔ ھلی سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر ایک جگہ ہے مہیش پور۔ جولائی اگست ۷۱ء میں میری کمپنی کو مہیش پور جانے کا حکم ملا۔ پھر ستمبر میں میری،

ڈی کمپنی ھلی چلی گئی اور اکرم کی کمپنی نے ڈی کمپنی کی جگہ لے لی۔ اس زمانے میں دشمن عناصر کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ حالات اور خراب ہوگئے در پردہ بھارتی دستے حملے کر رہے تھے۔ چھوٹے ہتھیاروں کا فائر آتے رہنا ایک عام بات ہوگئی تھی۔ ۲۲۔ نومبر ۷۱ء کی رات کو دشمن کی گاڑیوں کی بہت زیادہ حرکت دیکھ کر میجر اکرم نے مجھے پیغام دیا۔ میجر پیٹر کو بتاؤ کہ ذرا چوکنے رہیں دشمن کی گاڑیوں کی حرکت آپ کی طرف ہے۔ چنانچہ اکرم کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ اور ۲۲ر نومبر کی رات کو دشمن نے میری ڈیلٹا کمپنی پر بھرپور حملہ کیا میری کمپنی کے دائیں بازو کو مضبوط کرنے کے لئے پلٹن کے سی او لفٹیننٹ کرنل محمد اخلاق عباسی نے میجر اکرم کی سی کمپنی کو میری دائیں طرف کا دفاع سنبھالنے کو کہا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ دفاعی مورچے تیار کرنے کا وقت اور موقعہ کہاں تھا۔ سارا علاقہ دشمن کے حملے کی زد میں تھا۔ اس کے باوجود اکرم نے دفاعی پوزیشن لی۔ اور دشمن کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ دشمن کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ میری یا اکرم کی کمپنی کے دفاع کو توڑ کر آگے بڑھے لیکن ڈی اور سی کمپنی نے اسے پیش قدمی نہیں کرنے دی۔ نومبر کے آخری دنوں میں اسی محاذ پر دشمن کا دباؤ بڑھتا رہا۔ اور اسی نسبت سے میجر اکرم کی مزاحمت بڑھتی رہی۔ ۳ر دسمبر ۷۱ء کو میں زخمی ہوا اور ۴ر دسمبر کو میں بوگرہ کے ہسپتال میں تھا۔ دوسرے روز ۵ر دسمبر کو پتہ چلا کہ اکرم شدید زخمی ہوگئے ہیں۔

سوال :۔ اس خبر پر آپ کا پہلا تاثر کیا تھا؟

جواب :۔ یہ سنتے ہی مجھے دکھ ہوا۔

سوال :۔ کیوں؟

جواب :۔ اس لئے کہ اکرم کی کمپنی ھلی کے دفاع کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی اور اس دفاعی سرگرمی میں اکرم کی شخصیت ایک اہم عنصر تھی مجھے یقین سا تھا کہ اکرم کی غیر موجودگی سے بڑا فرق پڑے گا۔ جب شام ہوتے اکرم کی شہادت کی خبر ملی تو مجھے شدید صدمے

کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا فخر بھی ہوا۔ اکرم نے وہ کچھ کیا جو ایک بہادر کمانڈر کو کرنا چاہیئے تھا اور اس نے یونٹ اور ملک کا وقار بلند کیا اس وقت سے اب تک مجھے برابر یہ احساس رہا ہے کہ اکرم کی شہادت کی اہمیت کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا۔ اکرم کا نشانِ حیدر ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوال:۔ براہ کرم اپنے نقطہ نظر کی وضاحت فرمایئے؟

جواب:۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کا یہ تنہا نشان حیدر اس امر کی علامت ہے کہ کم از کم سپاہی نے اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا اور پاکستان کو متحد رکھنے کی جان پر کھیل کر تا دم آخر کوشش کی۔

سوال:۔ آخر میں ایک سوال اور، اور وہ یہ کہ اکرم شہید کی پوری شخصیت و کردار پر آپ کا مختصر تبصرہ کیا ہو سکتا ہے۔

جواب:۔ ایک بہترین انسان اور بہترین سپاہی۔

حوالدار عمل دین سے انٹرویو

سوال:۔ عمل دین صاحب یہ بتلایئے کہ آپ کا واسطہ میجر اکرم شہید سے کہاں اور کتنے عرصے رہا۔

جواب:۔ میں اب چار ایف ایف میں لانس حوالدار ہوں، پہلے میجر اکرم صاحب کی "سی" کمپنی میں سپاہی تھا۔ اسی حیثیت میں سیالکوٹ، لاہور اور کوئٹہ میں ان کے ساتھ رہا۔

سوال:۔ اس تعلق کی بنا پر آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب:۔ میجر صاحب بہت محنتی اور اچھا افسر تھا۔ خود پورا کام کرتے تھے اور پورا کام مانگتے تھے۔ کوئی کام نہ کرے یا کوئی اور گڑبڑ کرے تو سختی ضرور کرتے تھے لیکن عام طور پر بہت مہربان تھے۔ اسکیموں میں ہمارے ساتھ ساتھ چلتے اور اکثر ہمارے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ ہم لوگوں سے ملنے جلنے میں اچھے تھے۔ کوئی غرور نہ تھا۔ بہت سادہ طبیعت تھے ان کا رعب تو

بہت تھا لیکن رعب ڈالتے نہیں تھے۔

سوال:۔ کوئی اور خاص عادت؟

جواب:۔ ہاں نماز کے بہت پابند تھے۔ ہم لوگوں سے بھی کہتے نماز پڑھا کرو بلکہ اکثر پڑھواتے تھے۔

سوال:۔ ہلّی کے محاذ پر آپ ان کے ساتھ نہیں تھے؟

جواب:۔ نہیں میں پلٹن کے ساتھ مشرقی پاکستان نہیں جا سکا تھا۔ ۲۶ نومبر ۷۱ کو وہاں پہنچا اور حکم ہوا کہ میجر پیٹر صاحب کی ڈی کمپنی میں رپورٹ کروں اکرم صاحب سی کمپنی کو کمان کر رہے تھے۔ اپنی کمپنی میں ان کی بہادری کے قصے سنے۔ اکرم صاحب بڑا دلیر افسر تھا اتنا بہادر کوئی کوئی ہوتا ہے۔ نیک بھی بہت تھا۔

فرض شناس اور فیاض اکرم

نائب صوبیدار کلرک محمد صدیق لکھتے ہیں۔

میں اکرم شہید کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ ان کی اور میری پہلی ملاقات جو ہماری بعد کی شب و روز کی ملاقاتوں کی پہلی کڑی تھی۔ ۱۹۶۲ء میں اس وقت ہوئی جب آپ کمیشن حاصل کر کے بحیثیت سیکنڈ لیفٹیننٹ میری پلٹن ۴ ایف ایف میں جلوہ افروز ہوئے انہیں ابتدائی ایام میں "سی" کمپنی کے فرائض سونپے گئے۔ ان دنوں خود میں اسی کمپنی میں بحیثیت کلرک کام کر رہا تھا۔ بعد ازاں وہ بٹالین کے کوارٹر ماسٹر کی کرسی پر براجمان ہوئے تو اس وقت بھی میں ان کی کیو برانچ میں بحیثیت کلرک کام کر رہا تھا۔ اس طرح گویا میرا اور ان کا تقریباً سات سال تک گہرا رابطہ رہا۔ اس تمام عرصے کے دوران ان کی سیرت و کردار کے اہم پہلو جو میرے سامنے آئے وہ یہ ہیں۔

موصوف نہایت رحم دل، چاق و چوبند، ہوشیار، مخلص، نرم مزاج، دیانت دار اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ فرائض منصبی کی بروقت بجا آوری کا سودا ہر وقت ان

کے سر میں سمایا رہتا تھا۔ سرکاری اوقات میں اکثر و بیشتر اپنے کاغذات میں گم پائے جاتے تھے۔ اپنے ماتحتوں سے ان کا رویہ خلوص اور نرم مزاجی پر مبنی تھا۔ لیکن اس قدر بھی نہیں کہ وہ کام چور بن جائیں۔

رحمدلی کا ایک واقعہ

جیسا کہ درج بالا سطور میں موصوف کے کردار کے اہم پہلو گنواتے ہوئے میں نے ان کی رحمدلی کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ ہماری پلٹن کے ایک نائیک مسمّی سوداگر کی شادی تھی لیکن مالی طور پر اس کی حالت اتنی کمزور تھی کہ وہ شادی کی رسومات کے اخراجات کا بار گراں برداشت کرنے سے قاصر تھا۔ ایسے حالات میں وہ خاصا پریشان تھا کہ میجر اکرم کو اس کا علم ہوا۔ انہوں نے اس کی حتی المقدر اپنی جیب سے مالی امداد کی یہاں تک ہی نہیں بلکہ بعدازاں اسے بیوی اور کنبہ کے دیگر افراد کی رہائش کے لئے سرکاری مکان کا بندوبست بھی فوری طور پر کر دیا۔

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو

لیفٹیننٹ کرنل عزیز احمد بخاری ایف ایف آر میجر اکرم کے بارے میں لکھتے ہیں "میجر اکرم میرے کورس ۲۸ پی ایم اے کے تھے۔ وہ قاسم کمپنی میں تھے اور میں صلاح الدین کمپنی میں لیکن پھر بھی ملنا ہوتا رہتا تھا۔ ہاکی، شوٹنگ، باکسنگ میں انہوں نے نام پایا بڑے خاموش اور سنجیدہ طبیعت تھے میرا ان کا دوسرا ساتھ مشرقی پاکستان ۷۰-۶۸ء میں رہا ہم دونوں ایسٹ پاکستان رائفلز میں تھے، ایک بار ہم نے ایسٹ پاکستان مشرقی ساحل تبابیل پوسٹ سے لے کر ٹکناف آوٹ پوسٹ تک کو دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ یہ بہت لمبا اور دشوار گزار راستہ تھا دریا، پہاڑ، نالے، جنگل ہر چیز کو عبور کرنا تھا۔ میں نے اس

تمام سفر میں انہیں دلیر، مضبوط، باشعور اور سدرد رب شریف پایا۔ وہ حدیث ہے کہ آدمی سفر میں پہچانا جاتا ہے۔ بالکل صحیح ہے اتنے لمبے سفر میں ایک بار بھی ایسا موقعہ نہیں آیا کہ اکرم میرے اوپر بوجھ بنے ہوں۔ یا کسی کام کو ٹالا ہو۔ وہ بڑے ظرف اور حوصلے کے آدمی تھے۔ ایسے معصوم سیرت لوگ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ راجشاہی میں ان کے گھر کو دیکھا اتنے بڑے دو منزلہ گھر میں اکیلے ایک کمرے میں تھے ایک معمولی سے بستر پر چادر لئے لیٹے تھے۔ کوئی تکلف نہ تھا۔ اقبال کے مرد مومن کے تصور نرم دم گفتگو گرم دم جستجو کی تصویر تھے۔

۲۲۴۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد اسحاق اے کے رحمینٹ کا انٹرویو

سوال:۔ میجر اکرم سے آپ کی رسم و راہ کب اور کیسے شروع ہوئی؟

جواب:۔ اوائل ۱۹۷۰ء میں میں نے ان سے چپائی نواب گنج میں ای پی آر کی اسٹنٹ ونگ کمانڈری کا چارج لیا تھا۔ اس وقت وہ میری طرح کیپٹن تھے۔ چپائی نواب گنج سے ان کی پوسٹنگ ای پی آر کے سلہٹ سیکٹر کے ہیڈکوارٹرز میں ہوئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ وہاں سے اپنی یونٹ ۴ ایف ایف میں واپس چلے گئے اس طرح چپائی نواب گنج میں میجر اکرم شہید نشان حیدر سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ کچھ تو وہ خود کھلے دل کے آدمی تھے اور کچھ ملٹری کالج کا رشتہ اس لئے یہ پہلی ملاقات بھی بھرپور ملاقات تھی۔

سوال:۔ پھر کب ملے؟

جواب:۔ اکرم شہید غالباً اپریل ۷۱ء میں اپنی بٹالین ۴ ایف ایف کے ساتھ دوبارہ مشرقی پاکستان پہنچ گئے تھے۔ میں ان دنوں ایسٹ پاکستان سویلین آرمڈ فورسز کے ساتھ وابستہ تھا۔ جب میری ای سی اے ایف کی ایک کمپنی ان کی بٹالین کے ساتھ منسلک کی گئی تو میں اس کمپنی کو چھوڑنے دیناج پور گیا تو وہاں پھر اکرم شہید سے ملاقات ہوئی یہ جون یا جولائی

۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے یہ میری ان سے دوسری اور آخری روبرو ملاقات تھی۔ اس کے بعد جو ان سے بات ہوئی وہ فون پر ہوئی اور فون پر جو فقرے انہوں نے کہے وہ ان کے مجاہدانہ جذبے کے غماز تھے۔ ان فقروں کو میں تازندگی نہیں بھول سکتا۔

سوال :۔ مثلاً؟

جواب :۔ ایسٹ پاکستان میں ہم تقریباً آٹھ نو ماہ سے باغیوں سے نبرد آزما تھے جن کی پشت پناہی ہندوستانی فوج کر رہی تھی۔ دشمن پر کاری ضرب لگاتے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہاں کی زمینی حالت تھی۔ پانی پانی ہر طرف پانی اور کیچڑ۔ اس پانی اور کیچڑ میں دشمن کے خلاف کارروائیاں کرتے کرتے ہم تنگ آ گئے تھے۔ اس لئے جب ۱۸ نومبر ۱۹۷۱ء کو میجر اکرم سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم ہوا تو دو چار باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

کیسی گزر رہی ہے؟ پانی اور کیچڑ سے کیسے نمٹ رہے ہیں؟ یہ سن کر میجر اکرم نے پُراعتماد لہجے میں کہا:۔

یہ لوگ ہمیں کیا سمجھتے ہیں کیا ہم نمک کے بنے ہوئے ہیں؟ کہ پانی میں گھل جائیں گے؟ ہم نمک کے نہیں پتھر کے بنے ہوئے ہیں پانی وانی سے فرق نہیں پڑتا۔ پھر تھوڑی سی ادھر ادھر گپ شپ ہوئی اور انہوں نے فون بند کر دیا۔ یہ ان سے آخری رابطہ تھا اس کے بعد جو خبر سُنی تو ان کی شہادت کی خبر سنی انہوں نے جو کہا تھا وہ سچ کر دکھایا۔

اکرم کی شگفتہ مزاجی

لیفٹیننٹ کرنل سید غلام اکبر پنجاب رجمنٹ کا انٹرویو

سوال :۔ اکبر صاحب آپ کی میجر اکرم سے پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

جواب :۔ اکرم شہید سے میری پہلی ملاقات پی۔ ایم۔ اے میں ہوئی۔ ۶۱ء میں وہ پی ایم اے کے

تاہم کمپنی میں آئے تھے۔ دوسری ٹرم میں، میں ان کا پلاٹون سارجنٹ تھا۔ چھ مہینے میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا میرا تاثر یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر شریف النفس تھے سادہ مزاج اور خاموش طبیعت اپنے کام سے کام۔ پی ایم اے میں اچھے خاصے لوگ، پر پرزے نکالنے لگتے ہیں لیکن اکرم شہید نوجوانی اور افسری کی ہر ترنگ سے آزاد اپنے پیشہ ورانہ مشاغل میں مگن رہتے تھے۔ اس چھ مہینے کے عرصے میں مجھے یاد نہیں میں نے کبھی انہیں سزا پر دیکھا ہو یا جھاڑ کھاتے پایا ہو۔ پی ایم اے میں ان کی گہری سنجیدگی بہت نمایاں بہت تھی اس لئے پی ایم اے کے میگزین کریسنٹ میں ان کی سنجیدگی کا خاکہ اڑایا گیا تھا لیکن دل سے سب ان کی قدر کرتے تھے۔

اکرم شہید سے میری دوسری ملاقات ای پی آر کی پوسٹنگ کے زمانے میں ۶۹ میں ہوئی میں دیناج ونگ میں تھا اکرم راجشاہی میں اور عزیز احمد بخاری رنگ پور میں تھے۔ ہم تینوں کیپٹن سے میجر کے امتحان کیلئے رنگپور میں جمع ہوتے اور پانچ دن ہم پیالہ و ہم نوالہ بالکل ساتھ رہے اکرم کی تیاری بہت اچھی تھی امتحان کے دوران میں بھی وہ زیادہ وقت پڑھنے میں گزارتے تھے اور اکثر میں اور منظور بخاری ان سے اپنی مشکلات حل کرتے تھے۔ ای پی آر کی دو سال کی رفاقت کے دور میں اکرم کی شخصیت کا ایک اور پہلو میرے سامنے آیا جو میرے لئے نیا دلچسپ بلکہ حیران کن تھا۔

سوال :۔ مثلاً کیا؟

جواب :۔ مثلاً یہ کہ ان کے اندر حس مزاح بھی تھی۔ دوستوں میں بڑی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے مذاق کا برا نہیں مانتے تھے قہقہہ لگانے میں فراخ دل تھے اور قہقہہ ماشاء اللہ بڑا صحت مند ہوتا تھا۔ آواز بھاری نہیں تھی لیکن قہقہہ بھرپور ہوتا تھا۔ بات سے بات پیدا کرتے تھے۔

سوال :۔ اکرم کے مزاح اور مذاق کی کوئی مثال آپ کے ذہن میں ہے؟

جواب :۔ جی ہاں۔ اس وقت تو یہ لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ رنگ پور سے جانے کے بعد جب کبھی فون پر

ملاقات ہوتی تو دوستوں کو دلچسپ ناموں سے یاد کرتے تھے۔ مثلاً ہمارے ایک
دوست تھے سرخ وسپید رنگ تھا۔ رخسار بھرے بھرے تھے ان کا تذکرہ وہ ہمیشہ
ٹماٹر نان کے نام سے کرتے تھے۔ ایک اور دوست تھے ذرا شاعر مزاج تھے۔ عشق و عاشق
کی باتیں کرتے رہتے تھے ان کا تذکرہ وہ ہمیشہ اس طرح کرتے کہ کیا حال ہے۔ ہمارے
عاشق حسین کا۔ اکرم نے ان کا نام عاشق حسین رکھ چھوڑا تھا۔ فقرہ چست کر کے یا مذاق
سے لطف لے کر اور قہقہہ بلند کر کے وہ مخاطب کا ہاتھ یا بازو داد دینے کے انداز میں
پکڑ لیتے تھے یہ ان کے جذباتی خلوص کا اظہار تھا۔ ان باتوں کو بیان کرنے سے میرا مقصد یہ
ہے کہ اکرم کوئی زاہد خشک، حس ظرافت سے عاری سنیاسی یا جذبات سے مبرا درویش نہ تھے وہ
جذبات سے مبرا نہیں جذبائیت سے مبرا تھے۔ انکے جذبات انکے قابو میں تھے وہ جذبات کے قابو میں نہ تھے۔ وہ
جو حالی نے کہا ہے فرشتہ سے بڑھکر ہے انسان بننا۔ اکرم ایک انسان تھے یہی ان کی عظمت تھی۔

اکرم کے خطوط میں زندہ دلی اور شگفتہ دلی کے شگوفے

جیسا کہ کرنل اکبر نے کہا۔ اکرم کی حس مزاح بھی بیدار تھی۔ ایک نارمل انسان کی طرح دوستوں
کی محفل میں یا بے تکلف دوستوں کو لکھتے ہوئے مزاح و ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑتے
رہے تھے اپنے چچازاد اصغر ملک سے ان کی بے تکلفی کی دوستی تھی ان کے نام لکھے ہوئے
اکثر خطوط میں مزاح کی چاشنی ہے۔ کہیں کہیں نوجوانوں کی سی شوخی بھی ہے۔ اصغر ملک
کے نام ان کے خطوط سے اکرم کی شخصیت کا ایک دلچسپ اور خوشگوار پہلو سامنے آتا ہے
جس کی روشنی میں ان کے نشانِ حیدر کی چمک بڑھ جاتی ہے۔ یہ نشان حیدر کسی سادھو، زاھد
خشک، تارک الدنیا درویش نے نہیں لیا تھا بلکہ ایک ایسے نوجوان نے لیا تھا جو اس دنیا
کے رنگ و بو سے بھی واقف تھا فرق صرف تھا کہ اس کا قلب بھی بیدار تھا۔ ضمیر لالہ میں
چراغ آرزو بھی روشن تھا۔

اکرم ۱۶ ر اگست ۱۹۶۸ء کے خط میں اصغر ملک کو ایسٹ پاکستان سے لکھتے ہیں۔

۱۴ ر اگست کو صبح جب میں سلہٹ سے واپس نواب گنج پہنچا تو میز پر دو لفافے پڑے تھے۔ اوپر نظر پڑتے ہی پہچان لیا۔ حفیظ کا خط تھا۔ جس کا کئی دنوں سے انتظار تھا اور عام حالات میں، میں فوراً اسے پڑھنے بیٹھ جاتا، لیکن جب دوسرا لفافہ دیکھا تو ایڈریس پڑھ کر خوشی سے ہمارے نیچے سے زمین نکل گئی، معلوم نہیں خوشی میں پاؤں کے نیچے سے زمین کا نکلنا کہاں تک درست ہے۔ لیکن ہے یہ حقیقت، اس وجہ سے عرض کر رہا ہوں۔ کیوں سننے کو بے تاب ہو رہے ہیں بھئی یہ تو ہمارے اپنے گھر کی بات تھی خیر اگر آپ ضد کرتے ہیں تو بتائے دیتا ہوں۔ دوسرا لفافہ مسز کیپٹن اکرم کے نام تھا، کیوں خوش ہونے کی بات تھی۔ یا نہیں؟ اس حالت میں ہم حفیظ کا خط تو بھول ہی گئے۔ جلدی سے مسز کا لفافہ کھولا۔ گو غلط کام تھا۔ کیونکہ دوسرے کا خط کھولنا اخلاقاً بری بات ہے لیکن وہ تو مسز اکرم کے نام تھا۔ معلوم ہوا کہ آزادی کی اکیسویں سالگرہ کی خوشی میں گورنمنٹ کالج ایک تقریب منا رہا ہے اور اس میں شمولیت کے لئے مسز کیپٹن اکرم کو دعوت نامہ ارسال کیا گیا تھا۔ تقریب کا تو کیا سوچنا تھا خوشی اس بات کی ہوئی کہ چلو ہماری تین دن کی غیر حاضری میں کوئی محترمہ تشریف لائی ہیں اور وہ بھی گھر کی مالکہ بننے کے لئے کیوں خوش ہونے کی بات نہیں ہے؟ آپ کو تعجب کس بات کا ہو رہا ہے۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ بغیر تکلیف خرچ اور محنت کے ایک اہم مسئلہ حل ہو گیا۔ نوکروں کو اطلاع کئے بغیر گھر میں محترمہ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہ تو ایسے غائب تھیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ، جب یقین ہو گیا کہ تلاش بے کار ہے تو جلدی سے نوکروں کو اکٹھا کیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی، لیکن اس تفتیش سے بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ محترمہ پرنسپل صاحبہ کے دعوت نامے کی صداقت سے انکار کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی آنکھوں اور نوکروں کی زبانوں پر یقین کرتے ہوئے یہ ماننا پڑا کہ یہ خبر کسی

دشمن نے اڑائی ہے۔ خیر ہم نے بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ محترمہ پرنسپل صاحبہ سے امداد طلب کی جائے ممکن ہے وہ مسز اکرم کی تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ دن بھر تو اسی سوچ بچار میں گزر گیا اور شام کو ہم نے محترمہ پرنسپل صاحبہ کے نام ایک خط لکھ دیا جس میں جہاں ان کا شکریہ ادا کیا وہاں ان سے ایک محترمہ ڈھونڈنے میں مدد دینے کے لئے درخواست بھی کی۔ معلوم نہیں عرضی منظور ہوتی ہے یا نہیں لیکن آپ ہمارے فیصلے کی داد ضرور دیں گے۔" اکرم کا یہ پورا خط زندہ دلی اور شوخی سے بھرا ہوا ہے۔ اصغر ملک نے کہیں اپنے خط میں پوچھا ہو گا کہ راجشاہی لوگ کیسے ہیں رنگ و روپ کیسا ہے اس کے جواب میں اکرم کا قلم ذرا شوخ ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

آپ نے پوچھا ہے کہ یہ لوگ سانولے ہیں، کالے ہیں؟ کسی حد تک آپ کی آبزرویشن ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ اس خطے کی خوبصورتی تک نہیں پہنچ سکی۔ گورے اور صحیح معنوں میں خوبصورت، لوگوں کی کمی نہیں ۔۔۔۔ راجشاہی یونیورسٹی کا شام کو ایک گھنٹہ کیلئے چکر صحت کے لئے مفید ہے۔ پشاور یونیورسٹی کی طرح یہ یونیورسٹی بھی شہر سے پانچ، چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ خوبصورت علاقہ ہے خوبصورت درختوں، باغوں اور دل کو لبھا جانے والی گلیوں کی کمی نہیں ہے۔ ہفتہ میں ایک چکر آنکھوں کیلئے فائدہ مند ہے لیکن روزانہ ایک چکر دل کے مریضوں کے لئے بہت سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔"

ایک خط میں راجشاہی یونیورسٹی کے طلبہ کی طرف سے ایک دعوت اور اس کے انجام کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

"کچھ ویسے ہی نواب گنج چھوڑنے کو طبیعت نہیں کر رہی تھی اس لئے ہم نے حیلے بہانے کرنے شروع کر دیئے لیکن طالب علموں کا اصرار تھا کہ میں دعوت میں ضرور شرکت کروں اس

کش مکش میں کافی وقت گزر گیا۔ ہمارے دعوت قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہوگیا اور اس سے پہلے کہ ہم وہاں پہنچتے ان لوگوں نے مرغن غذائیں تو ہضم کر لیں اور ہڈیاں گننا ہمارے حصے میں آیا۔ خیر اچھا ہوا کہ ہم دیر سے پہنچے سنا ہے کہ کھانا اچھا نہیں تھا بہت لوگوں کے پیٹ میں ابھی تک درد ہو رہا ہے۔ دیکھیں کیا رنگ لاتا ہے۔"

آگے چل کر پنجرے کی مینا کی یوں تصویر کھینچتے ہیں۔

"نیچے صحن میں مینا السلام علیکم اور بسم اللہ سیکھنے کی کوشش کر رہی ہے میرا بیٹا مین اس کا دوست ہے۔ بھئی بچی ہے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ سیکھ جائے گی۔ فی الحال اللہ ہو مینا پھر تی ہے۔"

عید قربان کے لکھے ہوئے خط کی تازگی دیکھئے۔ "کیسی سہانی صبح ہے موسم بہت اچھا ہے اور ان چڑیوں نے شور و غل کیسا مچا رکھا ہے۔ ذرا غور سے سنیں۔ پہلے تو اس قدر شور نہیں سناتی ہیں! کیا کہا؟ عید مبارک کہہ رہی ہیں۔ ہاں بھئی کیوں نہیں۔ وہ بھی تو ہماری خوشیوں میں شریک ہیں؛ ورنہ تو ..... یہ شور صرف چڑیوں کا نہیں ہو سکتا۔ ایک آدھ بار بکری کی آواز بھی آجاتی ہے۔ اللہ جانے اس کو خبر ہے کہ نہیں جلد ہی وہ اللہ کو پیاری بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر قربان ہونے والی ہے۔"

فروری ۱۹۶۹ء کے خط میں مشرقی پاکستان میں نواب، گنج نامی قصبوں کی کثرت کی یوں توجیہہ کرتے ہیں۔

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان کے اس خطے میں نوابوں کی بھر مار تھی جس کی وجہ سے قدرتی طور پر یہاں نواب گنج کا وجود میں آنا لازمی تھا لیکن نوابوں کی تعداد کے لحاظ سے چند ایک نواب گنج سے کام نہیں چلتا تھا لہٰذا نواب گنج کی تعداد بڑھتی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں اور میدانوں میں انقلاب اور ترقی ظہور پذیر ہوئی وہاں نواب گنج متاثر ہوئے

بغیر نہ رہ سکا۔

اب تک جو اقتباسات ہم نے نقل کئے ہیں وہ مزاح اور لفظی اور معنوی ظرافت کی مثالیں ہیں۔ اب ایک لطیف طنز کی مثال بھی دیکھئے۔ "کل میں ۱۱ رجون کو جنگ اخبار دیکھ رہا تھا۔ ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ روپے کے نوٹوں کی بے حرمتی دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ کراچی کے لوگ اتنے بے مروّت ہوگئے ہیں کہ اتنی پیاری چیز کو گندے پانی کے نالوں کی نذر کر رہے ہیں اللہ انہیں سمجھے!

اکرم اپنے گھر والوں کی نظر میں

ایک مشہور فکر انگیز قول ہے کہ میدان جنگ کا ہیرو بھی وہی ہوتا ہے جو اپنے گھر میں اپنی روز کی زندگی میں بھی ہیرو ہو۔ یہ قول اکرم شہید پر بھی صادق آتا ہے۔ اکرم باہر کے لوگوں کی نظر ہی میں ہیرو نہ تھے بلکہ اپنے گھر میں بھی اپنے والدین، اپنے بہن بھائیوں کی نظر میں بھی قابل عزت اور قابل احترام تھے۔

ماں کی باتیں

ماں کی محبت اپنی جگہ، لیکن وہ اپنی اولاد کے کھرے کھوٹے کو خوب پہچانتی ہے۔ اس لئے ہم نے سب سے پہلے اکرم کی والدہ ماجدہ عائشہ بی بی سے انٹرویو لیا۔ وہ نکا کلاں سے اپنی بیٹی مختار بیگم کے یہاں جہلم آئی ہوئی تھیں۔ ہم نے ان سے وہیں ملاقات کی۔

سوال:۔ اماں جی، یہ فرمائیے شہادت سے پہلے اکرم شہید کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ بھی ہوا جس سے آپ کو اندازہ ہوا ہو کہ آپ کا بیٹا غیر معمولی انسان ہے۔

جواب:۔ نہیں۔ بظاہر ایسی کوئی بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ یہ میرے سارے بچوں میں زیادہ فرمان بردار اور زیادہ خدمت گزار مسکین تھا لیکن ایک بار ہمارے گاؤں کے ایک

بزرگ نے ضرور ایک ایسی بات کی تھی جس نے مجھے کچھ حیران بلکہ پریشان کر دیا تھا۔

سوال :۔ وہ کیا؟

جواب :۔ ہمارے گاؤں نکے میں ہزارے کے ایک بزرگ گل بادشاہ رہتے تھے جو اب حق ہو گئے ہیں یہ دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے اکرم گھر پر چھٹی آیا ہوا تھا۔ جب وہ جمعے کی نماز کے لئے مسجد میں پہنچا تو پیر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے گوڈے کو ہاتھ لگایا جس طرح کسی بڑے کی تعظیم کی جاتی ہے۔ اکرم منع ہی کرتا رہ گیا اور بہت شرمندہ ہوا نماز کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ آج یہ واقعہ ہوا ہے میں تو سنتے ہی ڈر گئی۔ کہاں پیر فقیر اللہ والے اور کہاں ہم گنہگار۔ بہرحال میں نے اس سے کہا، جا، جا کر معافی مانگ اور کچھ نذر گزار۔ چنانچہ شام کو وہ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی مانگی۔ پیر گل جی نے صرف اتنا کہا۔ "بچو، میں نے تجھے سلام نہیں کیا۔ مجھے تیری پیشانی پر جو چیز نظر آئی ہے اسے سلام کیا ہے۔ جا بچے جا شکر کر اللہ تجھ سے بہت راضی ہے۔

سوال :۔ اماں جی۔ آخر میں یہ فرمایئے کہ آپ کو اپنے نامور بیٹے کی شہادت کی خبر کن حالات میں ملی؟

جواب :۔ شہادت سے کئی مہینے پہلے اکرم کا ایک خط آیا تھا کہ سی ایم ایچ منگلا میں ایک واقف کار زیر علاج ہیں ان سے میرا بیٹا جا کر ملا ان صاحب نے بتایا کہ میجر صاحب تو جان کی پرواہ کرتے ہی نہیں مورچوں میں اپنے سپاہیوں کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو لوہے کی ٹوپی بھی نہیں پہنتے ہم لوگوں کو بڑی فکر ہوتی۔ چنانچہ میں نے اپنے داماد ملک محمد حنیف سے خط لکھوایا کہ ذرا احتیاط کریں اور اپنی جان کو اس طرح خطرے میں نہ ڈالیں۔ اس کا جواب آپ نے پڑھا ہو گا۔ بڑے حوصلے کا خط تھا۔ لیکن مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کچھ کر گزرے گا۔ پھر جب دسمبر ۱۹۷۱ء کی شروع تاریخوں میں خبر آئی کہ ہلی کا کمانڈر مارا گیا تو میرے دل نے فوراً کہا لو اپنا اکرم شہید ہو گیا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس وقت میرا بڑا بیٹا رشید میرے ساتھ بیٹھا تھا وہ مجھے تسلیاں دینے لگا، "اکرم بہت سے میجروں کا نام ہے

تم گھبراؤ نہیں میں نے کہا گھبراؤں کیوں نہیں میرے تو دل کی آواز ہے اور دعائیں کر کے بین کرنے لگی۔ رشید بولا میں جہلم سے اخبار لاتا ہوں تو تمہیں تسلی ہو گی۔ ابھی وہ گھر سے نکلا ہی تھا کہ ریڈیو اخبار والے آگئے اور ساری خلقت جمع ہو گئی۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں دنیا کہاں ہے۔

سوال:۔ اب آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟

جواب:۔ وہی جو ایک ماں محسوس کرتی ہے جس کا سب سے لاڈلا بچہ نہ رہے۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اسے نہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے اور نہ ہی اپنے ہاتھوں سے دفن کر سکے۔ اب ہم فاتحہ پڑھیں تو کہاں پڑھیں؟ لیکن دوسرے لحاظ سے مطمئن ہوں کہ میرا چاند اس ملک و قوم کے کام آیا۔ میری اولاد، میری جان، میرا مال پاکستان پر قربان۔

میں اکرم کو لاڈ سے اکو کہا کرتی تھی اکو کو شہادت کی بڑی آرزو تھی وہ جب کبھی گھر آتا تو مجھ سے کہتا کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو خدا کی راہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔ میرا اکو پاکستان کا بیٹا تھا پاکستان کے کام آیا۔

باپ کی یادیں

میجر اکرم شہید نشان حیدر کے والد حاجی سخی محمد ملک اس وقت اسّی کے پیٹے میں ہیں عمر کے لحاظ سے صحت اچھی ہے۔ اعوانوں کی بہترین روایات کے امین ہیں۔ دین سے ان کا تعلق رسمی نہیں قلبی ہے۔ ہم نے سخی محمد صاحب سے جو باتیں پوچھیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

سوال:۔ حاجی صاحب آپ کے عظیم بیٹے اکرم کے بارے میں اور بہت سی باتیں تو ہم نے آپ کے گھر کے دوسرے افراد سے معلوم کر لی ہیں آپ کو کچھ زحمت دینا چاہتے ہیں۔

جواب:۔ پوچھیے۔ میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔ ذرا زور سے بولیے۔

سوال :۔ پہلے یہ فرمائیے بچپن اور جوانی میں اکرم کے نماز روزے کا کیا حال تھا؟

جواب :۔ نماز روزہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے گھر کی چیز ہے۔ سب اس کے پابند ہیں وہ بھی تھا میرے دو بیٹے حفیظ اور افضل ماشاء اللہ حافظ ہیں اکرم حافظ تو نہ تھا۔ لیکن قرآن پابندی سے پڑھتا تھا۔

سوال :۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ کا تہجد بھی قضا نہیں ہوتا ہے تو ذاتی سی بات، لیکن اگر نامناسب نہ ہو تو فرمایئے کہ آپ تہجد کب سے پڑھ رہے ہیں؟

جواب :۔ آپ پوچھتے ہیں تو بتانا پڑتا ہے کہ ۱۹۳۷ء سے تہجد پڑھ رہا ہوں۔

سوال :۔ اکرم تہجد پڑھتے تھے؟

جواب :۔ پہلے تو نہیں لیکن کمیشن کے بعد کپتان بن کر تہجد پڑھنا شروع کر دیا تھا جب اکرم سیالکوٹ میں تھا تو ایک بار میرا چھوٹا بیٹا حفیظ اس سے ملنے گیا اس نے آ کر بتایا کہ بھائی نے تہجد پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

سوال :۔ اکرم بچپن میں کون سا کھیل شوق سے کھیلتے تھے؟

جواب :۔ جب چھوٹا تھا تو گاؤں میں کبڈی ہی کھیلتا تھا کے جی آر کے زمانے سے ہاکی کھیلنے لگا۔

سوال :۔ اب اکرم کے کردار کی بات کرتے ہیں یہ فرمایئے کہ گھر میں اکرم کا رویہ کیسا ہوتا تھا؟

جواب :۔ بہن سے بہت پیار تھا۔ ہمارا بہت ادب کرتا تھا۔ کبھی اس نے اونچی آواز سے بات نہیں کی۔ میرا بیٹا رشید ذرا غصے کا تیز ہے جب کبھی وہ آواز اونچی کرتا ہے تو اکرم اس کو بھی کہتا۔ بھائی آہستہ بولیئے ادب کے ساتھ۔ اکرم نے ہماری بہت خدمت کی۔ بہت فرمانبردار تھا۔ کمیشن کے بعد گھر ضرورت سے زیادہ پیسے دیتا تھا۔ کہتا جب کسی ضرورت مند کو دیا کرو تو واپس نہ مانگا کرو ہمارے پاس اللہ کا دیا اب بہت کچھ ہے۔ اکرم نے بہن کی بھی بہت خدمت کی اسے جہلم میں زمین خرید کر دی اور اس پر دو تین کمرے بھی بنوا دیئے ورنہ مختار کو کرائے کے مکان میں رہنے کی بڑی تکلیف تھی۔

اکرم نے بھائیوں کا بھی بہت کیا عبدالقیوم آٹھ جماعت پڑھ کے دو سال گھر بیٹھا رہا۔ میں جہلم میں اس کی پڑھائی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جب ۶۳ء میں اکرم لیفٹیننٹ بنا تو اس نے پہلا کام کیا کہ قیوم کو اور حفیظ کو جس نے اسی سال آٹھویں پاس کیا۔ جہلم اسکول میں داخل کرا دیا اور برس ہا برس تک دونوں کی پڑھائی کے اخراجات خود برداشت کرتا رہا میں نے کہا۔ بیٹے اب اپنا بھی گھر بسانے کی تیاری کرو لیکن وہ شادی کو ٹالتا ہی رہا۔ کہتا تھا کیا جلدی ہے۔ پہلے چھوٹے بھائی پڑھ لیں اور آپ دونوں حج کر لیں تو پھر سوچوں گا۔

سوال:۔ اکرم کی فیاضی اور دیانت داری کا کوئی واقعہ بھی یاد ہے آپ کو؟

جواب:۔ ایک نہیں بہت سے واقعات ہیں۔ جب ۶۸ء میں اکرم کی پوسٹنگ ایسٹ پاکستان رائفلز میں ہوئی اور وہ جانے سے پہلے گھر آیا تو گاؤں میں لوگوں نے کہا اکرم بنگال بڑا بکس لے کر جانا وہاں پیسہ بہت ملتا ہے۔ خوب جمع کرنا۔ اکرم نے کہا میں ۳۷ روپے ماہانہ پر بھرتی ہوا تھا اب ۹۰۰ روپے ملتے ہیں۔ اگر ۹۰۰ سے پیٹ نہیں بھرا تو زیادہ سے کب بھرے گا۔ بنگال جا کر اکرم نے بنگلہ سیکھ لی تھی اور بنگالیوں سے خوب گھل مل گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ وہاں ان کی حالت پر کڑھتا تھا بتایا کرتا تھا کہ ہندو بنیئے غریب مسلمان کاشتکاروں کو خوب لوٹتے ہیں پہلے اگر پٹ سن بارہ روپے من میں سودا کرتے ہیں تو بمشکل آٹھ روپے دیتے ہیں۔ ای پی آر کی ملازمت کے زمانے میں ونگ کمانڈر تھا اور راجشاہی میں اسکا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ایک بڑا گھر اسے ملا ہوا تھا۔ گھر میں ایک مائی رکھی ہوئی تھی۔ جب اکرم ای پی آر سے واپس آنے لگا تو وہ مائی اکرم کے سامنے بہت روتی اکرم نے پوچھا مائی جی کیوں روتے ہو جب میرا تبادلہ ہوتا ہے تو میری ماں کبھی نہیں روتی میرے بچے تیری ماں کو امید ہوتی ہے تو پھر آ ملے گا لیکن مجھے امید نہیں کہ میں پھر کبھی تجھ ایسے نیک بندے کو کبھی دیکھوں گی۔ اس لئے روتی ہوں۔

سوال:۔ کوئی اور واقعہ؟

جواب:۔ ۱۷ء میں جب اکرم دوبارہ مشرقی پاکستان گیا اور ملٹری ایکشن شروع ہوا تو اکرم اپنی کمپنی کے جوانوں کو تاکید کرتا تھا کہ کسی کو ناجائز تکلیف نہیں دینی۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرنی۔ جب ۷۳ء میں جنگی قیدی واپس آئے اور ۴ ایف ایف آر لاہور میں دوبارہ جمع ہوئی تو انہوں نے مجھے بلایا تھا۔ اس موقعہ پر اکرم کے بیٹ مین نے مجھے بتایا کہ ہلی کے محاذ پر وہ کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے کمان ہیڈ کوارٹر میں نہیں بیشتر وقت جوانوں کے ساتھ مورچوں میں گذارتے تھے اور جوانوں کو کھانا دانا پہنچانے میں خود مدد کرتے تھے۔ کوئی زخمی ہو جاتا تو خود اٹھا کر پیچھے پہنچاتے تھے وہیں لاہور میں مجھے کسی نے بتایا نام یاد نہیں رہا کہ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تو اکرم نے خود اسے بوگرہ ہسپتال پہنچایا پھر اسی روز رات کے بارہ بجے جیسے تیسے وقت نکال کے ہسپتال پہنچے اور اس کی پوچھ گچھ کی جولائی اگست ۷۱ء کا واقعہ ہے کہ اکرم نے خط لکھا کہ فلاں صوبیدار میجر زخمی سی ایم ایچ منگلا آیا ہے اس کو جا کر دیکھیں اور ان کا حوصلہ بڑھائیں۔ جب میں ان صاحب سے ملا تو انہوں نے بتایا کہ اکرم صاحب تو شیروں کی طرح ایک مورچے سے دوسرے مورچے کمپنی کے جوانوں کے پاس آتے جاتے ہیں۔ شیلنگ کی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ سن کر میں نے اور حنیف نے اکرم کو خط لکھے کہ احتیاط کیا کرو اس کے جواب میں اس نے وہ خط لکھا جو چھپ چکا ہے۔

سوال: آخر میں دو ایک سوال اور، اپنے بیٹے اکرم کی شہادت کی خبر آپ نے کیسے سُنی؟

جواب:۔ جب اکرم کی شہادت کی خبر آئی تو میں گھر پر نہیں تھا۔ اپنے کنویں پر کام کر رہا تھا جب میں واپس آیا دیکھا کہ گھر کے سامنے ایک خلقت جمع ہے۔ گھر کی اور گاؤں کی عورتیں کھڑی ہیں اور بین کر رہی ہیں۔ سینہ کوٹتی اور بال نوچتی ہیں۔ مرد بھی سسکیاں بھر رہے ہیں جب مجھے پتہ چلا کہ میرا بیٹا اکرم شہید ہو گیا تو میں نے عورتوں سے کہا آپ سب بیٹھ

جائیں کھڑے ہوکر اس طرح نہ روئیں اکرم شہید ہوا ہے وہ مرا نہیں زندہ ہے میں نے بڑی مشکل سے ان کو بٹھایا۔ اکرم کی ہمشیرہ مختار کسی طرح نہیں بیٹھتی تھی رو رو کر کہتی میرا شیر میرا ویر گزر گیا۔ میں کیسے صبر کروں۔ افسوس تو مجھے بھی تھا۔ جوان اولاد کے گزرنے کا غم کسے نہیں ہوتا لیکن مولا کریم کی مرضی، مرنا سب کو ہے شہید کی موت کی بات ہی کچھ اور ہے۔

سوال:۔ اب آخری اور سوال اکرم کی شہادت کا کبھی کوئی اشارہ بھی اللہ کی طرف سے ہوا تھا؟

جواب:۔ اشارہ کہو یا کچھ کہو شہادت سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ اکرم نے جمعہ کی نماز کے بعد گاؤں کے پیر گل شاہ صاحب سے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھائے تو انہوں نے خود جھک کر اکرم کے پاؤں کو ہاتھ لگائے اکرم ان کو روکتا ہی رہ گیا۔ اس نے پریشان ہو کر یہ واقعہ اپنی ماں سے بیان کیا۔ ماں پر بڑا اثر پڑا۔ انہوں نے دس روپے دیئے اور کہا یہ پیر جی کی نذر کر اور معافی مانگ جب شام کو اکرم پیر گل شاہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے صرف اتنا کہا جا۔ بیٹے جا۔ کوئی بات نہیں۔ مجھے تیری پیشانی پر کچھ نظر آیا تھا۔ شہادت کے بعد یہ راز کھلا کہ وہ نور شہادت تھا۔

ہمشیرہ مختار بیگم کی یادیں

سوال:۔ اکرم آپ سے کتنے چھوٹے تھے؟

جواب:۔ کوئی چھ سات سال۔ اماں کے علاوہ میں ہی گھر پر ہوتی تھی۔ میں ہی اکثر و بیشتر بھائی اکرم کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ جب بڑی ہوئی اور شادی وادی ہو گئی اور بھائی کو کمیشن مل گیا تو بھائی اکرم کے کرم کا دروازہ کھل گیا۔ کسی بھائی نے کسی بہن کا اتنا کم کیا ہوگا جتنا بھائی اکرم نے میرا کیا۔

سوال :- اس بات کی کوئی تفصیل ؟

جواب :- شادی کے بعد چند سالوں تک میرے حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ میرے دو بچے کچھ بیمار رہتے تھے اس وجہ سے میں بہت دکھی تھی۔ گھر کی آمدنی بھی بہت کم تھی۔ کرائے کا مکان تھا۔ پچاس روپے مہینہ جاتا تھا جو اس زمانے میں بہت تھا۔ اکرم کو میری پریشانیوں کا بہت احساس تھا وہ ہر طرح سے میری دلجوئی کرتے تھے۔ کمیشن کے بعد گھر کا کرایہ دیتے رہے پھر دس مرلے زمین خرید کر مکان بنوا کر دیا۔ جب چھٹی آتے تھے تو زیادہ تر میرے گھر ہی رہتے تھے۔

سوال :- تو پھر آپ ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کی عادات سے بھی خوب واقف ہونگی یہ بتایئے کہ ان کی پسندیدہ غذائیں کون سی تھیں ؟

جواب :- بچپن میں دودھ اور مکھن کا بہت شوق تھا۔ میں روٹی پر مکھن کی گولی رکھتی تو کہتے کہ اور دو، پوری روٹی پر مکھن لگاؤ۔ جب بڑے ہوکر میرے یہاں آتے تو بھنڈی گوشت شوق سے کھاتے تھے۔ پھلوں میں انگور اور مالٹا مرغوب تھا۔

سوال :- دو چار ایسے واقعات سنایئے جن سے یہ اندازہ ہو کہ وہ آپ سے بہت محبت کرتے تھے اور بہت عزت کرتے تھے ؟

جواب :- ایک مرتبہ وہ سیالکوٹ میں تعینات تھے انہیں خط کے ذریعے میری داڑھوں کی تکلیف کا پتہ چلا، خط ملتے ہی دوسرے دن جہلم چلے گئے اور مجھے ساتھ لے کر سی۔ ایم۔ ایچ جہلم گئے۔ اتفاق سے اسی روز ڈینٹل سرجن رخصت پر تھے اس لئے ہسپتال سے سیدھے ان کے گھر گئے۔ لیکن وہ گھر پر بھی نہ ملے۔ لہٰذا اس روز تو واپس ڈیوٹی کی خاطر سیالکوٹ چلے گئے لیکن دوسرے روز پھر جہلم آئے اور دوبارہ سی۔ ایم۔ ایچ میں علاج کیلئے لے گئے جب تک میری تکلیف ختم نہ ہوئی خط کے ذریعے حال معلوم کرتے رہے۔ یہ صرف میری ذات تک ہی محدود نہ تھا بلکہ بچوں کا بھی پورا خیال رکھتے تھے

عیدین یا دیگر تقریبات کے سلسلے میں کپڑے، دیگر تحائف لانا ہرگز نہ بھولتے تھے اگر خود نہ آ سکتے ہوں تو کسی کے ذریعے بھجوا دیتے تھے۔ ان کی ایک بھانجی کالج میں زیر تعلیم تھی اُن کے لئے انہوں نے مشرقی پاکستان سے لکھا تھا کہ اس کی تعلیم کا تمام خرچ میں خود برداشت کروں گا اسے چاہیئے کہ تعلیم جاری رکھے۔ جب تک وہ سیالکوٹ میں تعینات رہے تقریباً ہر ہفتے رات کو ۹-۱۰ بجے کے قریب پہنچ جاتے تھے اور دروازے پر دستک کا طریقہ بھی مخصوص تھا۔ جس سے ہمیں پتہ چل جاتا تھا۔ ہم ان کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔ اگر انہیں والدین کے پاس جانا ہوتا جو کہ اکثر ماہ میں ایک آدھ مرتبہ ہوتا یہاں ٹھہرے بغیر ہرگز نہ جاتے تھے۔ ہر مرتبہ مالی امداد کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھتے تھے۔ پشاور، لنڈی کوتل میں قیام کے دوران بھی وہ اکثر یہاں آتے رہتے تھے خط باقاعدگی سے لکھتے اور بچوں کو تعلیم وغیرہ کے سلسلہ میں اپنی ہدایات دیتے رہتے۔

سوال :- دو چار ایسے واقعات یا باتیں بتایئے جن سے ان کی رحمدلی اور ہمدردی اور بزرگوں کی تعظیم کا اندازہ ہوتا ہو۔

جواب :- ایک دفعہ عید کے موقع پر جہلم آئے اور عید پر یہاں بھی ٹھہرے، ہمارے ہمسائے میں ایک خاندان بڑی کسمپرسی کی حالت میں تھا، ان کے بچوں کو عید کے پیسے بھی دیئے اور انہیں اپنے ساتھ تفریح کے لئے دریائے جہلم کا نیا پل دکھانے کے لئے (جس کی تعمیر اس وقت شروع ہوئی تھی) ساتھ لے گئے اور انہیں فروٹ وغیرہ لے کر دیا۔ ایک مرتبہ انہیں اپنی نانی اماں کی بیماری کی اطلاع ملی۔ سیالکوٹ سے جہلم آئے اور ان کے لئے ادویات دکھانے پینے کی چیزیں خریدیں اور مجھے ساتھ لے کر ڈنگہ گئے اور ان کی تیمارداری میں مصروف رہے وہاں ایک مسجد کیلئے چندہ کی اپیل ہو رہی تھی انہوں نے رقم تو دے دی لیکن اپنا نام نہ بتایا جبکہ دوسرے لوگوں کے نام مشتہر ہو رہے تھے راستے میں ایک جگہ سے دو عورتیں بس میں سوار ہوئیں بس میں مسافروں کا اژدھام تھا۔ ان کو بیٹھنے کی جگہ بلکہ

کھڑے ہونے کی بھی مشکل سے جگہ ملی ان کو دیکھتے ہی فوراً اپنی سیٹ خالی کر کے ان میں بزرگ تر عورت کو اپنی جگہ دے دی۔ خود یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے کہ اگر ہم دوسروں کی ماؤں بہنوں کا احترام نہ کریں گے تو کل ہماری اپنی ماؤں بہنوں کا کون خیال کرے گا۔ بچپن میں پرائمری اسکول میں تعلیم کے دوران ان کے ایک ہم جماعت کے پاس کتابوں کے لئے پیسے نہ تھے۔ گھر میں اپنی والدہ کو کہا میرے اپنے جو پیسے رکھے ہوتے ہیں اس کو دے دیں تاکہ اپنی کتابیں خرید لے، دوسروں کے لئے ایثار کرنا بچپن سے ان کا شیوہ تھا۔ فوج میں ملازمت کے دوران ان کے دوستوں کی خاصی تعداد تھی اور ان سے اتنی محبت کرتے تھے کہ رخصت کے دوران بھی ان کی یونٹوں یا ان کے گھروں پر جا کر ملتے تھے۔ دوسرے لوگوں کے دکھ درد میں شرکت کرنا ان کا معمول تھا اور ان کی حتی الوسع مدد کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔

سوال:۔ آپ کا تو خیر ان کو اتنا خیال تھا ہی دوسرے بھائیوں اور والدین کے لئے کیا کرتے تھے؟

جواب:۔ چاروں چھوٹے بھائیوں کو بھائی اکرم ہی نے پڑھایا لکھایا ہے۔ والدین کے تو وہ بیحد خدمت گزار تھے۔

سوال:۔ اس کی کوئی مثال؟

جواب:۔ بے شمار ہیں۔ ایک بات بتاتی ہوں بڑے کفایت شعار تھے لیکن کمیشن کے بعد انہوں نے ایک ایک کر کے تین چار بیمہ پالیسیاں لے لی تھیں اور سب والدہ کے نام تھیں یعنی وارث کے خانے میں والدہ کا نام لکھوا دیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں جب ایسٹ پاکستان رائفلز میں جا رہے تھے تو لاہور میرے خالو کے لڑکے نے پوچھا وارث کے خانے میں اپنی بیوی کا نام کیوں نہیں لکھوایا تو کہنے لگے یار ہمارے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہے ہی نہیں۔

صوبیدار عبدالرشید سے انٹرویو

سوال :- صوبیدار صاحب آپ کا پورا نام کیا ہے ؟

جواب :- عبدالرشید ملک سگنل میں صوبیدار ہوں۔

سوال :- کالج میں آپ کب سے کب تک رہے۔

جواب :- میرا کالج نمبر ۱۵۰۷ ہے ،میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک کالج میں رہا۔

سوال :- اکرم شہید کب داخل ہوئے ؟

جواب :- میرے چھوٹے بھائی اکرم اگست ۱۹۴۸ء میں داخل ہوئے۔

سوال :- ملاقات تو ہوتی ہوگی ؟ اس زمانے کا کوئی خاص تاثر ؟

جواب :- ہاں۔ بھائی تھے ملتے ہی رہتے تھے۔ تاثر یہ ہے کہ اکرم کو ہاکی کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا میں کبھی کبھی سمجھایا بھی کرتا تھا کہ پڑھا بھی کرو۔ کھیل کے اسی زیادہ شوق کا نتیجہ تھا کہ اکرم ساتویں درجے کے سالانہ امتحان اپریل ۴۹ء میں فیل ہوگئے تھے۔

سوال :- کچھ یاد ہے آپ کو، اکرم کے کالج سے ۱۹۵۳ء میں جانے کی وجہ کیا ہوئی ؟

جواب :- اس زمانے میں جی۔ ایچ کیو کی طرف سے آئی ایس ایس کی ایک ٹیم آتی تھی جو لڑکوں کا افسر بننے کی موزینت کے لحاظ سے جائزہ لیتی تھی۔ اس میں ناکام ہونے کے بعد ۱۹۵۱ء میں ، میں آؤٹ ہوا تھا میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے انہوں نے کالج چھوڑا ہوگا۔

سوال :- کالج کے بعد اکرم کہاں گئے ؟

جواب :- وہ کالج سے براہ راست ۲ جولائی ۱۹۵۳ء کو اپنے والد کی رجمنٹ پنجاب کے سنٹر میں بوائز کمپنی میں بھرتی ہوگئے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد اسی سنٹر میں ریکروٹی کی۔

سوال :- آپ اکرم کی زندگی کے اس دور کے بارے میں کچھ تفصیل بتائیں گے ؟

جواب :- بوائز کمپنی میں اکرم کا ریکارڈ بہت شاندار تھا۔ وہ بوائز کمپنی کے کمپنی کمانڈر کے عہدے

تک پہنچے تھے۔بلوائز کمپنی سے نکل کر انہوں نے قاعدے کے مطابق پنجاب رجمنٹ
سنٹر میں دوسرے ریکروٹوں کی طرح ابتدا کی انہوں نے ریکروٹی سے پاس آؤٹ
ہوتے وقت بہترین نشانہ باز ہونے کی ٹرافی اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان
سے لی تھی اور بہترین ریکروٹ کا اعزاز بھی حاصل کیا تھا۔اس اعزاز کی علامت کے طور
پر ایک کین (بید) بھی ملا تھا۔یہ کین اب ہم نے آرمی میوزیم میں رکھوا دیا ہے۔
ریکروٹی پاس کر کے وہ ۸ پنجاب سے وابستہ ہوتے تھے جہاں وہ بہت جلد لانس نائیک
بنا دیئے گئے۔وہاں سے پی اے اسپیشل پاس کر کے وہ پی ایم اے گئے۔پی ایم اے کی طرف سے
انہوں نے ۱۹۶۳ میں انٹر اکیڈمی سپورٹس کراچی میں حصہ لیا۔ہاکی میں ان کی ٹیم جیتی۔پی
ایم اے سے انہوں نے ہاکی کلر لیا اور نشانہ بازی کی ٹرافی جیتی۔اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے
وہ پی ایم اے میں سارجنٹ لمبا کے نام سے مشہور تھے۔

سوال:۔آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

جواب:۔ہم چھ بھائی ہیں اور ایک بہن۔اکرم مجھ سے چھوٹے تھے وہ شہید ہو گئے ان سے چھوٹے
عبدالرزاق پوسٹ ماسٹر ہیں ان سے چھوٹا محمد افضل ملک ای ایم ای میں حوالدار ہے
ان سے چھوٹے کا نام عبدالقیوم ہے۔اکسائز اینڈ ٹیکسیشن کے محکمے میں سب انسپکٹر ہے۔سب
سے چھوٹا حفیظ اللہ ملک نیشنل بنک میں سیکنڈ افسر ہے۔بہن جو سب بھائیوں سے بڑی
ہیں محمد حنیف صاحب سے بیاہی ہیں جو سگریٹ فیکٹری میں ملازم ہیں۔

سوال:۔رشید صاحب اب یہ بتایئے کہ آپ کا اپنا تاثر کیا ہے؟ اپنے شہید بھائی کی کون سی
خصوصیتیں آپ کو نمایاں نظر آتی ہیں؟

جواب:۔اکرم شہید میں بہت سی نمایاں صفات تھیں۔لیکن جو صفت بہت ہی نمایاں تھی وہ
قربانی کرنے ایثار کرنے کی صفت تھی۔

سوال:۔آپ کچھ مثالوں سے اس کی وضاحت کرنا پسند کریں گے۔

جواب:- اکرم کے ایثار و قربانی کی مثالیں بے شمار ہیں پہلی بات تو یہ لیجئے کہ انہوں نے اپنی تمام آمدنی اور توجہ اپنے گھر والوں پر صرف کردی اور شادی کی عمر ہوتے ہوئے اور اچھے رشتے ملنے کے باوجود وہ ہر بار یہی کہتے پہلے بھائیوں کو پڑھاؤں گا والدین کو حج کراؤں گا۔ پھر شادی کروں گا۔ ہمارا گھر کچا تھا اس کو انہوں نے پکا کرایا۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں بھی اس پر کچھ نہیں تو بیس پچیس ہزار تو لگا ہو گا۔ بڑی بہن کے پانچ چھ بچے خرچ زیادہ۔ پریشان رہتی تھیں۔ انہیں جہلم شہر میں زمین لے کر دی اس پر دو تین کمرے بھی بنوا دیئے کہ ان میں رہیں اور کرائے کے بوجھ سے بچیں۔ اپنے تایا زاد بھائی کو بھی خاندانی کشیدگی کے باوجود چند ہزار قرض دیئے۔ سب بھائیوں کو نویں سے ایف اے تک پڑھایا ان کی تعلیم کے سارے اخراجات انہوں نے ہی برداشت کئے انہی کی کوششوں سے قیوم بی اے پاس ہے اور حفیظ بی ایس سی ان کی تعلیم کی بنیاد ان ہی نے رکھی تھی۔

اس کے علاوہ بھی جب کسی بھائی کو مزید کسی امداد کی ضرورت ہوتی دل کھول کر مدد کرتے خود میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا۔ ۶۵ء کی جنگ کے دوران میں کراچی میں پوسٹ تھا اور وہ سیالکوٹ سے آگے ظفر وال میں تھے میں نے کچھ پیسوں کے بارے میں لکھا وہ خط جب انہیں ملا تو فوراً بیٹ مین کو سیالکوٹ بھیجا اور کہا کہ کسی طرح مطلوبہ رقم کا انتظام کر کے رشید بھائی کو تار سے بھجوا دو چنانچہ مجھے تار کے ذریعے وہ رقم مل گئی۔

تنخواہ تو تقریباً وہ ساری کی ساری والدین کو دیتے تھے۔ اکرم کی دوسروں سے ہمدردی اور انفاق فی سبیل اللہ کے بھی ایک نہیں بہت سے واقعات ہیں۔

سوال:- اگر آپ ہمدردی اور شفقت کے دو چار واقعات سنا سکیں تو بہت اچھا ہو۔

جواب:- ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے کہ اکرم ملنے گھر آئے بارشیں ہو رہی تھیں۔ جہلم سے نکا کلاں کا راستہ ٹھیک نہیں تھا۔ اس لئے منڈی بہاؤالدین ہیڈ رسول سے دریا کو کشتی کے ذریعے پار کر رہے تھے۔ اس موسم میں ملاح کرایہ بڑھا دیتے ہیں اور مسافروں کو کشتی

بن بٹھاتے جاتے ہیں بیٹھتے وقت کرایہ نہیں مانگتے بیچ دریا میں پہنچ کر دو گنے تگنے وصول کرتے ہیں اس دن بھی ملاح نے یہی چال چلی۔ جب کشتی دریا کے بیچ پاٹ پہنچی تو اس نے تین گنے پیسے مانگے۔ مجبوراً مسافروں نے بھرے ایک غریب دکھوں کی ماری بڑھیا رہ گئی وہ کہاں سے دُگنے تگنے پیسے دیتی منت سماجت کرنے لگی ملاح نے دھمکی دی اٹھا کر دریا میں پھینک دوں گا اور آگے بڑھا۔ رونے لگی اکرم نے فوراً جیب سے پیسے نکالے۔ اس کا کرایہ ادا کیا مائی کو دلاسا اور دوسرے کنارے اترتے وقت اس کو پانچ روپے دیئے۔ اور ملاح کو سخت سست کہا۔

میں سگنل کور میں ہوں مجھے سگنل کے ایک آدمی نے بتایا جب وہ سگنل گروپ کے ساتھ اکرم کی کمپنی کے ساتھ ھلّی میں منسلک تھا تو وہ سگنل کے آدمیوں پر لینے دینے پیسے سے کافی مہربانیاں کرتے رہتے تھے۔ کہتے تھے تم لوگ دوسری کور کے ہو تمہاری خاطرداری ضروری ہے۔ اپنی یونٹ میں بھی بنکر کے نام سے مشہور تھے اپنا خرچ تو کچھ تھا ہی نہیں اس لئے افسروں سے لے کر جوانوں تک سب کو قرض دیتے رہتے تھے۔ برادری میں ایک رشتے دار کے مویشیوں کے باڑے کو آگ لگ گئی اکرم نے بن کہے کچھ رقم بھجوائی حالانکہ ۱۹۶۰ء میں پی ایم اے میں تھے اور تنخواہ زیادہ نہ تھی۔ اسی طرح ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ کسی کا مکان گر گیا نقصان ہوا اکرم نے فوراً مدد کی۔ صرف ایسے موقعوں پر وہ اپنے گھر والوں سے مشورہ نہیں کرتے تھے۔

سوال:۔ رشید۔ اب کچھ اکرم کی عادات پر روشنی ڈالیئے۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اندر کے انسان کو ظاہر کر دیتی ہیں کچھ ایسی باتیں بتایئے؟

جواب:۔ بزرگوں کا انتہائی ادب کرتے تھے افسر ہونے کے بعد انہوں نے اپنے انداز تعظیم کو نہیں بدلا اجنبی بزرگوں کو بھی خود سلام کرتے تھے۔ گھر میں جو بھی آتا اہتمام سے پہلے اُسے بٹھاتے خواہ اس کا سماجی درجہ اور عمر کچھ بھی ہو، افسر ہونے کے بعد بھی گھر کا کام کاج کرنے سے عار نہ تھا۔ خواہ وہ کوٹھے سے چارپائی آتارنا چڑھانا یا گائے بھینس کو چارہ

ڈالنا ہی کیوں نہ ہو۔

سوال :۔ کچھ ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کی عادات کے متعلق فرمایئے؟

جواب :۔ کوئی ٹھاٹھ باٹھ نہ تھا۔ کپڑے بہت سادہ پہنتے تھے اور اپنے لئے بہت کم کپڑے بنواتے تھے چائے سگریٹ بالکل نہیں پیتے تھے، لسّی سے شوق تھا پیتے تھے البتہ ایک نئی عادت تھی کہ صبح نہار منہ بیڈٹی کی جگہ موسمی پھل، مالٹا وغیرہ لیتے تھے ناشتہ وہی جو عام گھروں میں ہوتا ہے، پراٹھا، مکھن، لسّی ہاں انڈا بھی لیتے تھے۔ ہلی کے محاذ سے اپنی شہادت سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے اپنے ہاتھ سے کھینچی ہوئی آٹھ تصویریں بھیجی تھیں ان میں سے ایک تصویر کے پیچھے جو ہلی کے سامنے دشمن کے علاقے کی تھی لکھا تھا ہمارے خواب ۲۵ گز دور، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دشمن کے مورچے ان سے پچیس گز کے فاصلے پر تھے خواب کے لفظ سے اس علاقے کو فتح کرنے کی آرزو جھلکتی ہے۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر ان کے کیا جذبات تھے اس کا اندازہ اس عنوان سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے ہلی کے محاذ کی تصویر کے نیچے لکھا :۔

"یہ سرزمین ہماری ہے جب تک موت ہمیں اس سے جدا نہیں کر دیتی"

یہ فوٹو اور ان کی سرخیاں دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بھائی اکرم کا ارادہ شہید ہو جانے کا ہے۔

سوال :۔ اکرم کے مطالعے میں کون سی کتابیں رہتی تھیں؟

جواب :۔ شہید کو اسلامی تاریخ خاص طور پر واقعہ کربلا سے بڑی دلچسپی تھی شہدائے کربلا کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا کرتے تھے۔ شہادت کی خواہش ان کے لاشعور میں جاگزیں تھی۔ اکرم شہید نے جو خطوط مشرقی محاذ سے اپنے عزیزوں کے نام لکھے ان سے آخری دم تک ملک کا دفاع کرنے کا عزم جھلکتا ہے۔ بلکہ ان سے شہادت کی آرزو جھلکتی نظر آتی ہے۔ مثلاً یہ خط میری جان، ملک و قوم سے زیادہ قیمتی نہیں"

سوال :- آپ کی نظر میں اکرم کے کردار کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں ؟

جواب :- اچھے اور بڑے آدمیوں کی زندگی میں اچھائی اور بڑائی کا کوئی ایک پہلو نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ شہید کے کردار کی امتیازی صفت احسان اور ایثار کا وصف تھا جب چھوٹے تھے تو ساتھیوں کے ساتھ احسان کرتے رہے اسکول گئے تو استادوں کے لئے ایثار کیا۔ ملٹری کالج میں اپنے ساتھیوں کے لئے قربانی کا رویہ روا رکھا جب افسر بنے اور آمدنی کی صورت بنی تو رشتے داروں اور بے سہارا لوگوں کے کام آئے۔ کافی عمر ہو جانے اور اچھے رشتے ملنے کے باوجود شادی نہیں کی کہ پہلے والدین کو حج کرا دیں اور بھائیوں کی تعلیم پوری کرا دیں بحیثیت افسر کے اپنے یونٹوں میں قربانی و ایثار کرتے رہے اور آخر میں سب سے بڑا ایثار یہ تھا کہ اپنی جان ہی ملک و ملت پر قربان کر دی انہیں قربانی اور ایثار کی قدریں اپنے گھر سے ملی تھیں۔ ان کے والدین صرف نام کے مذہبی ہی نہیں دل کے مذہبی بھی تھے۔ انہوں نے اسلامی ماحول میں سانس لی ان کی گھٹی میں اسلام پڑا تھا۔ انہوں نے گویا ماں کے دودھ کے ساتھ اسلام پیا تھا۔ پرہیز گار اور دیندار ماں کی تربیت ہی کا نتیجہ تھا اسلام اکرم کی رگ و پے میں سما گیا تھا۔ اکرم شہید کے ایک دوست مظہر حسین کا بیان ہے کہ اسلام اور پاکستان کی محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ قومی سطح پر سوچتے تھے اور ہر بات قومی نقطہ نظر سے کرتے تھے۔ دنیوی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم حاصل کرنے کی سختی سے پابندی کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

دیانت داری اور اصول پرستی

اکرم شہید کی خاصیت تھی کہ وہ بد دیانتی کسی شکل میں کسی عہدے میں برداشت نہیں کرتے تھے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اگر وہ بد دیانتی کا مرتکب ہوتا تو وہ اس سے ٹکرا جاتے

اسے کبھی معاف نہ کرتے اس معاملے میں وہ بہت زیادہ انتہا پسند تھے۔

چھوٹے بھائی محمد افضل ملک کے تاثرات

سوال :۔ افضل۔ آپ نے اکرم شہید کے بچپن کے جو واقعات سنائے وہ تو ہم نے شہید کے حالات زندگی میں درج کر لئے ہیں اب کچھ ایسے واقعات بتلایئے جن سے شہید کے کردار کا کوئی پہلو اُجاگر ہوتا ہو۔

جواب :۔ بھائی جان میں ایک خاموش جرأت تھی جس کا اظہار روزمرہ کے معمولات میں ہوتا رہتا تھا۔

سوال :۔ مثلاً؟

جواب :۔ مثلاً یہ کہ ایک بار ایسا ہوا کہ گرمیوں کا موسم تھا ہم سب لوگ اوپر چھت پر سو رہے تھے آٹھ نو بجے میں سویا تھا لیکن رات گئے مجھے محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی اور سو رہا ہے۔ خیال آیا کہ والدہ نے بھائی عبدالرزاق کو میرے ساتھ لٹا دیا ہو گا لیکن صبح کو جب اچھی طرح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بھائی اکرم میرے ساتھ سو رہے ہیں۔ وہ رات کو گھر سے سات آٹھ میل دور دراز سے اکیلے چل کر گھر آئے تھے۔ رات کے وقت راستہ جنگلی سوروں کی آماجگاہ ہوا کرتا تھا۔ اسلئے اکیلے دوکیلے کوئی ادھر سے گزرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ بھائی جان میں ایک خاموش جرأت تھی جس کا اظہار روزمرہ کے حالات و واقعات میں بھی ہوتا رہتا تھا۔

سوال :۔ کوئی اور قابل ذکر صفت جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟

جواب :۔ ایثار الشعاری اور مال و دولت سے بے نیازی بھی میں نے ان کے اندر بدرجہ اتم دیکھی۔

سوال :۔ اس کی کوئی مثال۔

جواب :۔ ایثار گویا ان کی زندگی کا عنوان تھا۔ کبھی وہ اچانک گھر چھٹی پر آجاتے تو گھر پر جو دال ساگ بھی پکا ہوتا بڑے شوق سے کھا لیتے اپنے لئے نہ کسی کھانے کی فرمائش کرتے نہ کسی کو خصوصی اہتمام کرنے دیتے۔ بلکہ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ وہ دیر سے گھر پہنچے اور کھانا ختم ہو گیا تو

وہ اپنے لئے ایک روٹی بھی نہ ڈالنے دیتے اور بغیر کچھ کھائے پیئے سو جاتے۔ کہا کرتے تھے مجھے بھوکا سونے سے وہ تکلیف نہ ہوگی جو پکانے کی تکلیف دینے سے ہوگی۔ والدین کی خدمت اور فرماں برداری کی عادت بھائی جان میں کمیشن سے پہلے ہی تھی کمیشن کے بعد اس میں دو چند اضافہ ہوگیا۔

سوال :۔ اکرم شہید نے پانچ سال ملٹری کالج میں تعلیم پائی گھر پر چھٹی آتے ہوں گے تو ضرور کالج کی باتیں کرتے ہوں گے۔ کالج کے بارے میں ان کی کوئی بات یاد ہے آپ کو؟

جواب :۔ کالج میں وہ بہت شوق سے داخل ہوئے تھے۔ چھٹیوں میں وہ کالج کی بہت دلچسپ باتیں بڑے شوق سے سناتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکرم کی شخصیت کو ابھارنے میں ملٹری کالج کا بڑا دخل تھا۔ کمیشن کے بعد بھی اکثر کہا کرتے تھے ملٹری کالج پاکستان کے بہترین اداروں میں سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کمیشن لینے کا جذبہ نظم و ضبط کا گہرا شعور اور اسلامی تاریخ سے لگاؤ انہیں ملٹری کالج ہی میں پیدا ہوا تھا۔

سوال :۔ یہ نتیجہ آپ نے کس واقعہ سے لگایا؟

جواب :۔ کالج پہنچنے کے دوسرے تیسرے سال سے جب کبھی وہ چھٹی پر آتے تو اپنے ساتھ ایک آدھ تاریخی کتاب ضرور لاتے۔ محمد بن قاسم اور خالد بن ولید کا نام میں نے پہلی بار ان ہی سے سنا تھا۔ خالد بن ولید ان کے ہیرو تھے۔ بھائی اکرم بہت سچے اور پکے مسلمان تھے ان کا ایمان عین الیقین کے درجے کا تھا اسلام اور پاکستان سے ان کی شدید محبت کا احساس ان خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے شہادت کے کچھ عرصے پہلے ھلی کے محاذ سے اپنے گھر والوں کو لکھے تھے ان کی شہادت کی تہہ میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔ شہادت مطلوب و مقصود مومن کی وہ ایک عملی تفسیر تھے۔

سوال :۔ افضل! ملٹری کالج ملک کی بہترین درسگاہوں میں سے ایک ہے۔ یہ رائے اکرم نے کب ظاہر کی تھی اور اس کا پس منظر کیا تھا؟

جواب:۔ ۱۹۵۲ء میں، میں نے بھی کالج میں داخلے کی کوشش کی تھی۔ تحریری امتحان میں پاس ہو گیا تھا۔ ان دنوں ۸ پنجاب میں انہیں بھرتی ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ وہ خاص طور سے میرے انٹرویو کے لئے اپنی یونٹ سے چھٹی لے کر گھر آئے تھے جنرل نالج وغیرہ کی تیاری وہ رات کو گھر پر کراتے رہے صبح بہت سویرے ہم دونوں نکا کلاں سے روانہ ہوئے وہ تمام راستے مجھ سے کالج کی باتیں کرتے رہے، بار بار کہتے ملٹری کالج بہترین ادارہ ہے میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہیں سے سیکھا ہے داخلے کا شوق تو مجھے پہلے ہی تھا میرے ایک دوست اور ہم سبق مجید جو آج کل کرنل ہیں ایک سال پہلے کالج میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن بھائی صاحب کی تعریفوں نے اس شوق کو دو چند کر دیا۔ بدقسمتی سے انٹرویو میں، میں رہ گیا۔ اور کالج میں داخل نہیں ہو سکا۔ میری ناکامی کا افسوس مجھ سے زیادہ بھائی جان اکرم کو ہوا واپسی میں، میں اداس تھا روٹی بھی نہیں کھائی۔ پہلے بہن کے پاس جہلم شہر میں ٹھہرنے کا خیال تھا۔ ناکامی نے ایسا دل کھٹا کیا کہ وہاں بھی نہیں رُکا۔ سیدھے گاؤں کا رخ کیا انہوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ دل میلا نہیں کرتے پھر کوشش کرنا، اللہ نے چاہا تو کامیاب ہو جاؤ گے۔

اس کے علاوہ بھائی اکرم نے پی ایم اے کی تیاری کی ایک کاپی میں جس میں وہ مضامین وغیرہ لکھتے تھے ملٹری کالج پر اظہار خیال کیا ہے۔

سوال:۔ وہ کاپی آپ نے دیکھی ہے؟

جواب:۔ دیکھی ہی نہیں وہ میرے پاس محفوظ ہے۔

سوال:۔ وہ کاپی آپ کو کیسے مل سکی؟

جواب:۔ بھائی اکرم کی شہادت کے بعد جب ہم نے ان کے پرانے کاغذات وغیرہ دیکھے تو ایک بکس میں وہ کاپی پڑی ملی۔ میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا تو ملٹری کالج پر ایک مضمون نظر پڑا جس کے آخر میں یہ فقرہ تھا۔

سوال :- افضل ! اب یہ بتایئے کہ بھائی کی کوئی اور بات بھی یاد ہے آپ کو؟

جواب :- بھائی اکرم کی بڑی خواہش تھی کہ ہم سب بھائی پڑھیں اور علم حاصل کریں اس کیلئے انہوں نے ہم سب بھائیوں کی عملی مدد کی۔ ملٹری کالج میں داخل نہ ہونے پر میں نے اپنی تعلیم ان کے کہنے پر جاری رکھی۔ پھر مجھے آرمی اپرنٹس سکول پنڈی میں داخلہ مل گیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں ای۔ایم۔ای میں بھرتی ہو گیا۔ ۶۷ - ۱۹۶۶ء میں ان کے اصرار پر کمیشن کے لئے درخواست دی۔ آئی ایس ایس بی کی تیاری کے لئے انہوں نے میرے ساتھ اپنی سالانہ چھٹی لی۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ جان توڑ کر کوشش کی۔ بحث و مباحثہ کے لئے ایک عنوان دیتے تھے۔ پھر سنتے تھے۔ مجھے نہ آتا تو غصے ہونے کی بجائے نرمی سے سمجھاتے تھے معلومات عامہ کے لئے وہ اخبار پڑھواتے تھے۔ خبریں سنواتے جنرل نالج کی ایک کتاب بھی تھی اسے پڑھنا بھی لازمی قرار دے رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ رکاوٹیں عبور کرنے کی بھی مشق کرواتے تھے۔ رسہ چڑھنے کیلئے بیری کا ایک اونچا درخت استعمال ہوتا تھا۔ بھائی کی سکھائی ہوئی چیزیں آئی ایس ایس بی میں میرے بہت کام آئیں یہ اور بات ہے کہ بوجوہ میں کمیشن لینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بھائی اکرم، اپنے چھوٹے بھائیوں پر جان چھڑکتے تھے مجھ پر تو وہ خاص طور پر کرم کرتے تھے۔

سوال :- ان کی "برادر پروری" کی کوئی اور مثال بھی اس وقت آپ کے ذہن میں ہے؟

جواب :- مثالیں اور واقعات تو بے شمار ہیں صرف ایک سناتا ہوں۔ یہ اگست ۱۹۷۱ء کی بات ہے کہ میرا تبادلہ مشرقی پاکستان ہو گیا۔ بھائی وہاں پہلے سے بوگرہ کے علاقے میں تھے۔ والدین نے بھائی اکرم کو اطلاع دے دی کہ افضل ۲۰۴ ایف آئی یو میں ڈھاکہ آ رہا ہے۔ میں رستم نامی مال بردار جہاز میں ۲۰ اگست ۱۹۷۱ء کو کراچی سے روانہ ہوا۔ اگست ۲۷ء کو چٹا گانگ پہنچا چٹا گانگ سے نرائن گنج تک اسٹیمر میں سفر کیا۔ نرائن گنج سے ریل میں ڈھاکہ پہنچا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ستمبر کی ۳ تاریخ تھی اور رات کا وقت اسٹیشن سے باہر نکلا تو ٹرپ بس موجود

تھی۔ میرے ساتھ اس ٹرین سے جتنے سپاہی آئے تھے وہ اس میں بیٹھ گئے۔ بس چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئی۔ جس کی یونٹ راستے میں آتی وہ اترتا جاتا۔ آخر میں میں رہ گیا مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میری یونٹ کہاں ہے۔ اتفاق سے ایک ایف آئی یو کی گاڑی پر نظر پڑی ہمارے ڈرائیور نے اسے رکوایا اور پوچھا ۶۰۴ کہاں ہے اور اس نے کہا آجاؤ ہم ہی ۶۰۴ ایف آئی یو کی گاڑی میں بیٹھ گیا اس کا ڈرائیور بہت تپاک سے ملا اور میرا سامان اتروا کر گاڑی میں رکھ لیا دوسری سیٹ پر جو آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا میرا نام حوالدار محمد اکرم ہے۔ جہلم کا رہنے والا ہوں۔ بلوچ سے ای آر ای پر اس یونٹ میں آیا ہوں۔ میں نے بھی اپنا تعارف کرانا شروع کیا۔ میں ای ایم ای کا۔۔۔ میں یہیں تک کہہ پایا تھا کہ حوالدار محمد اکرم نے جھٹ کہا تمہارا نام افضل ہے نا؟ ایف ایف آر کے میجر اکرم کے بھائی ہو؟ میں نے حیرت سے کہا یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا حوالدار محمد اکرم نے کہا آپ کے بھائی میجر صاحب ایک ہفتے سے روز آپ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ ای ایم ای کا افضل ابھی پہنچا یا نہیں تو بھائی اکرم کی یہ محبت تھی۔ جب تک ٹیلی فون کا سلسلہ رہا وہ اکثر مجھے فون کرتے تھے۔

سوال:۔ ڈھاکہ پہنچنے کے بعد، آپ اپنے بھائی اکرم سے کبھی مل سکے؟

جواب:۔ نہیں۔ باوجود کوشش کے ہم دونوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکے صرف ٹیلی فون پر بات ہوتی رہی لیکن تواتر سے میں نے کہا ہے کہ وہ بھائیوں پر جان چھڑکتے تھے اس وقت ہم دو بھائی مشرقی پاکستان میں تھے۔ بھائی محمد حفیظ جیسور سیکٹر میں مصروف کارزار تھے اور میں ایم آئی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ بھائی اکرم ہم دونوں کی خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔ تقریباً دوسرے تیسرے دن ان کا فون آتا رہتا تھا۔

سوال:۔ اس عرصے میں ٹیلی فون پر ان کی باتوں سے آپ نے کیا تاثرات اخذ کئے۔

جواب:۔ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ بہت سنبھل سنبھل کے بات کرتے تھے۔ کسی بات سے یہ تاثر

نہیں دینا چاہتے تھے حالات خراب ہیں یا خراب ہوتے جاتے ہیں ستمبر ۱۹۷۱ء میں
جو باتیں ہوئیں ان میں انہوں نے اپنے چھٹی پر گھر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تاکہ
سب گھر والوں اور خاص طور پر بے جی کو تسلی دے سکیں۔
ایک بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ وہ کال ختم کرنے سے پہلے خالص بنگالی لب ولہجہ
میں ایک دم بھالو، سب خیریت ضرور کہتے۔ گفتگو کو یہ مزاحیہ رنگ دینے کا مقصد بھی یہی
تھا کہ میں خود بھی مطمئن ہوں اور گھر والوں کو بھی اپنے خوشگوار تاثرات پہنچاؤں۔ بھائی
اکرم کی زندگی کا یہ ایک عظیم پہلو تھا کہ وہ اپنے دکھ درد کے جائز اظہار سے بھی گریز کرتے تھے۔
ان کی زیادہ تر کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ حالات کا روشن رُخ لوگوں کو دکھائیں۔ اپریل
۷۱ء سے اواخر نومبر ۷۱ء تک جو خطوط انہوں نے مشرقی پاکستان سے لکھے ان میں مایوسی
یا پریشانی کی ایک لہر بھی نہیں۔ انتہائی ناسازگار حالات میں پُر اُمید وہی رہ سکتا ہے جسے خدا
پر بھی ایمان اور اپنے اوپر بھی اعتماد ہو۔

سوال:۔ پھر آپ کو حالات کی نزاکت کا اندازہ کن ذرائع سے ہوا۔

جواب:۔ نومبر کی ۱۸، ۱۹ تاریخ کو ان کی یونٹ کے ایک صوبیدار صاحب اپنے زخمی کی عیادت
کے لئے ڈھاکہ آئے تو بھائی صاحب نے انہیں مجھ سے ملنے کیلئے کہا۔ چنانچہ صوبیدار صاحب
پہلے میرے پاس آئے اس دن ڈھاکہ میں کرفیو لگا ہوا تھا میں انہیں پاکر بہت خوش ہوا۔ بھائی
صاحب کے بارے میں میں نے عرض کی کہ وہ کیسے ہیں تو صوبیدار صاحب یوں گویا ہوئے
کہ آپ کے بھائی صاحب بخیریت ہیں اور آپ کو سلام کہتے ہیں اور وہ پہلے کی نسبت
کافی مضبوط اور صحت مند اور توانا معلوم ہوتے ہیں۔ اور مصلے' تسبیح ان کے شب و روز
کے مشاغل ہیں بھائی صاحب کی صحت اور خیر و عافیت کی خبر پاکر میں نے اللہ تعالیٰ کا
شکر ادا کیا۔ وہاں کے حالات کیسے ہیں۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔ سرحد پر بھارتی افواج بڑے
پیمانے پر فوج کشی کر رہا ہے اور دن رات ہزاروں کی تعداد سے درمیانی توپوں کے گولے

برسائے جاتے ہیں۔ بھارتی طیارے بمباری میں مشغول ہیں اور وہ انسانیت کی تمام حدود کو پار کرتے ہوئے نپام بم پھینکتے رہتے ہیں۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے صوبیدار صاحب کو بات ختم کرنے کی التجا کی اور کچھ دیر کے لئے میں سکتہ میں رہا۔

بھائی جان نے تو ایک بار بھی، ان واقعات کا اشارہ تک نہ کیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"ان حالات میں، جو آپ نے ذکر کئے ہیں آپ کا کیا ردعمل ہے؟"

چلئے اس کا جواب سی۔ایم۔ایچ سے معلوم کرتے ہیں۔ جہاں ہماری یونٹ کے مجاہد زخمی حالت میں زیر علاج ہیں۔

ہم دونوں سی ایم ایچ کے لئے چل دیئے سب سے پہلے ان کے بھائی صاحب کی عیادت کیلئے گئے جو بلوچ رجمنٹ میں صوبیدار تھے۔ ان کا سینہ اور چہرہ گولیوں سے بُری طرح زخمی تھا۔ جسم کے دوسرے حصوں پر بھی گہرے زخم تھے۔ ان کی حالت بہت ہی مخدوش تھی بات کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔

آخر خدا خدا کرکے ہم ۴ ایف ایف کے ایک زخمی مجاہد کے پاس گئے خدا جھوٹ نہ بلوائے وہ بالکل نیا رنگروٹ معلوم ہوتا تھا اور ٹریننگ کے فوراً بعد ۴ ایف ایف آر میں بھیج دیا گیا وہ پٹھان تھا اس کا نام میں بھول چکا ہوں اس کی ٹانگ پر گولیاں لگی تھیں۔

ڈاکٹروں نے ابتدائی علاج کے بعد جب اس کو مغربی پاکستان بھیجنے کیلئے ضروری کاغذات بنائے تو اس مجاہد نے مغربی پاکستان جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اور اس نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کی کہ خدارا میرا علاج جلد کرو تاکہ میں دوبارہ اپنی یونٹ میں جا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شانہ بشانہ دشمن کے خلاف لڑ کر شہید ہو جاؤں۔ یا غازی۔ میں نے اپنے چاند سے مجاہد کے ہاتھ چومے اور بے اختیار میری زبان سے یہ الفاظ نکلے "کہ جس فوج اور بٹالین

ہیں ایسے مجاہد موجود ہوں اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ صوبیدار صاحب ایک یا دو راتیں ڈھاکہ میں قیام کرنے کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو اس دن بھی ڈھاکہ میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ میں ان کو یونٹ کے گیٹ تک ہی خدا حافظ کر سکا اور بھائی صاحب کے لئے نیک تمناؤں کے علاوہ کچھ بھی نہ دے سکا۔ صوبیدار صاحب بمشکل یونٹ میں پہنچے ہوں گے کہ بھارت نے ۲۲ نومبر کو مشرقی پاکستان پر بڑے پیمانے پر حملے شروع کر دیئے۔ ۴۰، ۵ دن تک بھائی صاحب کی طرف سے کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی۔ ۲۶ نومبر کو دشمن نے جیسور کے محاذ پر بہت بڑا حملہ کیا۔ برادرم حفیظ کی یونٹ جیسور تھی مجھے ان کے بارے میں سخت تشویش تھی میں اسی فکر میں تھا کہ دفتر سے اطلاع آئی کہ آپ کے بھائی صاحب کا فون ہے میں حسب سابق فوراً وہاں پہنچا اور بھائی جان کو فون پر سلام عرض کیا آج وہ خلاف معمول تیز تیز باتیں کر رہے تھے میں نے ان سے جیسور پر گذشتہ بھارتی حملے کا ذکر کیا تو کہنے لگے میں نے ابھی ابھی حفیظ سے فون پر بات کی ہے۔ حملہ خاصا شدید تھا۔ تاہم پاکستان افواج نے نہایت ہی بہادری سے دشمن کا بے شمار جانی نقصان کیا ہے اس کے فوراً بعد انہوں نے مجھے یہ کہہ کر خدا حافظ کہا کہ اب مجھے کسی صاحب سے ضروری بات کرنی ہے۔ اس کے بعد ان کی طرف سے کوئی کال موصول نہ ہوئی۔

آخری ایام میں نے زیادہ تر سی۔ ایم۔ ایچ میں مریضوں کے ساتھ گذارے۔ ۳ دسمبر کو بھائی صاحب کی کمپنی کا ایک سپاہی (اسلم یا حنیف) زخمی حالت میں سی۔ ایم۔ ایچ میں داخل ہوا۔ اس کی ایک ٹانگ پر گولی لگی تھی اور پاؤں پر گولے کا گہرا زخم تھا۔ اس سے جب میں نے بھائی صاحب کے بارے میں استفسار کیا تو کہنے لگے کہ وہ فرشتہ سیرت بفضل تعالیٰ بخیریت ہیں اور دشمن کی شدید گولہ باری کے باوجود کمپنی کے ایک ایک مورچہ میں جا کر اپنے سپاہیوں کے حوصلے بڑھاتے ہیں۔ زخمی مجاہد نے مزید بتایا کہ

کہ جب کبھی دشمن کا کوئی گولہ یا بم ہمارے کسی مورچہ پر گرتا ہے وہ فوراً جائے وقوع پر پہنچ جاتے ہیں اور جب تک زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد دلوا کر اسپتال نہیں بھجوا دیتے وہ اس وقت تک وہ جگہ نہیں چھوڑتے۔

اب کھلی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا بھارتی طیارے مشرقی پاکستان کے تمام علاقوں اور خصوصاً ڈھاکہ پر چوبیس گھنٹے مسلسل بمباری کرتے رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے بارڈر سے زخمیوں کی ترسیل آنا بھی بند ہو گئی اس طرح مجھے ان کی خیریت کی خبر نہ مل سکی۔

حفیظ ملک کا انٹرویو

سوال:۔ حفیظ! بحیثیت اکرم شہید کے چھوٹے بھائی کے ان کے بارے میں آپ کی یادیں کس نوعیت کی ہیں؟

جواب:۔ بھائی جب چھٹی آتے تھے تو ہمیں بڑی پابندی سے پڑھاتے تھے صبح نماز کے بعد دو تین میل دوڑاتے تھے پھر پی ٹی کرتے اور کراتے تھے جس میں درختوں کے ساتھ لٹکنا اور اچکنا بھی شامل ہوتا تھا اس کے بعد اکثر درختوں کے سامنے کھڑا کر کے کہتے ان کے سامنے تقریر کرو ناشتے کے بعد پڑھاتے۔

سوال:۔ ناشتہ میں کیا لیتے تھے؟

جواب:۔ دو انڈے لازمی طور پر اور آدھ سیر دودھ اور کوئی پھل۔

سوال:۔ خود کب پڑھتے تھے؟

جواب:۔ ہمیں پڑھانے کے بعد خود پڑھتے دوپہر کے آرام کے بعد اخبار پابندی سے پڑھتے تھے۔ صبح و شام کی خبریں ضرور سنتے تھے۔

سوال:۔ حفیظ۔ آپ حافظ قرآن بھی ہیں یہ شوق آپ کو کیسے ہوا اکرم نے قرآن کب پڑھا تھا؟

جواب:۔ ہم دو بھائی افضل اور میں، حافظ قرآن ہیں۔ بھائی اکرم اور والدین کی خواہش تھی کہ ہم

یہ برکت حاصل کریں بھائی اکرم حافظ نہیں تھے لیکن قرآن پاک پابندی سے پڑھتے تھے
بچپن میں تھوڑا ہی پڑھا تھا نوکری میں جا کر پورا پڑھا اور قرآن پڑھنے کی بہت تلقین کرتے
رہتے تھے اس کے لئے انہوں نے عملی اقدام بھی کیا۔

سوال :۔ وہ کیا؟

جواب :۔ ہمارے گاؤں نکے میں قرآن شریف پڑھانے کا کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔ اسی وجہ
سے وہ خود بھی بچپن میں قرآن ختم نہ کر سکے تھے۔ کمیشن لینے کے بعد بھائی اکرم نے گاؤں
کی مسجد میں ایک حافظ صاحب کا انتظام کیا ان کا بیشتر مشاہرہ وہ اپنی جیب سے دیتے تھے۔

سوال :۔ حفیظ۔ آخر میں، ایک بات اور بتایئے آپ کو اپنے بھائی کی کون سی ادا سب سے زیادہ
پسند تھی۔

جواب :۔ بھروسہ، ان میں بھروسہ کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت تھی شک کرنا تو گویا وہ جانتے
ہی نہ تھے۔ بیٹا ہو۔ اپنا یا غیر ان کے دل میں سب کے لئے جگہ تھی وہ ایک بہت
ہی عام سے دیہاتی گھر میں پیدا ہوئے تھے ماحول بھی کوئی ایسا سازگار نہیں تھا۔ لیکن
قدرت نے انہیں بڑے آدمیوں کا دل دیا تھا وہ اگر نشان حیدر نہ لیتے یا کوئی اور بڑا کام
نہ کرتے تو یہ تعجب کی بات ہوتی۔

اکرم۔ پیکرِ صدق و صفا

ملک عبدالقیوم شہید کے چھوٹے بھائی ہیں وہ مغربی پاکستان میں مختلف جگہوں پر تھوڑے
عرصے کے لئے اکرم شہید کے ساتھ رہے۔ شہید نے انہیں پڑھایا بھی۔ ہم نے عبدالقیوم
کو پنڈی لکھا کہ آپ سے اکرم شہید کے بارے میں انٹرویو کرنا ہے اگر نکے جلد آنے کا ارادہ
ہو تو سراتے عالمگیر کا چکر بھی لگانا چاہیئے یا پھر اپنے عظیم بھائی کے بارے میں اپنی یادیں
قلم بند کر کے بھیج دیجیئے۔ کچھ کام چل ہی جائے گا۔ چند روز بعد عبدالقیوم کا خط آیا جس میں

جلد ملاقات کرنے کا وعدہ تھا۔ اور ساتھ ہی تحریر بھی تھی۔

ایثار اور احسان کی عظیم مثالوں سے اسلامی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ لیکن اس کا عملی نمونہ میں نے بھائی جان کی ذات میں دیکھا انہوں نے صرف دو اسباب کی بنا پر اب تک شادی نہیں کی تھی ایک طرف ان کی تینتیس سال کی عمر دیکھئے جب سینۂ محشرستانِ جذبات بنا ہوتا ہے اور دوسری طرف انکار کے اسباب پر نگاہ ڈالیئے۔ ان کی شادی کے لئے دو شرائط تھیں۔ پہلے میرے بھائی تعلیم سے فارغ ہوکر برسرروزگار ہو جائیں اور والدین زیارت بیت اللہ شریف سے مشرف ہو جائیں۔ ۳۳ سال کے کسی نوجوان سے کسی عظیم مالی ایثار کی توقع تو کی جا سکتی ہے لیکن اس دور میں جذبات وخواہشات کا یہ ایثار صرف اکرم شہید جیسے نوجوان ہی کر سکتے ہیں اور مالی ایثار میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھے مشرقی پاکستان جانے سے پہلے اپنے بہنوئی ملک محمد حنیف کو مکان کی تعمیر کے لئے آٹھ ہزار روپے دیئے اور اپنے گاؤں کی مسجد میں درس قرآن کے لئے مقرر مولوی صاحب کی آدھی تنخواہ باقاعدگی سے بھیجتے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے جذبات کا ایثار کیا اپنے بھائیوں اور والدین کیلئے مال کا ایثار کیا، اپنے رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کے لئے بلکہ وطن کے حضور جان کا نذرانہ بھی پیش کیا۔

وہ حد سے زیادہ بے تکلف تھے۔ اور کبھی افسری، ماتحتی یا سینارٹی وغیرہ کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ دوست انہیں کہتے کہ آپ سپاہیوں اور ماتحتوں کے ساتھ یوں نہ گھل مل کر باتیں کیا کریں۔ ان کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا۔ اگر میں سینئر ہوں تو سینارٹی یونٹ میں ہوگی۔ سوٹ بہت کم پہنتے اور ٹائی بہت کم استعمال کرتے تھے۔ ۶۹ء تک ان کے پاس سائیکل تھی اور اسی پر ہر جگہ آیا جایا کرتے۔ کبھی اس بات پر ندامت محسوس نہیں کی کہ ایک کیپٹن ہوکر سائیکل پر کیوں سوار ہوں۔ ۶۹ء میں موٹر سائیکل خریدا۔ باغبانی اور مرغیاں پالنے کے بہت شوقین تھے۔ گھر میں گائے، مرغیاں اور مینا پال رکھی تھی وہ اچھے کھانے کے شوقین نہیں تھے۔ عام گفتگو میں یہ آیت اکثر دہرایا کرتے تھے۔ اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے

ذلت، نماز، روزہ کے پابند تھے اور نماز جمعہ باقاعدگی سے مسجد میں ادا کرتے۔ ان کے ہاتھ بچپن ہی سے بہت نرم تھے۔ جب ہاتھوں کی نرمی کا سبب پوچھا جاتا تو وہ یہ جواب دیتے جس کے ہاتھ نرم ہوں وہ ماں باپ کی زیادہ خدمت کرتا ہے۔ ہاتھوں کی انگلیاں بھی خاصی لمبی تھیں جب کیرم کھیلتے تو ہٹ لگاتے وقت پورا پورا بورڈ صاف ہو جاتا۔

خاندانی ماحول کے باعث خیالات میں شروع سے پاکیزگی تھی وہ صالح قیادت کو پاکستان کے تمام مسائل کا حل سمجھتے تھے، کشمیر، قبرص اور فلسطین کے مسلمانوں پر انہیں بے پناہ دکھ ہوتا۔ جب یہودیوں نے مسلمانوں کے قبلہ اوّل بیت المقدس کو جلایا تو ان کا دل بھی خون کے آنسو روئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی نجی ڈائری میں انہوں نے اپنے تاثرات نوٹ کرتے ہوئے لکھا کہ تمام مسلم سربراہان مملکت کو بیت المقدس کی آزادی کے لئے جہاد کرنا چاہیئے ان کا مطالعہ وسیع اور جنگی معاملات پر گہری نظر تھی اپنی یونٹ میں وہ اتھارٹی سر کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ملکی معاملات پر بھی ان کی نظر تھی۔"

عید کے دوسرے دن عبدالقیوم ملک سے ہماری تفصیلی ملاقات ہوئی دیر تک وہ شہید بھائی کی باتیں اداس ہو کر لیکن فخر سے کرتے رہے۔ وہ بات چیت کچھ یوں تھی۔

سوال:۔ میجر اکرم آپ کے بڑے بھائی تو تھے۔ کتنے بڑے تھے؟

جواب:۔ کوئی آٹھ برس۔

سوال:۔ سنا ہے انہوں نے آپ کو پڑھایا بھی ہے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ کیا تھا؟

جواب:۔ کہتے تھے جو پڑھا کرو اسے اپنے لفظوں میں لکھا بھی کرو۔ لکھنے پر یہ زور دیتے تھے۔ جب تک میں ساتویں آٹھویں میں تھا مجھے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

سوال:۔ تو پھر آپ نے بی اے کیسے کر لیا؟

جواب:۔ میں نے عرض کیا نا۔ اس وقت تک مجھے تعلیم سے دلچسپی نہیں تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا کم دلچسپی تھی۔ یہ بھائی اکرم کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ میں پڑھ سکا۔ ہم سب بھائیوں کی تعلیم

کے مصارف بھی بھائی اکرم ہی برداشت کرتے رہے انہوں نے بنک میں میرے نام سے اکاؤنٹ کھول رکھا تھا۔ اسی سے میں، درہبائی حفیظ اور رزاق، سب اپنی ضرورت کا پیسہ نکال لیتے تھے بھائی کو ہم پر اس درجہ اعتماد تھا کہ انہوں نے کبھی حساب نہیں لیا اور کبھی اس معاملے میں کوئی بازپرس نہیں کی۔

سوال :۔ وہ پڑھاتے تھے تو کبھی کبھار سزا بھی دیتے ہوں گے ؟

جواب :۔ بہت کم۔ دو چار بار انہوں نے میرے کان ضرور کھینچے۔ عموماً غصہ ہوتے تو صرف اتنا کہتے بڑے گھگو ہو کچھ پڑھا بھی کرو۔

سوال :۔ آپ چونکہ بھائی ہیں ان کے معمولات زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے ؟

جواب :۔ والد صاحب کو چونکہ مسجد میں تہجد پڑھنے کی عادت ایک عرصے سے ہے۔ وہ تہجد پڑھ کے مسجد ہی میں اللہ اللہ کرتے رہتے۔ جب اذان کا وقت ہو جاتا تو صبح کی اذان دے کر گھر آتے اور ہمیں جگاتے ہماری آنکھ خود ہی وقت پر کھل جاتی اگر کبھی وقت پر جاگ نہ آتی تو والدہ بار بار پکار کر اٹھا دیتی تھیں۔ بھائی اکرم نماز کے بعد گھر سے خاکی پتلون لیتے اور نالہ بناؤ کی طرف چلے جاتے۔ نالہ بناؤ ہمارے گھر سے کوئی دو چار فرلانگ کے فاصلہ پر ہے وہاں بنیان پتلون میں نالے کے ساتھ کم از کم تین میل دوڑتے اور پھر واپس اس طرح چھ سات میل کی دوڑ لگا کر کچھ دیر پی ٹی بھی کرتے تھے۔

سوال :۔ آپ نے کہا کہ گھر سے ہی پہن کر ساتھ لے جاتے تھے گھر سے بھی پہن کر کیوں نہیں جاتے تھے۔

جواب :۔ اس کا صحیح جواب تو وہی دے سکتے تھے میرا خیال ہے کہ اس میں بھی ایک ادا تھی۔ مسجد سے واپس آکر پی ٹی شوز لیتے اور پتلون لے کر باہر آجاتے۔ ایسا کرنے سے میرا خیال ہے کہ وہ گھر کی کلچرل فضا کا احترام کرنا چاہتے تھے۔

سوال :۔ پی ٹی کے بعد ؟

جواب :۔ اس کے بعد غسل وغیرہ کر کے ناشتہ کرتے تھے۔ ناشتے میں دو انڈے اور صرف ایک گلاس

دودھ۔ پراٹھا وغیرہ کوئی اور چیز نہیں یہ ان کا صبح کا ناشتہ تھا اس کے بعد وہ عموماً ساتھ ہیں واقع تایا جان کے گھر کی دوسری منزل میں ایک ٹرانسسٹر اور کتابیں رسالے لے کر مطالعہ کرنے چلے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے گھر میں بجلی نہیں آئی تھی خبریں سننے کا بہت شوق تھا۔ ہم سے بھی خبریں پوچھتے رہتے تھے یہ معلوم کرنے کے لئے ہم بھی خبریں سنتے ہیں یا نہیں۔ اسی طرح اصرار کرتے کہ پاکستان ٹائمز پڑھا کرو اس سے انگریزی ٹھیک ہو گی۔ عموماً ٹائمز میں کہیں نشان لگا دیا کرتے تھے کہ اس کو پڑھو۔

سوال:۔ ٹرانسسٹر پر اور کیا سنتے تھے؟

جواب:۔ گانے والے لگے رہتے لیکن وہ سنتے بالکل نہیں تھے خواہ کچھ بجتا رہے بہت دھیمی آواز میں ٹرانسسٹر بجتا رہتا تھا میں نے ایک بار پوچھا بھی کہ پڑھتے میں آپ ٹرانسسٹر کیوں لگائے رکھتے ہیں کہنے لگے اس طرح میرا دھیان نہیں ہٹتا بلکہ توجہ زیادہ ہو جاتی ہے۔

سوال:۔ میجر اکرم نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں نکا کلاں اور چکری میں حاصل کی۔ اپنے پرانے استادوں سے کیسے ملتے تھے؟

جواب:۔ ہمارے گاؤں کی طرف اس زمانے میں صرف دو بسیں جاتی تھیں۔ ان کا آخری اسٹاپ خلاص پور ہمارے گاؤں سے کوئی تین چار فرلانگ اس طرف تھا ہم خلاص پور کے بس اڈے پر بھائی کا انتظار کرتے پہنچ جاتے تھے اڈے کے ساتھ ان کے استاد کرم الٰہی صاحب کا مکان تھا ہمیں ان کے مکان کے سامنے ہی سے گزرنا ہوتا تھا اگر ماسٹر صاحب بیٹھے صحن میں نظر آجاتے تو بھائی اکرم ضرور ان کے سلام کو رکتے تھے۔ وہ بھی اکرم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے کبھی کبھی ماسٹر صاحب خود بھی ملنے آجاتے تھے اسی طرح ماسٹر غلام نبی صاحب بھی اکثر ملاقات کیلئے آنے کی زحمت کرتے تھے۔ جب بھی ان میں سے کوئی آتا تو بھائی ان کو پہنچانے ان کے گھر تک جاتے تھے خواہ کوئی وقت ہو کیسا ہی موسم ہو وہ اس تواضع میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔

عبدالرزاق ملک کا انٹرویو

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے لئے ہم رزاق صاحب سے انٹرویو نہیں کر سکے تھے۔ اب دوسرے ایڈیشن کیلئے ہماری یہ گفتگو ہوئی۔

سوال:۔ رزاق صاحب میجر اکرم سے آپ کا رشتہ کیا ہے۔

جواب:۔ میجر شہید میرے بڑے بھائی تھے۔ میں ان سے تین سال چھوٹا ہوں۔

سوال:۔ آجکل کیا مشغلہ ہے؟

جواب:۔ اپنے گاؤں کے قریب چکری میں سب پوسٹ ماسٹر ہوں۔

سوال:۔ کوئی ایسا واقعہ یاد ہے جس سے آپ کے شہید بھائی کے کردار و شخصیت پر کوئی نئی روشنی پڑتی ہو؟

جواب:۔ بیشتر حالات وواقعات گھر والوں میں سے کسی نہ کسی نے بیان کر دیئے ہیں۔ صرف ایک واقعہ ایسا ہے کہ جو کتاب میں مذکور نہیں۔

سوال:۔ فرمائیے؟

جواب:۔ کمیشن لینے سے پہلے بھی، لیکن اس کے بعد تو بہت زیادہ شہید بھائی کا شوق یہ تھا کہ ہم سب بھائی خوب پڑھیں اور فوج میں جائیں۔ فوج کا انہیں واقعی بہت شوق تھا۔ کے جی آر کے زمانے میں اور اس کے بعد جب کبھی گھر آتے تو خود بھی رسا وغیرہ چڑھنے کی مشق کرتے اور ہمیں بھی شوق دلاتے بلکہ زبردستی صبح شام کسرت کرواتے تھے کسی بھائی کو تعلیم سے بھاگتے یا ناکام ہوتے دیکھتے تو اکثر کہا کرتے مجھے دیکھو کتنی بار ناکام ہو کر میں کامیاب ہوا ہوں۔ ۱۹۶۵ کی جنگ کے بعد انہوں نے اس ضمن میں ایک واقعہ بھی سنایا تھا۔

سوال:۔ کیا؟

جواب:۔ ۶۵ کی لڑائی کے بعد چھٹی آئے تو مجھ سے کہنے لگے۔ رزاق آج مجھے وہ صوبیدار صاحب

سیالکوٹ سے آتے ہوئے بس میں تے جو کبھی مجھے کمیشن کا امتحان بار بار دیتے دیکھ کر میرا مذاق اڑاتے تھے۔ اور کہتے تھے کیوں مغز ماری کرتے ہو۔ افسر بننا بچوں کا کھیل نہیں میں ہمیشہ یہی کہا کرتا، "سر جب تک چانس ہے کوشش کرتا رہوں گا۔ کبھی نہ کبھی تو اللہ تعالیٰ سنے گا ــــ چنانچہ دو بار ناکام ہو کر تیسری بار میں مجھے کمیشن ملا۔

چنانچہ وہ ہم بھائیوں سے بھی یہی کہا کرتے۔ کوشش کرتے رہو۔ کوشش کے ساتھ خدا ہے۔

سوال :۔ کوئی اور واقعہ ؟

جواب :۔ دو ایک واقعے اور یاد آ رہے ہیں لیکن وہ سنے ہوئے ہیں۔

سوال :۔ سنائیے۔ نوٹ کئے لیتے ہیں شاید کوئی نئی بات سامنے آئے ؟

جواب :۔ پہلا واقعہ ۱۹۷۱ء کے اواخر کا ہے۔ انہوں نے گھر خط لکھا تھا کہ ایک صوبیدار صاحب زخمی ہو کر علاج کے لئے سی ایم ایچ کھاریاں آ رہے ہیں ان کی دیکھ بھال کریں۔ میں ان دنوں منگلہ میں پوسٹ تھا۔ والدین نے وہ خط مجھے بھیج دیا۔ میں اس کو لے کر کھاریاں گیا۔ وہ صوبیدار صاحب کہنے لگے میں میجر صاحب کو خوب جانتا ہوں۔ بنگالی فوجی باغی ہو گئے ہیں۔ وہ افسروں کی جان کے لاگو ہیں۔ وہ تاک میں رہتے ہیں۔ میجر صاحب ایک تو ننگے سر گھومتے رہتے ہیں دوسرے رات کو بھی اکیلے ڈیوٹی کرنے سے باز نہیں آتے۔ ہم لوگ تو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے۔ ڈیوٹی، ڈیوٹی ہے۔ موت کو جب آنا ہے ضرور آئے گی۔ صوبیدار صاحب نے مجھ سے کہا۔ آپ اس سے جس کی وہ بات مانتے ہوں خط لکھوائیں۔ میں نے یہ بات گھر آ کر بتائی سب پریشان ہو گئے۔ چنانچہ ہماری بہن اور بہنوئی حنیف ملک صاحب نے انہیں احتیاط کرنے کے بارے میں خطوط بھی لکھے۔ یہ خط اور بھائی کا جواب آپ پہلے ہی کتاب میں دے چکے ہیں۔

ایک اور واقعہ مجھے ان کے یونٹ کے خطیب صاحب نے سنایا جو مجھے چند سال ہوئے ملے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لڑائی کے زمانے میں بھی وہ اگلے موریچوں میں مجھے اکثر بلواتے تھے۔

اور جوانوں سے ملواتے تھے۔ ایک روز مجھے بلوایا۔ اس روز فائرنگ زیادہ ہو رہی تھی میں باوجود کوشش کے آگے نہیں جا سکا۔ دوسرے روز گیا تو کہنے لگے کہ جوں ہی مجھے موقعہ ملا تو میں افسران بالا سے کہوں گا کہ خطیب صاحبان کو بھی تھوڑی بہت تربیت دی جائے اور رینک دیا جائے تاکہ یہ بھی جوانوں کے ساتھ اگلے مورچوں پر رہ سکیں۔

میں نے سنا ہے کہ ان کی یہ خواہش از خود پوری ہوگئی ہے۔ اب خطیبوں کو عہدیدار بنا دیا گیا ہے۔ ان مولوی صاحب نے بھی یہی بتایا کہ میجر صاحب کے پاس جیبی قرآن شریف ہمیشہ رہتا تھا اور پابندی سے تلاوت کرتے تھے۔

اصغر ملک کا انٹرویو

سوال:۔ اصغر صاحب، میجر اکرم نے جو خطوط آپ کے نام لکھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آپ سے بے تکلف تھے۔ کچھ ان سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالیئے؟

جواب:۔ میجر اکرم جنہیں میں بھی انھارٹی سر کہا کرتا تھا۔ میرے چچازاد بھائی تھے۔ عمر میں مجھ سے تقریباً آٹھ برس بڑے لیکن ہمارے درمیان احترام کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے جب میں فرسٹ ایئر میں تھا اس وقت سے ان کو میں نے جاننا پہچاننا شروع کیا۔ اس سے پہلے ان سے صرف رسمی تعلق تھا۔ اس کے بعد جب ۶۷-۱۹۶۸ء میں، میں اپنے والد میجر محمد شریف مرحوم کے ساتھ سیالکوٹ میں ٹھہرا ہوا اکنامکس میں ایم اے کر رہا تھا اس زمانے میں مجھے ان سے قریب ہونے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد ان سے خاصی خط و کتابت بھی رہی۔

سوال:۔ چونکہ آپ ان سے خاصے قریب رہے ہیں اس لئے آپ اس پوزیشن میں ہیں کہ انکی شخصیت کے بعض ان گوشوں سے پردہ اٹھائیں جو عام عام نظروں سے پوشیدہ تھے۔

جواب :۔ اتھارٹی سر، کی شخصیت میں اصل میں کوئی راز نہیں تھا کوئی پردہ نہیں تھا ان کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق مجھے نظر نہیں آیا وہ سیدھے سادھے بلکہ بھولے بھالے معصوم خصلت انسان تھے۔

سوال :۔ پھر بھی آپ ان کی عادتوں کی نشاندہی تو کر ہی سکتے ہیں۔

جواب :۔ جی ہاں۔ بالکل

سوال :۔ مثلاً

جواب :۔ یہ کہ انہیں لمبی سیر کرنے اور گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا۔ گاؤں آتے تو ہم اکثر گاؤں سے باہر کھیتوں کی طرف ٹہلنے جاتے تھے ان کی عادت تھی کہ راستہ میں کھیتوں کی باڑھوں سے ٹوٹ کر گرے ہوئے ببول کے کانٹے وہ اٹھاتے چلتے تھے یا پاؤں سے ایک طرف کرتے جاتے تھے۔ اس عمل میں کبھی کبھی ہمیں دو دو منٹ رکنا پڑتا۔

میجر اکرم کا یوں کانٹے اٹھاتے جانا بہت اہمیت رکھتا ہے اس سے ان کی قدروں کی غمازی ہوتی ہے اگر دیکھا جائے تو ان کی ساری زندگی کانٹے اٹھاتے گزری۔ بچپن میں اپنے راستے کے کانٹے اٹھائے اپنا کیریر بنایا پھر اپنے بھائیوں اور عزیزوں کی راہ کے کانٹے چنتے چنتے لہولہان ہو گئے۔ سیالکوٹ میں کم و بیش دو برس میں ساتھ رہا۔ ان کے میس میں آنا جانا تھا۔ وہ اکثر ہمارے گھر آتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں کسی افسر یا کسی اور پر نکتہ چینی یا عیب جوئی کرتے نہیں دیکھا۔ کینہ اور نفرت سے ان کا سینہ خالی تھا کرتے تو تعریف ہی کرتے ورنہ طرح دے جاتے۔ ہمدردی سادگی کا یہ عالم تھا کہ گاؤں کے جو سپاہی یا این سی او وغیرہ ان کے پاس آتے ان سے بغیر جھجک کے دل کھول کر ملتے ایک آدھ بار ایسا ہوا کوئی جونیئر سینما کے باہر مل گیا تو اسے اپنے ساتھ اونچے درجے میں بٹھایا۔

سوال :۔ فلم کا شوق تھا؟

جواب:۔ بہت کم لیکن بعض جنگی فلمیں دو دو بار بھی دیکھیں ۔ برج آن ریور کوائی اور گنز آف ناروان میں نے سیالکوٹ میں ان کے ساتھ دو دو بار دیکھیں ۔

سوال:۔ کبھی کوئی ناول، افسانہ یا شاعری کی کتاب ان کے ہاتھ میں دیکھی ؟

جواب:۔ نہیں ۔ مجھے یاد نہیں ۔ ریڈرز ڈائجسٹ ان کے پاس اکثر دیکھا زیادہ تر اسلامی تاریخ اور ملٹری ہسٹری پر کتابیں پڑھتے تھے ۔

سوال:۔ کوئی شوق ؟

جواب:۔ کیرم بہت شوق سے کھیلتے تھے اور سب گھر والوں کے ساتھ باری باری کھیلتے تھے ۔ چونکہ ان کا ہاتھ لمبا تھا اور انگلیاں پتلی اور لمبی تھیں اس لئے اکثر جیتتے تھے ۔

سوال:۔ کوئی اور عادت ؟

جواب:۔ چرب زبان نہیں تھے لکھتے زیادہ تھے بولتے کم تھے عزیزوں اور دوستوں پر روپیہ ضرور خرچ کرتے تھے ۔ لیکن خرچیلے نہیں تھے ۔ بلکہ رجحان کفایت شعاری کی طرف تھا ۔ ان کے سیالکوٹ سے تبادلے پر ہم نے ان کا کھانا کیا تیس چالیس لوگ تھے تھوڑا بہت اہتمام کیا تھا ایسے موقعوں پر کرنا بھی پڑتا ہے ۔ کھانے کے بعد میری امی کے پاس آئے اور کہنے لگے ۔ باجی یہ آپ نے کیا کیا ۔ اتنا صرف کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ میں ہر روز کھاتا ہی رہتا ہوں ۔ وہی کافی تھا ۔ آپ یہ پیسہ کسی مفید کام میں صرف کرتیں ۔

آخر میں ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ۔

سوال:۔ وہ کیا ؟

جواب:۔ سیالکوٹ ہی قیام کے زمانے کا تذکرہ ہے ایک مرتبہ وہ ورکشاپ میں گئے اور ان کے ساتھ تین چار افسر اور بھی تھے وہاں ان کے گاؤں کا ایک سپاہی ڈانگری پہنے کھڑا تھا وہ انہیں دیکھ کر شرمایا لیکن اکرم شہید بغیر اس بات کا خیال کئے کہ ان کے ساتھی افسر کیا کہیں گے اس کے پاس گئے اور اسے گلے لگا کر ملے ۔ اسی طرح ایک دفعہ ہم دونوں سینما دیکھنے گئے

وہاں ہمارے گاؤں کا ایک سپاہی محمد اسلم پھر رہا تھا۔ اکرم شہید نے پوچھا کیوں بھئی کیسے آنا ہوا۔

اس نے بتایا کہ سینما دیکھنے آیا ہوں۔ اکرم شہید نے فرسٹ کلاس کے تین ٹکٹ لئے اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا "نہیں صاحب" اکرم شہید نے جواب دیا میں صاحب بن کر نہیں تمہارا بھائی بن کر ٹکٹ لے رہا ہوں اور پھر اکٹھے سینما دیکھا۔ ایسا کرنا ان کیلئے کوئی بناوٹی بات نہیں تھی خلوص ان کے خون میں تھا۔

ملک محمد حنیف سے انٹرویو

سوال:۔ ملک صاحب۔ آپ کی میجر اکرم شہید سے رشتے کی نوعیت کیا ہے؟

جواب:۔ ملک اکرم شہید میرے چچازاد بھائی اور میری بیوی کے بھائی (سالے) بھی تھے۔

سوال:۔ آپ سے وہ کتنے چھوٹے تھے؟

جواب:۔ میری پیدائش ۱۹۲۹ء کی ہے اکرم ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح وہ مجھ سے آٹھ نو سال چھوٹے تھے میں نے ان کا بچپن دیکھا ہے لیکن میرا ان سے اصل تعلق ان کی ہمشیرہ سے شادی کے کچھ عرصے کے بعد شروع ہوا۔

سوال:۔ ان کا گھر تو نکا کلاں میں ہے ادھر نہیں جاتے تھے؟

جواب:۔ بہت کم۔ مہینے دو مہینے میں ایک آدھ بار وہ بھی پہلے ہمارے گھر سے مل کر آگے جاتے تھے۔ یہ بات برادری میں مشہور تھی کہ اکرم اپنی بہن کا بہت کرتا ہے۔ میری بیوی کی نانی (حسن بی بی) جو اب انتقال کر چکی ہیں میری بیوی سے کہا کرتی تھیں مختار تو خوش قسمت ہے تیرا بھائی تیرے پاس پہلے آتا ہے ماں کے پاس بعد کو جاتا ہے۔" اکرم شہید کے ہمارے یہاں زیادہ آنے کی ایک وجہ غالباً بچے بھی تھے انہیں بچوں سے بہت پیار تھا چونکہ اس زمانے میں خاندان میں میرے ہی دو چار بچے تھے اس لئے بھی زیادہ آتے ہوں گے۔

سوال :۔ بچوں کے ساتھ پیار کا اظہار کس طرح کرتے تھے۔

جواب :۔ بس یہی لاڈ پیار، ان کی فرمائشیں پوری کرنا تہواروں پر کپڑے تحائف دینا۔ کپڑے جوں کو ان کی پسند کے لاکے دیتے تھے کبھی کبھی بچوں کو سیر کے لئے دریا کے کنارے لے جاتے کوئی بچہ بیمار ہوتا یا بہن کو کوئی تکلیف ہوتی تو سی ایم ایچ وغیرہ بھی خود لے جاتے تھے۔

سوال :۔ آپ کے ذہن میں اکرم کی شخصیت و کردار کی کون سی خصوصیات اب تک تر و تازہ ہیں۔

جواب :۔ سب سے پہلی چیز تو ان کی مخصوص مہربان مسکراہٹ سے جو بات کرنے سے ان کے ہونٹوں کے کناروں پر نمودار ہوتی تھی اس مسکراہٹ سے دل کو ایک ٹھنڈک کا سا احساس ہوتا تھا اس طرح کا اطمینان کہ ہم ایک پاک طبیعت اور پاک باطن شخص سے ہم کلام ہیں۔ یہ مہربان مسکراہٹ ان کی شخصیت کا ایک جزو تھی آپ لاکھ کچھ کہیں اس کا وہ اثر نہیں ہو سکتا جو ان کے سانولے چہرے پہ مسکراہٹ کی اس چھاؤں کا تھا۔ یہ اجلی مسکراہٹ ان کے اجلے من کا عکس تھی۔

سوال :۔ آپ کے ہاں آتے تو بچوں کے پیار کے علاوہ اور کیا مشغلہ رہتا تھا؟

جواب :۔ بچوں کو پیار کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ میری بڑی بچیاں اسکول میں پڑھتی ہیں۔ ان سے پوچھتے کیا پڑھتی ہو۔ کبھی کبھی ان کو پڑھاتے میرے بڑے بیٹوں سے بھی اسی طرح پوچھ گچھ کرتے۔ میرے بچوں میں سے چھوٹے بیٹے زاہد محمود سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ یہ اس وقت پہلی یا دوسری میں تھا اس پر بڑی توجہ کرتے تھے زاہد کے ساتھ کافی باتیں کرتے تھے ایک آدھ بار میں نے کہتے سنا بیٹے بڑے ہو کر فوج میں جانا اور اپنے ماموں کا نام روشن کرنا۔ ۱۷۰ء میں زاہد خط لکھنے لگا تھا جب اس کا پہلا خط ایسٹ پاکستان گیا تو بہت خوش ہوتے اور جواب میں ہی لکھا دل لگا کر پڑھو اور پڑھ لکھ کر کچھ کر کے دکھانا زاہد کو اپنے پاس رکھ کر پڑھانے کا خیال تھا۔

سوال :۔ گھر پر اور کس طرح وقت گزارتے تھے؟

جواب :۔ گھر پہ عام گپ شپ بہت کم کرتے تھے وقت ہوتا تو کوٹھے پر جاتے وہاں پڑھتے رہتے

تھے۔ پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ انہیں جب دیکھو، کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ہے۔

سوال :۔ کون سی کتاب ؟ کچھ یاد ہے آپ کو وہ کونسی کتابیں پڑھا کرتے تھے ؟

جواب :۔ اُردو میں تو اقبال کی کتابیں۔ ان کے پاس میں نے دیکھیں یا اسلامی تاریخ کی کتابیں جیسے صلیبی جنگیں، سلطان صلاح الدین ایوبی۔ انگریزی میں میرا خیال ہے کہ ملٹری ہسٹری کے بارے میں پڑھتے تھے . . . . . . ۷۱ء میں جب وہ یکایک مشرقی پاکستان چلے گئے تو ان کا جو سامان کوئٹہ سے آیا اس میں ایسے رسالے اور کتابیں تھیں جن کا تعلق جنگوں کے حالات اور فوجی حکمت عملی سے تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کا ارادہ اسٹاف کالج کا امتحان دینے کا تھا۔

بہر حال پڑھتے بہت تھے اپنے بھائیوں سے بھی یہی کہا کرتے تھے۔ بغیر پڑھے کام نہیں بنے گا۔

سوال :۔ کوئی اور تاثر ؟

جواب :۔ سیدھے سادے مسلمان۔ افسر ہو کر بھی افسری کی عام خو بو یا آن بان نہیں تھی۔ جو آتا اٹھ کر خندہ پیشانی سے ملتے۔

جب وہ سیالکوٹ میں تھے تو کچھ آدمی ہمارے گاؤں کے ان کی پلٹن میں تھے ان سے کہتے کہ آپ لوگ میرے بھائی ہیں بے تکلف آ کے ملا کریں جو کام ہو یا تکلیف ہو بتائیں اگر میں آپ لوگوں کے کام نہ آؤں گا تو کس کے کام آؤں گا۔ دوسرے افسروں کے سامنے اپنے گاؤں کے سپاہیوں یا چھوٹے رینک کے لوگوں سے ملنے میں انہیں قطعاً کوئی عار نہ تھا۔ اپنے عزیزوں کے کم تر عہدے سے بالکل نہیں شرماتے تھے بلکہ کہتے برملا کہتے میں ایک کسان کا بیٹا ہوں۔ ایک این سی او کا بیٹا ہوں۔ میں بھرتی ہوا تھا میں اپنی محنت سے اور اللہ کے کرم سے افسر بنا ہوں اسی خودداری کی تلقین اپنے بھائیوں اور بھانجوں کو کیا کرتے تھے۔

سوال :۔ اکرم شہید کا ایک خط آپ کے نام چھپا ہے جس میں آپ کی بھیجی ہوئی کسی حدیث کا حوالہ ہے ؟

جواب :۔ کون سا ؟

سوال:۔ ۶ ستمبر ۱۷۱ء کا خط جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں ۔

حدیث مبارک ارسال کرنے کا شکریہ فوج کی تربیت بھی اسی حدیث کے مطابق ہوتی ہے ہمیں جو سکھلائی دی جاتی ہے اس میں اپنی حفاظت کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی ہے۔

جواب:۔ اکرم شہید کا یہ خط میرے ایک خط کے جواب میں آیا تھا۔ جس میں، میں نے ان کو وہ مشہور حدیث یاد دلائی تھی جس میں رسول اللہ نے کسی صحابی سے کہا تھا خدا پر توکل یہ ہے کہ پہلے اونٹ کے گھٹنے باندھو۔ پھر اللہ پر چھوڑ دو یعنی پہلے احتیاط کرو حفاظت کرو۔ پھر معاملہ خدا پر چھوڑو۔ یہ حدیث لکھنے کا پس منظر یہ تھا۔

اکرم مارچ اپریل ۷۱ء میں مشرقی پاکستان چلے گئے تھے۔ اس وقت سے وہاں لڑائی کی سی صورت تھی۔ جولائی اگست ۷۱ء میں تو باقاعدہ مکتی باہنی اور ان کے درپردہ ہندوستانی فوج سرحدوں پر حملے کر رہی تھی غالباً جولائی اگست ۷۱ء میں سرگودھا کے ایک صوبیدار میجر سخت زخمی ہو کر ایسٹ پاکستان سے منگلا سی ایم ایچ میں لائے گئے تھے۔ منگلا میں کسی طرح عبدالرزاق (ملک اکرم کا چھوٹا بھائی جو وہاں پوسٹ آفس میں ملازم تھا) ان صوبیدار میجر صاحب سے ملا انہیں جب معلوم ہوا کہ رزاق میجر ملک اکرم کا بھائی ہے تو وہ خود ہی کہنے لگے میں دوسری جنگ عظیم میں بھی لڑا ہوں، بڑے بڑے انگریزوں، جاٹوں اور گورکھوں کو دیکھا ہے لیکن میجر اکرم کا سا دلیر آدمی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ ہر مورچے میں جاتے ہیں ہر جوان کو دیکھتے ہیں پوچھ گچھ کرتے ہیں ہمت بڑھاتے ہیں۔ دشمن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ پہلے افسر کو نشانہ بنائے اس سے سپاہیوں کا حوصلہ از خود پست ہو جاتا ہے اس اندیشے کے تحت ہم لوگ کہتے تھے میجر صاحب اپنے مورچے سے اتنا زیادہ نہ نکلا کریں کچھ اپنی فکر بھی کیا کریں۔ لیکن یہ میجر صاحب اتنا نڈر ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کہتا ہے مجھے اپنی ڈیوٹی کرنا ہے خواہ جان جاتے یا رہے۔

عبدالرزاق نے یہ باتیں گھر آکر اپنی بہن کو بتائیں۔ جب میں شام سے ڈیوٹی سے آیا تو میں نے یہ باتیں سنیں۔ اسی رات میں نے خط لکھا اور حدیث مبارکہ کا حوالہ دیا کہ کچھ احتیاط کریں۔

اس کے جواب میں یہ خط آیا تھا۔

سوال:۔ بعض جگہ آپ کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی چھپا ہے کہ ۶۵ء کی جنگ کے بعد ظفروال سیکٹر کے متعلق اکرم نے کوئی واقعہ سنایا تھا وہ کیا ہے؟

جواب:۔ وہ وہی ہے جو اخباروں، رسالوں اور کتاب نشان حیدر میں چھپا ہے ہوا یوں کہ ۶۵ء کی جنگ کے بعد جب اکرم گھر آئے تو میں نے جنگ کے واقعات پوچھے تو انہوں نے یہ واقعہ سنایا ۲۲-۲۳ ستمبر کی رات فائر بندی ہونا تھی جو جہاں تھا وہاں اس کو جمے رہنا تھا۔ اس کے بعد ایک سکھ کرنل نے ذرا آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اکرم نے اس کو کہلوایا خیریت اسی میں ہے کہ جہاں ہو وہیں ٹکے رہو ورنہ نتائج کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی چنانچہ وہ پھر تجاوز کرنے سے باز رہا۔

سوال:۔ آخر میں۔ حنیف صاحب ایک سوال اور، کبھی شہید کے قول و فعل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا کسی اور بات سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ شہادت کا خیال ان کے شعور یا لاشعور میں ہے؟

جواب:۔ ایک بار ۶۵ء کی جنگ کے بعد اپنی بہن سے کہا تھا جب میں کوئی کارنامہ کر کے دکھاؤں گا تو دنیا حیران رہ جائے گی۔ ۶۵ء میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کی ان کو حسرت تھی کہ لڑنے کا موقعہ نہیں ملا۔ لیکن شہادت کی خواہش یقین کا حتمی اظہار ان خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے مشرقی پاکستان سے لکھے تھے۔ ہلی کے محاذ کی جو تصویریں بھیجی تھیں اس میں ایک پہ لکھا تھا یہ سرزمین میری موت تک ہماری ہے۔ ان خطوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ شہادت کی پرچھائیں ان کے دل پر پڑنے لگی تھی۔

زاہد سے باتیں

سوال:۔ بیٹے آپ کا پورا نام کیا ہے؟

جواب:۔ زاہد محمود ملک۔

سوال:۔ آپ کی عمر کتنی ہے؟

جواب:۔ تیرہ چودہ سال۔

سوال:۔ اکرم شہید کے بارے میں کچھ یاد ہے آپ کو؟

جواب:۔ ماموں جان ہمارے یہاں اکثر آتے تھے اس وقت میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ۱۰/۱۱ میں، میں نے انہیں دو تین خط بھی لکھے تھے۔

سوال:۔ کوئی جواب آیا؟

جواب:۔ ہاں جی۔ ماموں نے مجھے شوق سے پڑھنے کی نصیحت کی تھی اور لکھا تھا فوج میں جاؤں اور ان کا نام روشن کروں۔

سوال:۔ آپ بہن بھائیوں میں سے کس سے زیادہ پیار کرتے تھے؟

جواب:۔ ہماری چھوٹی بہن شازیہ سے۔

سوال:۔ ماموں جان آپ کیلئے کیا کرتے تھے؟

جواب:۔ ہمیں سیر کراتے تھے دریا کی طرف، کھلونے دیتے تھے۔

سوال:۔ آخری بار آپ اپنے ماموں سے کب ملے؟

جواب:۔ بہت دنوں کی بات ہے اتنا یاد ہے کہ اس روز عید کا دن تھا۔ ماموں مجھے اور میرے بڑے بھائی کو اسکوٹر پر بٹھا کر جہلم چھاؤنی کی طرف لے گئے تھے وہ ان دنوں سیالکوٹ میں پوسٹ تھے وہاں سے میرے لئے گیند بلا لائے تھے۔ میرے بھائی کیلئے ہاکی اسٹک، ہمیں کپڑے بھی لا کر دیتے تھے۔

سوال:۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟

جواب:۔ میں فوج میں جاؤں گا کینٹ پبلک اسکول جہلم میں دسویں درجے میں ہوں ابھی سے کوشش کر رہا ہوں۔

اکرم کی کہانی ایک بچپن کے ساتھی کی زبانی

سوال :- مشتاق ملک، آپ کا اکرم شہید سے کیا رشتہ ہے؟

جواب :- اکرم شہید میرے چچازاد بھائی تھے۔ ہم دونوں ہم عمر تھے۔ اس حد تک کہ دونوں کی پیدائش کا دن بھی ایک تھا۔ ایک ہی جگہ پلے بڑھے۔ ایک ساتھ کھیلے کودے، پڑھنا بھی ایک ساتھ شروع کیا۔ نکا کلاں کے اسکول میں پانچ جماعتیں ایک ساتھ بیٹھ کر پڑھیں۔ پھر چکری مڈل سکول سے چھٹا درجہ ایک ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ملٹری کالج میں داخلے کا امتحان بھی ساتھ ساتھ دیا۔ اگست ۴۸ء میں وہ ملٹری کالج میں داخل ہو گئے۔ میں بدقسمتی سے نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ہماری راہیں جدا ہو گئیں ملتے بھی رہتے تھے۔ شروع کے آٹھ دس سال میں نے انکے ہمزاد کیطرح انکے ساتھ ہی گذارے وہ مجھے کتنا عزیز رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت ان کی ڈائری ہے جس میں جگہ جگہ انہوں نے میرا نام لکھا ہے اگر امتحان میں بھی خط لکھنے کو کہا جاتا تو وہاں بھی میرا نام لکھتے۔

سوال :- اکرم شہید سے اتنے قریبی تعلق کی بنا پر آپ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے پہلے یہ بتایئے کہ شروع میں اکرم کیا بہت تیز تھے؟

جواب :- ذہین ہوں نہ ہوں محنتی ضرور تھے پہلی جماعت کا قاعدہ ان کو زبانی یاد تھا۔ پاس بھی اچھے نمبروں سے ہوتے تھے دوسری سے چھٹی جماعت تک اپنی کلاس کے مانیٹر رہے۔

سوال :- اس کے علاوہ کوئی خصوصیت تھی؟

جواب :- سچی بات یہ ہے کہ بھائی اکرم بہت سیدھے سادھے بندے تھے چالاکی نام کو بھی نہ تھی۔ اس زمانے میں ان کی دیانت داری کا جو واقعہ بہت مشہور ہے اس کا میں عینی شاہد ہوں۔ ہم دونوں پانچویں کلاس میں تھے کہ یکم کو ہمارے ماسٹر صاحب دین صاحب نے کلاس سے فیس اکٹھی کی اور ساری رقم کو رومال میں باندھ کر میز پر رکھ دیا اور پھر پڑھانے لگے اس کے بعد جب

تفریح کی گھنٹی بجی تو ماسٹر صاحب فیس کا رومال میز پر بھول کے چلے گئے بھائی اکرم نے رومال کو میز پر پڑا دیکھا تو پھر تفریح کے لئے نہیں گئے کچھ دیر تو میز کے پاس کھڑے رہے پھر رومال لے جاکر صاحب دین کے حوالے کردیا۔ وہ رومال کے بارے میں بالکل ہی بھول گئے تھے جب کلاس کی پوری فیس اکرم نے ان کو دی تو بہت خوش ہوئے ان کو پانچ روپے انعام کے طور پر دیئے پھر کلاس میں آکر سارے لڑکوں کے سامنے تعریف کی۔ اس کے بعد بھی جب بھی ماسٹر جی فیس جمع کرتے تو اکرم کو اپنے ساتھ بٹھاتے تھے وہی ٹوٹل وغیرہ کرتے تھے۔

سوال:۔ اس زمانے میں انہیں کھیل کون سا پسند تھا؟

جواب:۔ گاؤں میں تو کبڈی ہی کا شوق تھا مڈل سکول میں کبھی کبھی والی بال بھی کھیلتے تھے لیکن زیادہ نہیں۔

سوال:۔ اور ہاکی؟

جواب:۔ ہاکی سے دلچسپی انہیں ملٹری کالج جاکر ہی پیدا ہوئی۔ کیسے یہ میں نہیں بتا سکتا ورنہ گاؤں میں ہاکی کھیلنا تو درکنار ہاکی کی شکل تک ہم نے نہیں دیکھی تھی گو ملٹری کالج کے بلند معیار کی وجہ سے ان کی تعلیمی کارکردگی بہت اچھی نہیں رہی اور اسی وجہ سے انہیں کالج کو خیرباد کہنا پڑا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ملٹری کالج نے ان کے ذہن اور امنگوں کو بیدار کیا اور کچھ ہونے اور کچھ کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ ہاکی کا شوق بھی کالج کا فیضان تھا۔

سوال:۔ یہ تو ان کے بچپن اور لڑکپن کی باتیں ہوئیں اس کے بعد بھی آپ ان سے ملتے جلتے رہتے ہوں گے۔

جواب:۔ جی ہاں۔

سوال:۔ اس تمام عرصے میں آپ کو کوئی غیر معمولی بات نظر آئی؟

جواب:۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ بھائی اکرم کوئی جینئس نہیں تھے ان کی صورت، شکل میں بھی

گفتگو میں کوئی آن بان کوئی شان وشوکت یا انفرادیت نہیں تھی وہ بظاہر ایک عام سے آدمی تھے۔

سوال:۔ لیکن مستقبل کے نشان حیدر میں کوئی غیر معمولی بات تو ہوگی؟

جواب:۔ غیر معمولی بات انکے ظاہر میں نہیں باطن میں تھی۔ ان کا دل ایک جوالامکھی تھا وہ بظاہر خاموش نظر آتے تھے لیکن ان کی امنگیں پرجوش خروش تھیں اس زمانے کی جو چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے یاد آتی ہیں۔ ان کی بناپر میں کہہ سکتا ہوں کہ انہیں جہاد کا جنون سا تھا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان ان کے ہیرو تھے وہ شعوری اور لاشعوری طور پر شہادت کے طلب گار تھے اس میں امر ہو جانے کی خواہش بھی ہوگی۔ لیکن میں ان کی شہادت کو ان کے ایمان کا کرشمہ سمجھتا ہوں۔

سوال:۔ کبھی خود انہوں نے اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی خیال ظاہر کیا تھا؟

جواب:۔ انہوں نے تو نہیں لیکن ایک دست شناس پامسٹ نے ضرور ایک پیشگوئی کی تھی۔

سوال:۔ وہ کیا؟

جواب:۔ ہوا یوں کہ جب بھائی اکرم نے پہلی بار کمیشن کا امتحان دیا اور ناکام ہوئے تو بہت اداس ہوئے۔ اس زمانے میں ۸ پنجاب میں نوکری کر رہے تھے۔ لانس نائیک تھے یا نائیک گھر آئے تو مجھ سے ملاقات ہوئی میں نے کہا دل کیوں تھوڑا کرتے ہو، کہنے لگے دل تھوڑا کرنے کی بات نہیں پھر کوشش کروں گا اور اللہ نے چاہا تو کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن یار مشتاق میں نے تیاری بہت کی تھی اس کا افسوس ہے۔ میں نے کہا وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے یہ سن کر بولے۔ ہاں تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے لیکن کوشش کرنا بھی فرض ہے۔

اسی دن کی بات ہے کہ ہم بازار گئے بلکہ میں انہیں بازار لے گیا تاکہ ذرا دل بہل جائے۔

سوال:۔ کون سے شہر کا بازار تھا؟

جواب:۔ جہلم میں شاندار چوک سے ناز سینما کی طرف کا بازار۔

سوال:۔ پھر؟

جواب:۔ وہاں سرِراہ ایک دست شناس (پامسٹ) بیٹھا تھا کہنے لگے اس کو ہاتھ دکھاتے ہیں چنانچہ بابا کو ہاتھ دکھایا۔ وہ واقعی اس فن کا ماہر تھا۔ یا نہیں اس کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن بابا نے بڑے ڈرامائی انداز میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پہلے ہاتھ دیکھا پھر اکرم کے چہرے کو دیکھا پھر ہاتھ دیکھتا پھر ان کا جائزہ لیتا میں نے کہا بابا خیریت تو ہے اکرم سے بولا بیٹا تیرا ستارہ بہت اونچا ہے تو بڑا نام پاتے گا۔ دنیا تجھے یاد کرے گی۔ بھائی اکرم نے ہاتھ کھینچ لیا اور ہنس کر کہا دیکھ لیا بابا آپ کا فن کمیشن میں تو فیل ہو کر آ رہے ہیں ستارہ کیا خاک اونچا ہوگا فی الحال تو بدنامی ہی ہو رہی ہے بابا بولا بیٹا میں نے تو وہ بتایا جو تیرے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی ہیں۔ آگے مولا جانے۔ یہ ۱۹۵۹-۱۹۶۰ء کی بات ہے۔

سوال:۔ مشتاق ایک سوال جو ہم اکرم کے بھائیوں سے پوچھنا بھول گئے اب آپ سے پوچھتے ہیں۔ آپ بھی بھائیوں سے کم نہیں کچھ اکرم شہید کے لباس اور رہن سہن کے بارے میں بتلایئے؟

جواب:۔ کمیشن سے پہلے تو سفید شلوار قمیض پہنتے تھے۔ کمیشن کے بعد میری ان سے ملاقات بہت کم ہوئی۔ لیکن جب کبھی دیکھا تو خاکی رنگ کے موٹے کھدر میں ملبوس دیکھا۔ خاکی موٹے کھدر کی قمیض شلوار ان کا پسندیدہ گھریلو لباس تھا۔ میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ وہ کبھی گھر پر وردی پہن کر نہیں آتے تھے۔ سوائے ایک بار کے کہ جب ہماری بے جی نے ان سے فرمائش کی بیٹا کبھی وردی پہن کے آنا۔ تاکہ میں اپنا دل خوش کروں۔ چنانچہ جب ٹلہ رینجز پر فائرنگ کے لئے آتے تو ایک دن وردی پہن کے آئے اور سیدھے ہمارے گھر گئے بے جی کو سلام کر کے کہا لیجیئے پھوپھی جی، (وہ ہماری بے جی کو پھوپھی کہتے تھے) میں وردی پہن کے آگیا۔ آپ کا حکم تھا۔ وہ بے جی سے بہت مانوس تھے۔ چھٹی کا زیادہ وقت ہمارے چوبارہ پر گزارتے تھے۔

سوال:۔ کس مشغلے میں؟

جواب:۔ کتابیں پڑھتے یا ریڈیو، ٹرانسسٹر سنتے۔ یہ ان کی عجیب عادت تھی کہ پڑھتے ہوتے تو تب بھی ریڈیو دھیمے سروں میں بجتا رہتا۔

سخی محمد کا سخی فرزند

اکرم شہید کے ماموں ملک عبدالحمید لکھتے ہیں۔

اکرم جب بھی لاہور آتے سب سے پہلے ہمارے یہاں آتے حالانکہ رشتے کا تقاضا یہ نہیں تھا پھر بھی گھر کے تمام افراد کیلئے تحفے تحائف لے کر آتے اور دیتے وقت بے حد خوشی کا اظہار کرتے جیسے ان کے تحفے قبول کر کے ہم نے ان پر احسان کیا ہے۔

ایک پڑوسی کی گواہی

ملک تاج خان اکرم شہید کے پڑوسی ہیں۔ برسوں سے ان کے گھر والوں سے رسم وراہ ہے ان کے دکھ سکھ کے ساتھی رہے ہیں۔ اکرم ان کے سامنے پلے بڑھے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ ذرا ان کے تاثرات معلوم کریں کہ خوشبو ہو یا بدبو دور دور تک پھیلتی ہے۔ دیکھیں واقف کار غیر کیا کہتے ہیں۔

سوال:۔ آپ اکرم شہید کو کس طرح جانتے ہیں؟

جواب:۔ جناب، میں ملک سخی محمد، صوبیدار میجر گودڑ خان کا پڑوسی ہوں۔ برسوں سے گھر اکٹھے رہے ہیں میں ان کے برے بھلے کا بھیدی ہوں۔

سوال:۔ پھر کچھ ہمیں بھی بتایئے؟

جواب:۔ میں بھی اعوان ہوں اعوان بات کا کھرا ہوتا ہے جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ جناب ملک سخی محمد کا گھرانہ بڑا شریف پرہیزگار گھرانہ ہے۔ بڑے اللہ لوک ہیں یہ لوگ اس میں کوئی شک نہیں۔ گاؤں

ہیں ان کی بڑی عزت ہے۔

سوال :۔ کچھ اکرم کے بارے میں بتائیے ؟

جواب :۔ ۱۹۴۸ء کے بعد سے اکرم گاؤں میں تو بہت ہی کم رہے کبھی کبھار چھٹی آتے تھے۔ دو چار بار گاؤں کی لاری میں ملاقات ہوئی وہ بھی ان کے کمیشن لینے کے بعد اور دل خوش ہوا۔

سوال :۔ کسی خاص وجہ سے ؟

جواب :۔ ہاں۔ اس وجہ سے کہ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ لاری میں عورتوں اور بزرگوں کے لئے فوراً اپنی سیٹ خالی کر دیتے تھے بس کنڈیکٹر کو معلوم ہو گیا تھا اکرم کپتان ہو چکے ہیں وہ ان کو بہتر جگہ دیتا تھا۔ لیکن وہ کہتے تھے ہمارا کیا ہے کھڑے ہو کر بھی جا سکتے ہیں۔ عورتوں اور بزرگوں کو تکلیف نہ ہو ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا۔ میجر اکرم بڑے مرتبے کے آدمی تھے۔

سوال :۔ کس معنوں میں ؟

جواب :۔ آپ کو ایک اور واقعہ سناتا ہوں جب اکرم کی مشرقی پاکستان پوسٹنگ ہوئی تو اکرم کی ماں عائشہ بی بی نے اکرم سے کہا۔ بیٹے جاؤ۔ پیر صاحب کے گوڈے کو ہاتھ لگا آؤ۔ مطلب یہ تھا کہ ان کی دعائیں لے آؤ۔ صاحب اپنے پیر گل جی بھی بڑے زبردست بزرگ تھے ایک دنیا مانتی تھی۔ کراچی تک سے خلقت آتی تھی۔ گورنر جنرل غلام محمد تک ان سے دعا کیلئے کہتے تھے۔ اب جو اکرم پیر صاحب کے گوڈے کو ہاتھ لگانے پہنچے تو الٹا پیر صاحب نے ان کے گوڈے کو ہاتھ لگایا یہ دیکھ کر اکرم بہت گھبرائے۔ ماں کے پاس جا کر روتے کہ یہ کیا ہوا۔ میں تو گنہگار ہو گیا۔ ماں جی بہت پریشان ہوئیں اور فوراً پیر صاحب کے پاس پہنچیں اور پوچھنے لگیں پیر جی یہ آپ نے کیا کیا میرا بیٹا تو بہت شرمندہ ہے۔ اس کا جواب پیر گل جی نے صرف یہ دیا جو میں جانتا ہوں تو نہیں دیکھتی۔ جاؤ جو کیا ٹھیک کیا۔

اکرم کی شہادت کی خبر جب نکا کلاں پہنچی تو پیر گل جی نے اکرم کی والدہ کو بلوایا اور کہا یہ وہ

نور شہادت تھا جو اس وقت مجھے اکرم کی پیشانی پر نظر آیا تھا۔ میں نے اکرم کے گوڈے کو اس لئے ہاتھ لگایا تھا کہ شہید کا درجہ سب سے اونچا ہوتا ہے۔

سوال :۔ تاج خان صاحب!۔ یہ تو آپ نے بہت قیمتی باتیں بتائیں۔ کوئی اور اہم بات؟

جواب بس مجھے تو یہی کچھ معلوم تھا۔

دشمن کی گواہی

اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی کتابت قریب الختم تھی کہ سی ایم ایچ کھاریاں میں لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر مظہر حسین سے ملاقات ہوئی۔ وہ میری کتاب لیپا ویلی کا ہیرو، حق نواز کیانی پر تبصرہ کرنے لگے۔ میں نے پوچھا آپ نے میری دوسری کتاب میجر اکرم شہید نشان حیدر بھی دیکھی ہے۔ اس میں بھی یہی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ کتاب آپ دکھاتے تو دیکھتا۔ لیکن میجر اکرم کو ضرور جانتا ہوں۔ ۷۱ء میں ہم دونوں ایک ہی سیکٹر میں تھے۔ اس مرد میدان کا تو دشمن بھی معترف تھا۔

اس موضوع پر کرنل مظہر سے جو مزید گفتگو ہوئی وہ یہ ہے۔

راشد: مظہر صاحب۔ یہ دشمن کے اعتراف کا کیا قصہ ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیے گا۔

کرنل مظہر: جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ۷۱ء میں ہم دونوں ایک ہی سیکٹر میں برسرپیکار تھے۔ میں اپنی یونٹ کے ساتھ ڈاکٹر کی حیثیت سے رنگ پور میں تھا اور میجر اکرم ہلی کے محاذ پر لڑ رہے تھے۔ ۵ دسمبر کو اکرم شہید ہوئے بعد کے واقعات تو سب کو معلوم ہیں۔ اکرم کی دلیری کی گواہی دشمن نے ایک پی او ڈبلیو کیمپ میں دی۔

راشد: اسی کی تفصیل چاہیئے؟

کرنل مظہر: اسی طرف آ رہا ہوں۔ جنوری ۷۳ء میں، میں رڑکی کے کیمپ نمبر ۳۳ میں ایام اسیری گزار

رہا تھا کہ ایک ہندو افسر آیا۔ جو لنگڑا کر چلتا تھا۔

راشد — کس عہدے اور رینک کا؟

کرنل مظہر — لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ چونکہ کیس نہیں رکھے تھے اس لئے لازماً ہندو ہوگا۔ کس کور کا تھا۔ نام کیا تھا وہ یاد نہیں رہا۔ کچھ اس لئے بھی کہ ہم انڈین افسروں سے لئے دیئے رہتے تھے اور ان سے ملنے جلنے کو قومی حمیت کے منافی سمجھتے تھے۔

ایک روز ہم بہت سے پی او ڈبلیو جمع تھے تو وہ ہندو کرنل پوچھنے لگا آپ لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو بلی میں لڑا ہو یہ سن کر سب خاموش رہے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے پھر کہا کوئی ڈرنے یا کوئی شبہ کرنے کی بات نہیں۔ میں خود چونکہ بلی پر تھا۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں۔ مجمع میں سے آواز آئی "کیوں؟

اس نے کہا۔ یوں کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون بہادر تھے جنہوں نے میری رجمنٹ کا صفایا کیا اور خود مجھے زخمی کیا۔ میرا لنگڑا پن انہیں زخموں کی یادگار ہے جو میں نے اس محاذ پر کھائے۔ آپ کے سپاہی بہت اچھا لڑے خاص طور پر ایک کمپنی کمانڈر میجر اکرم۔ وہ واقعی ایک دلیر آدمی تھا۔ تو راشد صاحب یہ تھا وہ تمغہ جو ایک دشمن کرنل نے اکرم شہید کو دیا۔

راشد — مظہر صاحب یوں تو اپنے افسروں اور جوانوں نے بھی میجر اکرم پر بہت کچھ کہا ہے لیکن چونکہ ایک دشمن کی یہ گواہی ہے اس لئے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ شکریہ ڈاکٹر صاحب۔

حاصلِ کلام

میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کی شخصیت وکردار کا جائزہ ہم نے اقبال کے اس شعر سے شروع کیا تھا۔

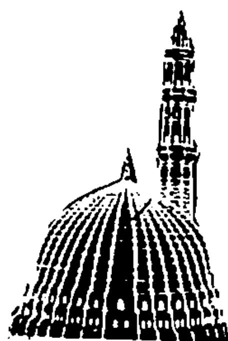
وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

اکرم کی زندگی بے داغ شباب اور موت ضرب کاری کی خونچکاں داستان ہے اس باب کو ہم اقبال کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا، بندہ مومن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی ونوری نہاد، بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اسکا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اسکی نگاہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل وپاکباز
نقطہ پرکار حق، مرد خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم طلسم و مجاز

سعید راشد

ذکر اللہ والوں کے



شاہد حمید

چھپ کر تیار ہے

بک کارنر پبلشرز
جہلم

حیاتِ قائداعظم

۱۷۷ صفحات کی یہ مختصر کتاب قائداعظم کے حالات زندگی کا خلاصہ ہی نہیں اُن کی شخصیّت اَور کردار کا مطالعہ بھی ہَے۔ زبان و بیان نہایت عام فہم ، سادہ اَور سلیس ہَے۔ پہلا باب سوانحی احوال کوائف پر مشتمل ہَے جس کے عنوانات یہ ہَیں۔

کارواں حیات سیاسی جدوجہد کی داستان ، بحثیت سربراہِ مملکت ، زندگی کی شام ، آخری باتیں، دوسرے باب کے خاص خاص موضوعات یہ ہَیئں۔

قائداعظم کی عظمت کا تجزیہ ، قائداعظم کی شخصیت کا مطالعہ ، قائداعظم اور طلباء قائداعظم اَور افواج پاکستان ، قائداعظم اَور تعلیم ۔ نظریہ پاکستان منزل بہ منزل ۔

یہ دوسرا باب خصوصیت سے بہت قیمتی مواد اَور معلومات رکھتا ہَے۔ جس سے طلباء اَور عام قارئین یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہَیں۔

پروفیسر سعید راشد

کے قلم سے

ناشر اور تقسیم کار بک کارنر جہلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



پاکستانیت اور کردار سازی

پر

نہایت مفید، عام فہم اور دلچسپ کتابیں

تذکرہ شہداء	سعید راشد	۳۰۰/
شہید کشمیر حق نواز کیانی	" "	۳۰۰/
مکالماتِ اقبال	" "	۲۰۰/
چراغوں کی قطار	" "	۲۵۰/
شاد باد منزلِ مراد	" "	۲۰۰/
کردار کی کرنیں	" "	۱۰۰/
کریکٹر بلڈنگ	" "	۲۰۰/
کردار ساز	" "	۳۰۰/
حیات قائد اعظمؒ	" "	۸۰/

سلطان ٹیپو شہید

فیض عالم صدیقی





بک کارنر مین بازار جہلم
(پاکستان)

مکالمات اقبال

یہ کتاب ایک واضح نصب العین کے تحت لکھی گئی ہے۔ اِس کتاب کا مدعا اقبال کی شخصیت اَور افکار کی اِس انداز میں پیش کش ہے کہ اِن اقدار اَور افکار کو فروغ حاصل ہَو جن کے فروغ کی خاطر اقبال نے ساری زندگی تگ و دو کی اَور اِس تگ و دو کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا۔ پاکستانیت کے فروغ کے لیے اِس کتاب میں اُن مُستند افکار اَور واقعات کو منتخب کیا گیا ہَے۔ جن سے اقبال کی شخصیت اَور افکار کے سبھی گوشے سامنے آ سکتے ہیں۔ بنیادی مقصد اِن واقعات اَور افکار سے نئی نسل اَور قارئین کے کردار کی اِس نہج پر تعمیر و تشکیل ہَے کہ وُہ اپنے معاشرہ کے لیے باعث خیر کثیر ثابت ہو سکیں۔

علامہ اقبال کی ساری داستان حیات اَور افکار کو پیش کرنے کے لیے اِس کتاب میں وُہی تکنیک برتی گئی ہَے جو توفیق الحکیم نے اپنی سیرت کی کتاب محمدؐ رسول اللہ میں برتی ہَے۔ یعنی مکالمہ نگاری کی تکنیک ۔ اِس تکنیک نے مکالماتِ اقبال کو دلچسپ اَور مؤثر بنا دیا ہَے ۔ یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہَے۔ باب اوّل ۔ داستان ۔ حیاتِ اقبال یہ روایت اقبال باب دُوم سیرت اقبال مکالمات اقبال کے آئینہ مَیں باب سوم ۔ افکار ۔ و نظریات اقبال ، تاثرات اقبال کی روشنی میں ۔ اِن تین ابواب میں علامہ اقبال کی سیرت اَور افکار کے علاوہ علامہ اقبال کے عہد میں اُبھرنے والی اہَم فکری اَور سیاسی تحریکوں کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہَے۔ یہ کتاب بڑے سلیقے سے ہمارے سامنے اقبالیات کے ذخیرہ کی اصل روح کو اجاگر کرتی ہَے۔ اِس کتاب کا مطالعہ قاری کواَن گنت کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہَے۔ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ تالیف نعمت سے کم نہیں۔ عام قاری سے لے کر ماہرین اقبالیات تک اِس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہَیں۔ اقبالیات میں یہ کاوش ایک اہم اضافہ ہَے۔ فکر اقبال کو عام کرنے اور پاکستانی معاشرہ کی اِن اقدار کے سانچے میں ڈھالنے کی خاطر جن کی سربلندی کی خاطر پاکستان وجود میں آیا۔ یہ ایک بڑی مثبت اَور دوررَس کوشش ہَے۔ کتاب کا دیباچہ اقبال اکیڈمی پاکستان کے ڈائریکٹر پروفیسر مرزا محمد منور کے قلم سے

تذکرۂ شہداء

تذکرہ شہداء جنگ ستمبر اور جنگ دسمبر کے پندرہ شہیدوں کے سوانحی خاکوں اور جنگی کارناموں پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ اِس نوع کی عام کتابوں سے ہٹ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اِس میں شہیدوں کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ و تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور حالات و واقعات پیش کرنے میں حد درجہ تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اور تقریباً سارا مواد براہ راست حاصل کیا گیا ہے۔ کتاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ شہید از خود پیدا نہیں ہو جاتا جذبہ شہادت کا تعلق بھی تربیت اور تعلیم سے ہے شہادت کا سفر ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے اور مدرسہ کے درودیوار سے گزرتا ہُوا میدانِ جنگ پر ختم ہوتا ہے۔ سید ضمیر جعفری تذکرہ شہداء کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

یہ تذکرہ ہماری قومی تاریخ کے سفر میں منارہ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ مستقبل کے گلاب ماضی کے انہی زخموں سے طلوع ہوں گے۔

تذکرہ شہداء کا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا اِس کے پیش لفظ میں جنرل محمد ضیاءالحق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان لکھتے ہیں۔

سعید راشد صاحب نے ملٹری کالج جہلم سے تعلق رکھنے والے شہیدوں کے حالات زندگی اور کارناموں پر مشتمل یہ کتاب ترتیب دے کر اِن ہی کی نہیں برّی فوج اور ملک و قوم کی بھی خدمت کی ہے۔ زندہ قوم اپنے شہیدوں کو کبھی فراموش نہیں کرتی مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب اِن تمام قارئین میں مقبول ہو گی۔ جو تحفظ آزادی اور دفاع وطن میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

شمشیر کشمیر

کرنل حق نواز کیانی



بک کارنر
پبلشرز جہلم
چوک فیصل مین بازار